قتل عام

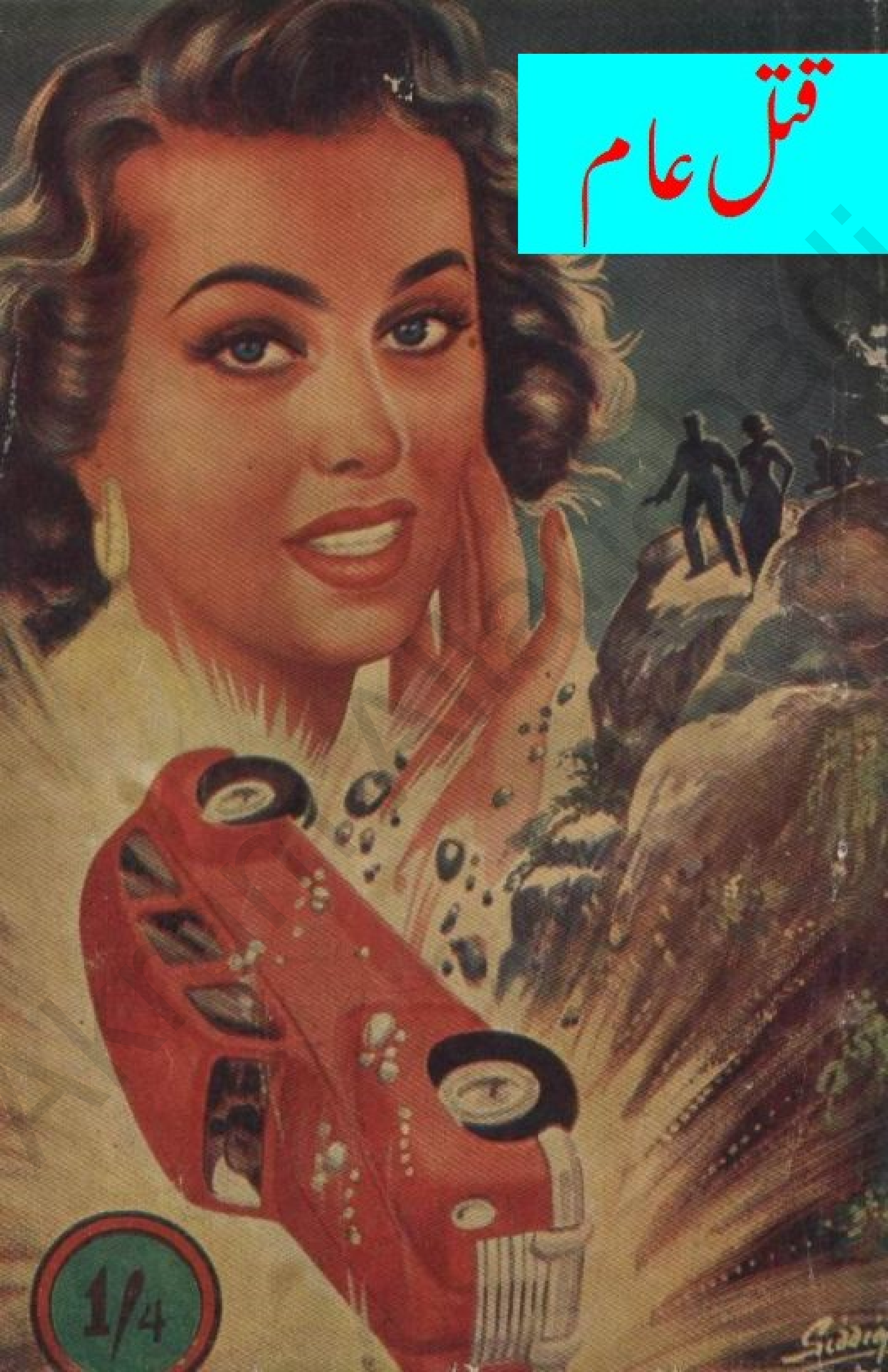

جاسوسی دائرہ سیریز

قتلِ عام

اکرم الہ آبادی

فرحت پبلیکیشنز۔ ممبئی۔ انڈیا

جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ ہیں

اس ناول میں شائع ہونے والے تمام واقعات،
مقامات و کردار فرضی ہیں ۔ اس سے کسی طرح
کی مطابقت محض اتفاقیہ ہے ۔ جس کی مصنف،
پبلشر و پرنٹر پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ۔

اس ناول کی دوبارہ اشاعت، ترجمے یا کسی اور مقصد سے استعمال کے
لئے پبلشر کی تحریری اجازت ضروری ہے ورنہ قانونی چارہ جوئی کی جائے گی ۔

پرنٹر: ----- ممبئی ۔ انڈیا

انتساب

شکریہ کے ساتھ۔ بمبئی کے ہونہار ڈاکٹر سید وی۔ ایم۔ ترمذی کے نام،
جن کے قیمتی مشورے اس ناول کی تکمیل میں میرے مددگار رہے۔

کھلبلی

اپنی موٹر ۴۸ سے اتر کر جب محکمۂ صحت عامہ کا ڈائرکٹر اپنے آفس کی دو منزلہ ستھری عمارت میں داخل ہوا تو عملے کے سست بیٹھے ہوئیا فارو چونک چونک کر اپنے کاموں میں اس طرح مصروف ہو گئے جیسے ہفتوں کا کام انھیں ایک دن میں کرنے کے لیے دے دیا گیا ہو۔ بوڑھے ہیڈ کلرک کا سر تو صرف اسی وقت اوپر اٹھتا تھا جب چپراسی آ کر صاحب کو سلام دے یا پھر اسے چائے پانی وغیرہ کی ضرورت محسوس ہو۔ ویسے پورے دفتر میں وہ ایک ہی آدمی تھا جو دفتری کاغذات کے بوجھ سے اتنا دبا رہتا تھا کہ اسے ۴۵ برس کی عمر میں دو دو موٹی عینکیں لگانی پڑتی تھیں۔ اسٹینو ٹائپسٹ اینگلو انڈین لڑکی جینی، اے وارڈ کے ہیلتھ انسپکٹر سے رومان لڑانا بھول کر ٹائپ مشین میں لگے ہوئے سفید کاغذ کو جلدی جلدی سیاہ کرنے لگی۔ اس کی مخروطی انگلیاں ڈائرکٹر کو دیکھتے ہی فی منٹ ۱۶۰ الفاظ کے حساب سے مشین کے حرفوں پر چلنے لگیں۔ اور اے وارڈ کا انسپکٹر بٹ کچھ جھینپا ہوا سا ڈائرکٹر کو دیکھتے ہی اٹینشن کھڑا ہو گیا۔ لیکن اس چالیس سالہ شریف سنجیدہ آدمی نے کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ وہ سر کی جنبش سے ان سب کے سلام لیتا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر اپنے دفتر میں چلا گیا۔ اس نے دروازے پر کھڑے ہوئے چپراسی کو گھبراہٹ کے عالم میں جلتی ہوئی بیڑی جیب میں ڈالتے بھی نہیں دیکھا۔ شاید وہ آج معمول کے اوقات سے کچھ پہلے آ گیا تھا دفتر میں۔ اپنی کرسی پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے اس نے چپراسی کو بلانے کی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ وہ بے چارہ جلتی بیڑی سے جل جانے والی اپنی سرکاری خاکی بش شرٹ کی جیب کو مسلنے میں مصروف تھا کہ جان پر آ بنی۔

"یہ کیا ہے؟" ڈائرکٹر نے اس کی جلی ہوئی جیب اور کالی انگلیوں کی طرف دیکھ کر عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"ص... صاحب... وہ ... چائے گر پڑی تھی۔" چپراسی نے جیب کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے ہکلا کر جواب دیا۔

"ہُم.. تو چائے سے آگ لگ جاتی ہے۔" ڈائرکٹر کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"خیر، ہیلتھ آفیسر ڈویزن کو ہمارا سلام بولو۔" ڈائرکٹر نے نرم لہجے میں اسے حکم دیا اور چپراسی جلی جیب ہاتھ سے چھپائے جلدی سے باہر نکل آیا۔

ہیلتھ آفیسر ڈویژن اطلاع ملتے ہی آپہنچا۔

"مارننگ سر۔" اندر آتے ہوئے اس نے صبح کا سلام مختصراً پیش کیا۔

"مارننگ۔" ڈائرکٹر مسکرا کر بولا۔

"آپ نے یاد فرمایا؟" اس نے قریب آکر کہا۔

"کوئی خاص بات نہیں، بیٹھیے۔" ڈائرکٹر نے اشارہ کیا اور ہیلتھ آفیسر سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ کے ڈویژن میں صحت عامہ کا کیا حال ہے؟"

"بالکل ٹھیک۔" ہیلتھ آفیسر بولا۔ "ہمارے انسپکٹر روز گشت کرتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"آپ کو دی گئی اطلاعات میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ میں خود کمشنر کے ساتھ کل ادھر سے گزرا تھا۔ بعض گلیاں کافی گندی ہیں۔ سڑکوں کے کنارے سڑی ترکاریاں پھینکی جارہی ہیں اور لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ ادھر کئی دن تک محکمہ صحت کا کوئی آدمی نہیں جاتا۔" ڈائرکٹر نے نرم لہجے میں اسے بتایا۔

"مم مگر... رپورٹ بک..." ہیلتھ آفیسر نے گھبرا کر کہنا چاہا۔

"وہ سب خانہ پری کی بات ہے۔ ہمارے اسٹاف میں کاہلی زیادہ آگئی ہے۔ بعض

انسپکٹرز بغیر گشت لگائے گشتی رپورٹ لکھ دیتے ہیں اور بعض صرف شکایات موصول ہونے پر کاروائی فرماتے ہیں۔"

"معاف کیجیے، جناب۔ میں اس کی تحقیق کر کے انھیں معقول سزائیں دوں گا۔" ہیلتھ آفیسر نے مؤدب لہجے میں کہا۔

"سزاؤں کی ضرورت نہیں، آپ انھیں فرض شناسی کا احساس دلایے۔"

"بہت بہتر ہے۔ میں پوری کوشش کروگا کہ آئیندہ کوئی ایسی شکایت پیدا نہ ہو۔" ہیلتھ آفیسر سی ڈویژن نے اسے یقین دلایا۔

"بس یہی کہنا تھا۔ آپ جا سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر ڈائرکٹر اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور ہیلتھ آفیسر دل ہی دل میں اپنے سارے اسٹاف کی خبر لیتا ہوا باہر نکل آیا۔

اس کے جانے کے بعد ڈائرکٹر کو ابھی اپنے کاغذات دیکھتے بمشکل چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو ... یس، ڈائرکٹر آف پبلک ہیلتھ ڈپارٹمنٹ ... اوہ، ڈاکٹر سیّد۔ فرمایے فرمایے۔" وہ فون پر گفتگو کرتے کرتے مسکرانے لگا۔

"اسپتال میں ابھی ابھی ایک طاعون کا کیس آیا ہے۔" دوسری طرف سے سول اسپتال کے ایمرجنسی ڈپارٹمنٹ کے انچارج ڈاکٹر سیّد کی آواز سنائی دی۔

"پلیگ ...!" ڈائرکٹر حیرت سے اچھل پڑا۔ "مگر شہر میں تو ..." وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"پہلا کیس ہے، اسی لیے میں آپ کو فوراً مطلع کر رہا ہوں تاکہ محکمہ صحتِ عامہ فوراً اسے اس کے مقام پر محدود کر کے ختم کر دے، ورنہ خدانخواستہ اگر یہ موذی وبا پھیل گئی تو ..." ڈاکٹر سید نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

"مم ... میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔ مریض کس علاقے کا ہے؟" ڈائرکٹر نے

گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”دگمبر روڈ ساؤتھ کا۔ پتا نریمان بلڈنگ، دوسری منزل، روم نمبر ۱۹۔ مریض کا نام چندریکر ہے۔“ ڈاکٹر سید نے بتایا۔

”بروقت آگاہی کا شکریہ۔ میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

شہر میں طاعون جیسی مرگِ عام پھیلا دینے والی مہلک وبا کا ایک کیس بھی محکمہ صحتِ عامہ کے تمام شعبوں میں کھلبلی مچا دینے کے لیے کافی تھا۔ اور شہر میں خبر پھیلنے پر تو حالات اور زیادہ سنسنی خیز ہو جاتے۔ ڈائرکٹر اس خبر کے سنتے ہی بری طرح گھبرا گیا تھا۔ وہ ذہنی انتشار کے عالم میں کال بیل مسلسل بجانے لگا۔ چپراسی فوراً اندر پہنچا۔

”تمام ہیلتھ آفیسروں کو بلاؤ، ابھی اسی وقت۔“ وہ پشت پر دونوں ہاتھ باندھے کمرے میں ٹہلتے ہوئے بولا۔ چپراسی اس کا موڈ پراگندہ دیکھ کر ضرورت سے زیادہ پھرتی دکھاتا ہوا دوڑ کر باہر نکل گیا۔

پانچ منٹ کے اندر ہی اندر پانچ ہیلتھ آفیسرز آگے پیچھے وہاں آ پہنچے۔ الیف ڈویژن کا چھٹا ہیلتھ آفیسر شاید گشت پر گیا تھا، اس لیے وہ نہ مل سکا۔

وہ سب اس اچانک طلبی پر فکرمند نظر آ رہے تھے۔ ڈائرکٹر نے انھیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ٹہلتا رہا۔

”ابھی ابھی سول اسپتال کے ایمرجنسی ڈپارٹمنٹ کے پاس پلیگ کا ایک کیس آیا ہے۔“ اس نے تقریر کرنے والے انداز میں کہنا شروع کیا۔

”طاعون کا...؟“ وہ سب چونک پڑے۔ ان کے چہروں کا اطمینان کافور ہو گیا۔

”ہم... اور یہ کیس دگمبر روڈ ساتھ کا ہے جو بی ڈویژن میں ہے۔ آپ لوگ اپنے اپنے علاقوں میں پورا عملہ اس بیماری کے امکانی ذرائع کی تحقیق اور اس کے پھیلنے سے پہلے

اسے ختم کر دینے کی کوشش میں لگا دیجیے۔" وہ کہتا گیا۔

"اور "بی" ڈویژن میں تو اسی وقت اس مقام کا معائنہ ہونا چاہیے جہاں یہ کیس ہوا ہے، میں خود بھی چلوں گا۔ ممکن ہے وہاں اس کے اثرات پھیل رہے ہوں، انھیں فوراً روکا جانا چاہیے۔" وہ مٹھیاں بھینچ کر بڑبڑایا۔

"ضرورت محسوس ہو تو اس وبا کے پھیلنے سے پہلے اس کی روک تھام کے ٹیکے لگانے شروع کر دیے جائیں۔" اس نے مزید ہدایت کی۔

"بہت بہتر، ہم ابھی یہ کام شروع کر دیتے ہیں۔" ایک ہیلتھ آفیسر نے کہا۔

"اور ڈاکٹر پانڈے، آپ میرے ساتھ چلیے، اپنے عملے کے کچھ آدمی بھی مع جراثیم کش سیال اور پاؤڈر وغیرہ کے ساتھ لے لیجیے۔" ڈائرکٹر نے 'بی' ڈویژن کے ہیلتھ آفیسر کو حکم دیا۔

"بہتر ہے، میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔" بی ڈویژن کا ہیلتھ آفیسر ڈاکٹر پانڈے یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ باقی دوسرے افسران صحتِ عامہ بھی ہدایت پا کر رخصت ہو گئے۔

مگر جس وقت ڈائرکٹر مع ڈاکٹر پانڈے کے آفس سے باہر نکل کر اپنی کار میں بیٹھ رہا تھا، اسی وقت اس کا ہیڈ کلرک آ پہنچا۔

"یس؟" اس نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"سر، ڈاکٹر سید صاحب کا فون آیا ہے کہ وہ طاعون کا مریض ختم ہو گیا۔"

"اوہ... ڈائرکٹر کے ماتھے پر تفکر کی شکنیں ابھر آئیں۔ "اچھا اچھا۔" یہ کہتا ہوا وہ کار میں بیٹھ گیا۔ کار کے پیچھے اسٹاف ٹرک تھا، جس میں عملے کے تقریباً ایک درجن افراد سوار تھے۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے دگمبر روڈ ساؤتھ کی طرف روانہ ہو گئیں۔ ڈی ڈی ٹی اسپرے مشینیں اور کلورین اور دوسری ادویات بھی ساتھ لے لی گئی تھیں۔ ڈی ڈی ٹی اسکواڈ کے آدمیوں نے اپنے پیر گھٹنوں تک سفید موزوں سے اور ہاتھ دستانوں سے ڈھانک رکھے تھے

اور ان کے چہرے بھی سفید کپڑے میں ناک سے اوپر تک چھپے ہوئے تھے۔

ڈگمر روڈ پر زیمان بلڈنگ کے احاطے میں ان کے داخل ہوتے ہی ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ لوگ اپنے کمروں کی کھڑکیوں اور دروازوں سے ہیلتھ ڈپارٹمنٹ کی گاڑی سے اترنے والے اس سفید پوش عملے کو حیرت سے دیکھنے لگے، جو نسلِ انسانی کے تباہ کن دشمن مرض سے لڑنے کے لیے دواؤں اور احتیاطی تدابیر سے مسلح ہو کر آیا تھا۔

کمرہ نمبر ۹ بند کر دیا گیا تھا اور ایک مقامی ڈاکٹر کے مشورے پر اس کے آس پاس کے کمروں کے مکینوں کو وہاں سے ہٹایا جا چکا تھا۔

“بی ڈویژن کے انچارج ہیلتھ آفیسر ڈاکٹر پانڈے نے ایک کرایہ دار کے کمرے سے میز منگا کر وہیں بلڈنگ کے رہنے والوں کو اینٹی پلیگ ویکسین لگانے شروع کر دیے۔

ڈائرکٹر جب خود اس بند کمرے کا دروازہ کھول کر، منہ پر ناک تک رومال باندھے، اندر داخل ہوا تو کمرے میں زیادہ گندگی تو نہ تھی البتہ اس کی کیفیت اجاڑ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس میں رہنے والا گھریلو معاملات میں کافی لاپرواہ یا کاہل تھا۔

ڈی ڈی ٹی اسکواڈ کے آدمی ہاتھوں پر پمپ لیے تیار کھڑے تھے، لیکن ڈائرکٹر کی ناک کسی مرے ہوئے چوہے کی بو سونگھ رہی تھی، پھر اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے غور سے کمرے میں اڑنے والی مکھیوں کو دیکھنا شروع کیا۔

“پلیگ کی مکھیاں مریض کی جگہ سے زیادہ سے زیادہ تین فٹ اونچی اڑتی ہیں۔” وہ بڑبڑایا۔

“لیکن یہ تو چھت تک اڑ رہی ہیں۔” ایک انسپکٹر نے مؤدب انداز میں لقمہ دیا۔

“ہُم... اور چوہے بھی بلڈنگ میں کہیں مرے ہوئے نہیں پائے گئے۔” ڈائرکٹر نے اس کی طرف دیکھے بغیر تبصرہ کیا۔

“جی ہاں۔ اور پھر سیزن اور اس کی آب و ہوا بھی اس وقت صحتِ عامہ کے لیے قطعی

موزوں ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "اور ہمارا شہر ہی کیا، ہندوستان کے کسی بھی کونے سے اس کے ایک بھی کیس کی اطلاع ابھی تک نہیں ملی ہے۔"

"لیکن ڈاکٹر سید جیسا ماہرِ فن کسی مغالطے کا شکار نہیں ہو سکتا۔" ڈائرکٹر یہ کہتا ہوا اپنے آدمیوں کی طرف گھوم کر ان میں سے ایک سے بولا۔

"تم اندر اور باہر کی کچھ مکھیاں جالی میں پکڑ کر لاؤ، میں دیکھنا چاہتا ہوں۔" یہ کہتا ہوا وہ دروازے کی طرف پلٹا۔

"آپ لوگ ڈی ڈی ٹی چھڑکیے، کمرے کے باہر اور ملے ہوئے کمروں میں بھی، تین تین فٹ کی اونچائی تک۔" اسکواڈ کو یہ ہدایت کرنے کے بعد وہ باہر نکل آیا۔ باہر آ کر اس نے رومال ناک پر سے ہٹا لیا اور برآمدے میں کھڑے ہو کر حالات کا جائزہ لینے لگا۔ محکمۂ صحت عامہ کا اسٹاف اس وقت اپنے سب سے بڑے افسر کے سامنے حسنِ کارکردگی جتانے کے لیے کسی نئی مشین کے کل پرزوں کی طرح متحرک نظر آ رہا تھا۔

"مریض اکیلا ہی رہتا تھا اس کمرے میں یا اور بھی کوئی؟" ڈائرکٹر نے بلڈنگ کے ایک آدمی سے پوچھا۔ جو اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"اس کا ایک ساتھی اور بھی رہتا ہے یہاں، وہی اسے اسپتال لے کر گیا تھا۔"

"اس مرض کا حملہ اس پر کب ہوا تھا؟"

"شاید کل رات کو۔ کیوں کہ کل دوپہر میں میں نے خود اسے اچھا خاصا گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔"

"کیا وہ کہیں کام پر جاتا تھا؟"

"وہ کیا کام کرتا تھا، یہ آج تک ہم میں سے کسی کو معلوم نہیں، لیکن زیادہ تر گھر سے غائب ہی رہتا تھا اور راتوں کو دیر سے واپس آتا تھا۔"

"شراب بھی پیتا ہوگا؟"

"یہ... یہ میں نہیں کہہ سکتا مگر بلڈنگ والوں سے سنا ضرور ہے کہ دو ایک بار وہ پی کر آیا ہوا دیکھا گیا ہے۔" اس آدمی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"خیر ہوگا، میں یوں ہی پوچھ رہا ہوں۔ میں کوئی پولیس انسپکٹر نہیں ہوں جو آپ جھجک رہے ہیں۔" ڈائرکٹر مسکرا کر بولا۔

"جی، میرا مطلب صرف یہی تھا کہ خود میں اپنی بلڈنگ کے لوگوں سے بہت کم ہی ملتا ہوں، اس لیے میں یہاں اس بارے میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"اچھا، رات جب وہ گھر لوٹا ہے تو کیا اس کی طبیعت خراب ہو چکی تھی؟"

"جی ہاں۔ اس کا ساتھی بتا رہا تھا کہ باہر سے ہی وہ طبیعت خراب لے کر رات کو آیا تھا۔"

"باہر سے؟" ڈائرکٹر سوچ میں پڑ گیا۔ "اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ جہاں سے یہ بیماری لے کر لوٹا ہے وہاں بھی کوئی کیس ہوا ہوگا۔" وہ بڑبڑانے لگا۔

"ممکن ہے، ممکن ہے۔" اس آدمی نے اظہارِ خیال کیا۔

"تو پھر اس جگہ اور ان لوگوں کا پتا لگانا چاہیے جہاں سے چندریکر یہ مہلک مرض لے کر لوٹا ہے۔" ڈائرکٹر نے سوچتے ہوئے کہا۔

اتنی دیر میں ڈاکٹر پانڈے بھی اپنے کام سے فارغ ہو کر اس کے پاس آ گیا۔

"ڈاکٹر، آپ اپنا علاقہ سنبھال لیے میں ذرا اسپتال جا کر اس مریض کی لاش دیکھنا چاہتا ہوں۔" ڈائرکٹر نے کہا۔

"کیا کوئی خاص بات ہے؟" ڈاکٹر پانڈے نے پوچھا۔

"عجیب سا معاملہ ہے۔ بظاہر تو اس مقام پر اس بیماری کے کوئی آثار نہیں معلوم ہوتے۔ نہ طاعون کی مکھیاں، نہ مرے ہوئے چوہے نہ اور کوئی علامتیں۔ بہر حال میں اسے دیکھ کر ہی کوئی آخری رائے قائم کر سکوں گا۔" یہ کہتا ہوا وہ زینے کے ذریعے نیچے اترنے لگا۔ ڈاکٹر

پانڈے اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا، لیکن پھر اس نے کوئی اور سوال کرنے کی جرأت نہیں کی۔

……………

جو وقت وہ اسپتال پہنچا تو ڈاکٹر سید خلاف توقع اسے دیکھ کر چونک سا پڑا۔

”ہیلو، ڈاکٹر۔“ ڈاکٹر سید نے اسے دیکھتے ہی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

”ہیلو“ وہ تفکر کے آثار چہرے پر لیے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

”کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں آپ، خدانخواستہ وہ وبا پھیل تو نہیں رہی ہے؟“ ڈاکٹر سید نے پوچھا۔

”یہی تو مخمصہ ہے، سید صاحب۔ جس علاقے کا یہ کیس ہے، اس علاقے میں اس بلڈنگ اور اس کمرے تک میں اس مرض کے کوئی آثار نہیں ملے۔“ ڈائرکٹر نے بتایا۔

”آں...؟“ ڈاکٹر چونکا۔ ”ہاں۔ کچھ خیال تو مجھے بھی آیا تھا۔ کیوں کی اس پر یا اس کی لاش سے اوپر پلیگ کی مکھیاں اڑتی نہیں پائی گئیں۔“ ڈاکٹر سید نے کہا۔

”کیا آپ نے مریض کی گانٹھوں کا پس نہیں نکال کر دیکھا؟“

”نکالا جا چکا ہے اور اس میں طاعون کے جراثیم موجود ہیں۔ یہ شبہ کرنا کہ یہ اس سے ملتی جلتی کوئی اور بیماری ہو سکتی ہے، قطعی غلط ہوگا۔“ ڈاکٹر سید نے کہا۔

”مجھے معلوم ہے کہ مریض کل رات کو ہی بیمار حالت میں کہیں باہر سے آیا تھا اور اس طرح تو جہاں سے وہ آیا ہوگا وہاں اس مرض کے آثار تلاش کرنے چاہئیں۔“

”مجھے افسوس ہے کہ وہ خود کچھ بتا نہ سکا۔ اس کا پتا بھی اس کے ساتھی نے بتایا تھا۔“

”کیا اس کا ساتھی اس وقت اسپتال میں موجود ہے؟“

”وہ اینٹی پلیگ ویکسین لینے کے بعد چلا گیا تھا۔“

”تو پھر ہمیں اس مقام کا پتا نکالنے کے لیے شاید پولیس کی مدد لینی پڑے گی۔“

”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“ ڈاکٹر سید نے کہا۔

اس کے بعد ڈائرکٹر نے خود جا کر مریض کی لاش دیکھی اور اسپتال سے نکل کر چلا گیا۔

☆☆☆☆☆☆

موت کے آثار

مرنے والے کے ساتھی کو تلاش میں محکمۂ صحت کو زیادہ وقت نہیں اٹھانی پڑی۔ وہ اس کمرے میں ڈر کی وجہ سے واپس نہیں آیا تھا، لیکن سی ڈویژن کے ہیلتھ انسپکٹر نے ایک دوسرے پڑوسی سے اس کے دوسرے ٹھکانے معلوم کر لیے۔ وہ انھیں ایک معمولی قسم کے چائے کے ہوٹل میں بیٹھا مل گیا۔ اس نے بتایا کہ کل مغرب کے بعد چندر، سیما کے یہاں گیا تھا۔ بیرام جی اسٹریٹ پر اسے اس عورت کے بارے میں ایک پنواڑی سے معلوم کیا گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ کوئی اچھی عورت نہیں ہے اس کے ہاں لوگ شراب پی کر جاتے ہیں اور جوا کھیلتے ہیں۔ ہیلتھ انسپکٹر کو بہرصورت اس کی زندگی کے اس پہلو سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ صرف پلیگ کے آثار کی تحقیق کرنا چاہتا تھا، اس لیے اس نے ان باتوں پر دھیان نہیں دیا۔

جس وقت وہ سیما کے کمرے پر پہنچے، دروازہ اندر سے بند تھا۔ پڑوس کے لوگوں نے بتایا کہ وہ اسی طرح اکثر دن چڑھے تک سوتی رہتی ہے اور راتوں کو جاگا کرتی ہے، لیکن دروازے کی درز سے نکلنے والی تعفن کی ہلکی سی بھپک نے انسپکٹر کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔

”تو کیا وہ بھی...؟“

لیکن وہ اس کا دروازہ نہ تڑوا سکتا تھا، اس لیے الٹے قدموں واپس آنا پڑا۔ ایک ایرانی ہوٹل زیادہ دور نہیں تھا، جہاں اسے ٹیلی فون مل گیا۔ اس نے پولیس کو فوراً فون کر دیا۔ دوسری طرف سے علاقے کے انچارج پولیس انسپکٹر نے اسے یقین دلایا کہ وہ ابھی آ رہا ہے۔ انتظار کے باقی لمحات انسپکٹر کو اس مکان کے سامنے سڑک کے کنارے بے چینی سے ٹہل ٹہل کر گزارنے پڑے۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد ہی پولیس انسپکٹر ایک جیپ کار میں آ پہنچا۔ اس کے ہمراہ

دو کانسٹیبل اور ایک حوالدار بھی تھا۔

"کہاں ہے وہ لاش؟" اس نے ہیلتھ انسپکٹر سے اترتے ہی پوچھا۔

"اوپر... کمرہ نمبر ۱۲ میں۔" وہ بولا۔

"اوہ..." انسپکٹر نے کہا اور وہ آدمیوں کو لے کر اوپر چڑھ گیا۔ کمرے کا دروازہ ٹوٹتے ہی انسپکٹر ناک پر رومال رکھے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اندر ایک ادھیڑ عمر کی عورت کی سوجی ہوئی لاش پڑی بدبو دے رہی تھی۔ دروازہ کھلنے سے بدبو کے بھبکے باہر تک پہنچے اور لوگ چونک چونک کر دور کھسکنے لگے۔

ٹیلی فون کرنے پر چند منٹ میں ہی ایمبولینس بھی آ پہنچی اور لاش کو وہاں سے سول اسپتال کے مردہ گھر منتقل کر دیا گیا۔ یہاں پڑوس کے لوگوں سے یہ معلوم ہو گیا کہ چندر کل رات کو یہیں سے گیا تھا۔ وہ اکثر یہاں آیا کرتا تھا، لیکن یہ معلوم کر کے پولیس سب انسپکٹر کے کان بھی کھڑے ہو گئے کہ اس کمرے میں روز جوا کھیلا جاتا ہے اور خود سیما اسکی محرک تھی۔ پولیس کی دلچسپی کا واسطہ صرف ناپسندیدہ افراد اور جوئے بازوں سے ہی کچھ ہو سکتا تھا۔ سب انسپکٹر نے پلیگ کے کیس سے کوئی دلچسپی نہ لی۔ لیکن وہ ان افراد کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے لگا جو یہاں جوا کھیلنے جمع ہوتے تھے۔ ہیلتھ انسپکٹر اور اس کا اسٹاف اس کمرے کو بند کر کے پہلے آس پاس کے کمروں اور گیلریوں میں دوائیں چھڑکنے میں مصروف تھا۔

اطلاع ملنے پر کچھ دیر بعد ہی ایک ڈاکٹر بھی آ پہنچا، جس نے آس پاس کے لوگوں کو اینٹی پلیگ ویکسین دینے شروع کر دیے۔ پولیس انسپکٹر نے جب سیما کے پڑوسی بنگالی آدمی سے اس مقام پر جوا کھیلنے والوں کے نام پوچھے تو وہ صرف ایک کا نام بتا سکا۔ وہ کسی مل میں کام کرنے والا مستری تھا۔ اس کا نام شندے تھا۔ باقی کے بارے میں کچھ اسے معلوم نہ تھا۔ ہیلتھ آفیسر بھی جلد ہی آ پہنچا۔ انسپکٹر نے خود اسے سیما کی موت کے بارے میں بتایا، لیکن یہ جان کر وہ چونک پڑا کہ کل رات صرف سیما اور چندر ہی یہاں نہ تھے، بلکہ دو تین آدمی اور بھی جمع تھے۔

”ہمیں ان کا بھی پتا لگانا پڑے گا، ورنہ اگر وہ لوگ بھی کہیں پلیگ کے جراثیم اپنے ساتھ اپنے مکانوں تک لے گئے تو شہر بھر میں وبا پھوٹ پڑے گی۔“ ہیلتھ آفیسر بولا۔

”مجھے صرف اس سے دلچسپی ہے کہ وہ لوگ یہاں جوا کھیلتے تھے۔ ویسے بیماری وغیرہ سے متعلق تلاش کا کام آپ کے محکمے کا ہے۔“ انسپکٹر نے صاف گوئی سے کام لیا۔

”یہ ہزاروں لاکھوں انسانوں کی زندگی کا معاملہ ہے۔ پولیس کو بھی ہماری مدد کرنی پڑے گی۔“

”بہتر ہے۔ میں اپنے آدمیوں سے انھیں تلاش کرواتا ہوں۔ باقی معاملات آپ کا محکمہ جانے۔“

”اتنا ہی کافی ہے، لیکن یہ کام جلد از جلد ہونا چاہیے ورنہ اگر اس عورت کی طرح وہ بھی اس وبا کا شکار ہو گئے تو وہ مزید علاقے خطرناک ہو جائیں گے۔“ ہیلتھ آفیسر نے کہا اور پھر وہ اپنے انسپکٹر کی طرف متوجہ ہو گیا جو کمرے سے نکل کر اسی کی طرف آ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

”موت اگرچہ طاعون سے واقع ہوئی ہے، لیکن لاش کے اوپر تین فٹ تک اڑنے والی طاعون کی مکھیاں نہیں دکھائی دیں۔“ اس نے سلام کرنے کے بعد ہیلتھ آفیسر کو بتایا۔

”کوئی چوہا؟“ ہیلتھ آفیسر نے پوچھا۔

”چوہا کیا اس بیماری کا اہم جزو ہے کوئی؟“ پولیس انسپکٹر نے پوچھا۔

”دراصل یہ چوہوں کی ہی بیماری ہے۔ طاعون کی مکھی کو جب چوہے نہیں ملتے تب ہی وہ انسان پر حملہ کرتی ہے۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔

”عجیب بات ہے۔“ پولیس انسپکٹر نے کچھ نہ سمجھ کر سر ہلا دیا۔

”ایک چوہا ملا ہے، لیکن...“ انسپکٹر کہتے کہتے رک گیا۔

”لیکن کیا؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کی موت طاعون سے نہیں واقع ہوئی۔“ انسپکٹر نے ڈرتے ڈرتے رائے دی۔

”وہاٹ...؟“ ہیلتھ آفیسر حیرت سے بولا۔ ”کہاں ہے وہ؟“

”ایک ٹین کے ڈبے میں ڈلوا دیا ہے میں نے۔“

”چلو دیکھیں۔“ ہیلتھ آفیسر ڈاکٹر کے ساتھ کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

پولیس انسپکٹر کو تو ان کی گفتگو سن کر جھرجھری سی آ گئی تھی۔ وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆☆☆☆

موت کی چوری

خان ٹیلی فون کا ریسیور رکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ٹیلی فون پر کسی سے گفتگو کرنے کے بعد فکرمند سا نظر آنے لگا تھا۔

"دشمنوں کے نصیب سے آپ کچھ اکھڑے نظر آ رہے ہیں اس وقت؟" بالے گم چباتے چباتے پوچھ بیٹھا۔

"عجیب عجیب مصیبتیں کھڑی ہونے لگی ہیں اب تو۔" خان نے جھنجلائے ہوئے موڈ میں کہا۔

"اکدم غلط محاورہ ہے۔ مصیبت کھڑی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"بکومت۔"

"نہیں بکتا۔ آپ ارشاد فرمایئے۔"

"گاڑی نکلواؤ۔"

"ڈرائیور کو گزشتہ کل سے بدہضمی ہو گئی ہے۔"

"تم نکالو۔"

"میری سات پشتوں میں کوئی ڈرائیور پیدا ہوا ہے نہ ہوگا۔"

"میں کیا بول رہا ہوں؟" خان نے اسے غصیلی نظروں سے گھورا۔

"میں اپنی کار سمجھ کر باہر نکالے لیتا ہوں۔" بالے منہ بنا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

کان لباس تبدیل کر کے جب باہر نکلا تو بالے اسٹیرنگ پر بیٹھا سگریٹ کا دھواں اڑا رہا تھا۔

"باقلی انسٹیٹیوٹ۔" خان نے دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”آپ تو اس طرح حکم دے رہے ہیں جیسے بالے صاحب کوئی ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔“ یہ کہہ کر بالے نے گاڑی اسٹارٹ کر دی اور خان زیرِ لب مسکرا دیا۔

”باس، معاملہ کیا ہے آخر؟“

”چوری۔“

”لاحول ولاقوۃ۔ اتنی معمولی سی بات کے لیے ہمیں تکلیف۔“

”بات معمولی نہیں ہے۔“ خان کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔

”لاکھ دو لاکھ تو انسٹیٹیوٹ کے فنڈ بھی نہ رہے ہوں گے؟“

”روپے نہیں، کچھ اور۔“

”کوئی لونڈیا وغیرہ؟“

”بلی کو خواب میں چھیچھڑے ہی نظر آیا کرتے ہیں۔“

”تعبیر بھی فرما دیجیے۔“

”ہُم...“ خاں کچھ نہ بولا۔

”کوئی قیمتی جوہر چوری ہوا ہوگا؟“

”موت چرالی گئی ہے۔“

”موت...؟“ بالے چونکا۔ ”تو یعنی کہ اب چور سالے اتنے ہائی کلاس ہو گئے؟“

”صرف حقیر سے کیڑے۔“

”لعنت ہو ٹیلی فون کرنے والے پر۔ کیا مسخرا سمجھا ہے اس نے ہمیں؟“

”کچھ سمجھ کر ہی فون کیا ہوگا۔“

”اور کوئی نہیں ملا ہے؟“

”بیٹے، اگر میرا شک کہیں درست نکلا تو سارے شہر کی زندگی خطے میں سمجھو۔“ خان سنجیدگی سے بولا۔

”اف فوہ..اتنا گریٹ خطرہ۔ مگر آپ تو حقیر کیڑوں کی گفتگو کر رہے تھے۔“

”ہاں۔ بہت ننھے سے، لیکن انتہائی ہلاکت خیز۔“

”اس وقت آپ ماہر کیڑیات معلوم ہو رہے ہیں۔ ویسے تھے وہ کون سی ذات کے؟“

”پلیگ کے۔“

”پی..لیگ...؟“ بالے کا ہاتھ اسٹیرنگ پر بھٹکنے لگا۔

”گاڑی سنبھالو، سور۔ تم پر تو نہیں سوار ہو گیا پلیگ۔“

”ہے بھگوان، انسان بے چارہ ایک چھوٹے سے کیڑے سے بھی حقیر ہے۔“

”ہاتھی کی موت بھی کبھی کبھی چیونٹی سے ہو جاتی ہے۔“

”ہاتھی کی موت کا فلسفہ ہوگا۔ یہ اشرف المخلوقات کا معاملہ ہے۔“

”شہر میں اب تک طاعون کی تین کیس ہو چکے ہیں۔“

”تین ہو بھی چکے...“ آواز بالے کے حلق میں اٹکنے لگی۔ ”ہائے، اب کیا ہوگا؟“ وہ ایک ہاتھ سینے پر مار کر بولا۔

”کیوں، تمھیں کیا وحشت ہے؟“

”میری ہونے والی...“

”جہنم میں گئی وہ۔“ خان جھلا گیا۔

”ناممکن ہے۔ وہ پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہے، چار حج کر چکی ہے اور...اور..“

”اور دودھ بھی پیتی ہوگی؟“

”میں اپنی ساس کا ذکر کر رہا تھا۔ بزرگوں کا قول ہے کہ کسی کو بیوی بنانا چاہو تو پہلے ساس کا انتظام کرو۔“

”بکومت، گاڑی گھماؤ، انسٹیٹیوٹ ادھر ہے۔“ خان نے انگلی سے اشارہ کیا۔

”سزا انسٹی ٹیوٹ والوں کو ملنی چاہیے۔“

”کیوں؟“

”ایسے جراثیم انھوں نے جمع کر کے رکھے ہی کیوں؟“

”بیماریوں اور ان کے اسباب کی تحقیق کے لیے۔“

”اسباب کی تحقیق تو ایکسائز والے کرتے ہیں؟“

”بے موقع بکواس اچھی نہیں لگتی۔“

”لیکن انسٹی ٹیوٹ والے کیا گھاس چھیلتے ہیں جو اس قسم کے جراثیم چوری کر لے جائیں۔“

”قبل از وقت کوئی قیاس آرائی عقل مندی کی دلیل نہیں۔“

”کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ خود وہاں سے فرار ہو گئے ہوں؟“

”کون؟“

”جراثیم۔“

”اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ آپ کی اوندھی کھوپڑی بھی راہِ فرار اختیار کرے۔“

”میں نے تو صرف اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔ آپ اس حسنِ تحقیق پر جل گئے شاید؟“

”ابے واہ رے آپ کا حسن اور اس کی تحقیق۔ کون نہ جلے گا بھلا۔“

”میں نے حسنِ تحقیق عرض کیا ہے۔“ بالے جھنجلا گیا۔

”گاڑی کمپاؤنڈ میں لے لو۔“ خان نے اس کی ان سنی کر کے انسٹیٹیوٹ کے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

اور ان کی گاڑی دربان کے استفسار کو نظر انداز کرتی ہوئی انسٹیٹیوٹ کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ اندر ایک وسیع و عریض میدانی احاطے میں تین طرف سر اٹھائے کھڑی انسٹیٹیوٹ کی ACC کی نو تعمیر شان دار دو منزلہ عمارت اپنے سفید رنگ میں خاصی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

احاطے کے میدان کو سبزے کی کیاریوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور اس کے وسط میں ایک گول چبوترے پر کھڑے ہوئے اونچے ستون میں سرکاری قومی جھنڈا لہرا رہا تھا، جو اس انسٹیٹیوٹ کے سرکاری انتظام میں ہونے کی دلیل تھی۔ بالے نے گاڑی پورٹیکو میں کھڑی کر دی۔ خان گاڑی سے اتر کر سامنے والے حصے کے وسطی ہال کے دروازے میں داخل ہو گیا اور بالے نے گاڑی پارک کرنے کے لیے آگے بڑھا دی۔

سفید اور گول اونچے کھمبوں والے اسی ہال کی چھت فرش سے تقریباً ۵۰ فٹ اونچی تھی۔ ہال میں اندرونی کمروں کے دروازے تھے اور چاروں طرف دیواروں پر دنیا کے ان بڑے بڑے سائنس دانوں کے پورٹریٹ آویزاں تھے، جنھوں نے انسانیت کی خدمت کی خاطر اپنی زندگی بھر کی کوششوں سے زندگی کے آثار کو کھا جانے والی بیماریوں اور ان کے اسباب کی تحقیق کر کے ان کے علاج دریافت کیے تھے۔ ادویات کے فارمولوں کے یہ جنم داتا اور علم الطب کے نئے نئے پہلوؤں کے خالق اتنے ہی عظیم تھے جتنی ان کی کارآمد جدوجہد اور دنیا کے ہر کونے میں ان کے بعد ان کی تصویریں اور ان کے کارناموں کی یاد میں احترام کے ساتھ محفوظ کی جاتی تھیں۔ خان ان کی تصویروں کو دیکھنے میں منہمک تھا۔ تب تک بالے کار پارک کر کے آ پہنچا۔

”آپ شاید حکیم لقمان کا فوٹو تلاش کر رہے ہیں ان میں۔“ اس نے خان کو ٹوک دیا۔

”سکریٹری سے کہہ کر ڈائرکٹر کو خبر کرا دو کہ ہم آ پہنچے ہیں۔“ خان نے بالے کی طرف پلٹے بغیر اسے ہدایت کی۔

”اب یہ بھی میرے سر؟“ بالے جھنجلایا ہوا سا ہال میں بنے ہوئے اندرونی کمروں کے دروازوں میں سے ایک میں داخل ہو گیا۔ اس کے باہر دیوار میں ایک تختی لگی تھی جس پر ’سکریٹری‘ انگریزی میں لکھا تھا۔

چند منٹ کے بعد ہی انسٹیٹیوٹ کا وارڈن خود ہی آ پہنچا۔

”ہیلو، خان صاحب۔“ وہ خان سے مصافحہ کرنے کے بعد پھر بالے کی طرف متوجہ ہوگیا۔

”چھوٹا خان صاحب۔“ بالے نے خود اپنا تعارف کرادیا۔

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے بھی مل کے۔“ وہ خوش اخلاقی سے بولا۔

”میں آپ لوگوں کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ آیئے اندر تشریف لے چلیے۔“ وہ ایک دوسرے دروازے کی طرف اشارہ کرکے خود آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

☆☆☆☆☆☆

کیڑوں کی چوری

مختلف کمروں سے گزرتے ہوئے وہ ایک ایسے چوکور بڑے کمرے میں پہنچ گئے جس کی کھڑکیوں پر بھی جالی لگی تھی۔ اس کمرے میں بہت سی اونچی اونچی، لمبی چھوٹی میزیں اور اسٹول رکھے تھے، جن پر فولادی سلاخوں والے پنجرے رکھے تھے۔ ایک طرف ایک بڑی خالی میز پر کچھ شیشے کی نالیاں، ویکیوم اور چیمبر فٹ کیے ہوئے تھے، جن کے قریب ہی شیشے کے کچھ مرتبان تھے، جن میں سیال مادے بھرے ہوئے تھے۔ ان پنجروں میں سفید چوہوں سے لے کر خرگوش، گلہریاں اور چند پرندے اور بندر اور ریچھ کے بچے تک بند تھے۔

"سبحان تیری قدرت۔ یہ انسٹیٹیوٹ ہے یا عجائب خانہ۔" بالے نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر کہا۔

"یہ ہماری تجربہ گاہ ہے۔ یہاں نئی دریافتوں اور نئے جراثیم کے ردِ عمل کا تجربہ ان جانوروں پر انجیکشنوں کے ذریعے کیا جاتا ہے۔" ڈاکٹر کٹر نے بتایا۔

"خوب تو یہ بے چارے تختۂ مشقِ ستم ہیں۔"

"جو کچھ بھی سمجھ لیجیے۔" ڈاکٹر کٹر مسکرایا۔

پھر وہ اس کمرے کو عبور کر کے ایک دوسرے کمرے میں داخل ہوگیا۔ شاید حشرانیات کے مطالعے و تحقیق کا شعبہ تھا۔ یہاں شیشے کے بڑے چھوٹے مرتبانوں میں حشرات الارض بھرے ہوئے تھے۔ چیونٹی سے لے کر گرگٹ اور سانپ تک اور چھوٹی مچھلی سے لے کر مگرمچھ کے بچے تک۔ مگرمچھ کا بچہ ایک بڑے ٹب میں رکھا گیا تھا۔

"فقط وہیل مچھلی کی کسر ہے۔" بالے نے تبصرہ کیا۔

"وہ یہاں سما سکتی تو اس کا بھی انتظام کیا جاتا۔" ڈاکٹر کٹر بولا۔

"سر دست آپ میرا انتظام کر دیجیے۔ مجھے ان کیڑوں مکوڑوں کو دیکھ دیکھ کر قے آ رہی ہے۔" بالے نے برا سا منہ بنایا۔

"یہ یہ بھولو کہ تم بھی کبھی ایک حقیر سے کیڑے تھے۔" خان نے ہنس کر جواب دیا۔

"میں اس فارمولے کو نہیں مانتا۔"

"انسان اتنا ننھا منا سا ہوتا ہے کہ ایک سوئی کی نوک پر اسے خوردبین سے دیکھا جا سکے۔" ڈائرکٹر نے ایک تیسرے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اور پھر وہ ایک شیشے کی الماری کے قریب جا کھڑا ہوا، جس میں کئی چھوٹے چھوٹے مرتبان، شیشیاں اور شیشے کے ٹیوب مختلف خانوں میں بھرے ہوئے تھے۔ ان میں عجیب عجیب قسم کے ننھے منے کیڑے رینگ رہے تھے۔

"یہ دیکھیے، خطرناک قسم کے جراثیم ان ٹیوبس میں بھر کر رکھے جاتے ہیں اور یہ مردہ جراثیم کے ٹیوب ہیں۔ زندہ اور زیرِ تحقیق جراثیم ان ٹیوبس میں رکھے جاتے ہیں۔" وہ ٹیوبس کی طرف باری باری اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"لیکن یہ، جہاں سرخ سلپ لگی ہوئی ہے، یہ ٹیوب یہاں سے پراسرار طور پر غائب کر دیا گیا ہے۔" اس نے بتایا۔ "اس میں پلیگ کے زندہ کیڑے تھے۔"

"زندہ کیڑے؟" بالے حیرت سے اچھلا۔ "باپ رے، اور وہ بھی طاعون کے؟"

"جی۔" ڈاکٹر سنجیدگی کے ساتھ مختصراً بولا۔

"اور مردہ کیڑوں کیا کیا اچار ڈالا جاتا ہے؟" بالے نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔

"ان کی قسم کے زندہ کیڑوں سے پیدا ہونے والی بیماریوں کے لیے ان ہی مردہ کیڑوں کا انجکشن دیا جاتا ہے مریضوں کو۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"عجیب تھیوری ہے۔ پھر آپ سماجی بیماریو کو مردوں کا انجکشن کیوں نہیں دیتے؟"

بالے نے کسی فلاسفر کی طرح سوال پیش کیا۔ ڈائرکٹر مسکرا دیا، لیکن خان ان کی گفتگو سے بے نیاز غور سے اس الماری اور اس ٹیوب کی خالی جگہ کا جائزہ لے رہا تھا۔

"آپ آدمی دلچسپ ہیں، بالے صاحب۔" ڈائرکٹر نے خوش گوار موڈ میں کہا۔

"اس لیے کہ میں جراثیم کی اولاد نہیں ہوں۔" بالے نے کچھ اس طرح منہ پھلا کر کہا کہ ڈائرکٹر کو پھر ہنسی آ گئی۔

"یہ کب کی بات ہے؟" خان جیسے کسی دنیائے خیال سے چونک کر بولا۔

"میرے خیال میں جو کچھ ہوا ہے وہ سات آٹھ دنوں کے اندر اندر ہوا ہے۔۔ ڈاکٹر شرما نے آخری بار اس الماری کو پچھلے منگل کے دن کھولا تھا۔ انھیں چیچک کے مردہ جراثیم کی ضرورت تھی۔" ڈائرکٹر ڈاکٹر کرشن نے بتایا۔ "اور ان کے بیان کے مطابق اس وقت وہ ٹیوب الماری میں موجود تھا۔"

"اس الماری کو کسی نے اس کے بعد سے ہاتھ نہیں لگایا؟" خان نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ کل اتفاقاً میری نظر اس پر پڑ گئی تھی۔ ٹیوب کو غائب پا کر میں نے ڈاکٹر شرما سے پوچھا، وہ حیرت میں پڑ گئے۔ اور تب ہی سے اس کی تلاش شروع ہو گئی، لیکن انسٹیٹیوٹ کے صرف تین افراد ایسے ہیں جو اس الماری تک پہنچ سکتے ہیں اور انھوں نے خود بھی طاعون کی کیڑوں کی گم شدگی پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔"

"کیا وہ معتبر لوگ ہیں؟"

"قطعی، ڈاکٹر شرما اور ان کے دونوں اسسٹنٹ بڑے شریف، ذمہ دار اور پرانے آدمی ہیں۔ ان میں سے کسی پر بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔"

"ویسے اس کمرے میں صفائی تو روز کی جاتی ہوگی؟" خان نے سوال کیا۔

"وہ تو ضروری چیز ہے۔"

"اور جھاڑو دینے والا ڈاکٹر شرما یا ان کے اسسٹنٹس میں سے ہو نہیں سکتا؟" بالے

پھر بول پڑا۔

"کوئی عقل مندی کی بات نہیں کہی تم نے۔" خان اسے گھورنے لگا۔

"میں تو فی سبیل اللہ رائے دے رہا تھا۔"

"بکومت۔" خان نے اسے ڈانٹ دیا۔ ڈاکٹر کا موڈ سنجیدہ تھا۔

"صافائی کون کرتا ہے؟"

"بنسی لال، چپراسی ہے۔"

"تو پہلے میں اسی کا بیان لینا مناسب سمجھوں گا۔ آپ سردست اس کمرے کو مقفل کرا دیجیے، کوئی اور اندر نہ آنے پائے۔"

"ڈاکٹر کرشنن نے اپنے ہاتھوں سے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور وہ سب باہر نکل آئے۔ انسٹیٹیوٹ والوں کو یا تو ان سراغ رسانوں کی آمد کی خبر نہ تھی یا پھر وہ اپنے کاموں میں اس قدر منہمک اور ماسوائے اس قدر غیر مانوس رہتے ہوں گے کہ راستے میں ملنے والوں نے بھی ان اجنبی مہمانوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ وہ ڈائرکٹر کرشنن کے آفس میں آ کر بیٹھ گئے۔

ڈائرکٹر کا آفس سادہ، لیکن کافی آرام دہ اور خوب صورت تھا۔ سیاہ شیشے کے ٹاپ والی میز کے پیچھے وہ اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا اور بالے برا سا منہ بنائے کمرے کی ان سفید دیواروں کو دیکھنے لگا جن پر بڑے بڑے چارٹ آویزاں تھے۔ اسے ان آڑی ٹیڑھی لکیروں والے چارٹس یا حشرات الارض کی بعض زمانہ ماقبل از تاریخ کی قطعی تصویروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پھر بھی وہ ایک بڑے سیاہ بالوں والے ہاتھی کی تصویر پر تنقید کر ہی بیٹھا۔

"یہ ہاتھی ضرور ریچھنی کے پیٹ سے پیدا ہوا ہوگا؟" اس نے انگلی سے تصویر کیطرف اشارہ کیا۔

"وہ کیوں؟" ڈاکٹر کرشنن نے اسے دلچسپ نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

"اس لیے کہ اس کے بال..." بالے نے کہنا چاہا۔

"آپ کے سر کے بالوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔" خان نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں کتنی اچھی معلوماتی باتیں کر رہا تھا۔" بالے نے منہ بنا لیا۔ خوش مذاق ڈاکٹر پھر ہنس پڑا۔

"ڈاکٹر صاحب، بے ادبی معاف، میں نے پڑھا تو نہیں لیکن سنا ہے کہ زمانہ ماقبل ازتاریخ کے آدمی کے دم بھی ہوتی تھی؟"

"پھر فضولیات؟" خان نے اسے ٹوکا۔

"چپراسی کے آنے تک یہی سہی۔" ڈاکٹر نے خان کی طرف رخ کر کے کہا۔ "آخر تو معلوماتی پہلو ہے۔"

"جی ہاں۔ دیکھیے نا وہ مثل تو سنی ہوگی آپ نے کہ علم حاصل کرنے کے لیے اگر چین، جاپان بھی جانا پڑے گا تو جانا چاہیے۔ مگر امریکہ ضرور جانا چاہیے۔"

"کیوں؟"

"برسبیلِ تذکرہ عرض کر رہا ہوں۔ وہاں کا علم الحیوان بڑا لذیذ ہوتا ہے۔"

"علم الحیوان؟"

"مجھ سے ایک امریکی سیاح کہہ رہا تھا کہ امریکہ کی ۵۷ فیصدی آبادی وہاں کی روز مرہ ایجادوں پر حیرت زدہ رہتی ہے۔ ان ایجادوں میں ہالی ووڈ کی گوری پنڈلیاں بھی شامل ہیں۔" دوسرا ٹکڑا اس نے اس قدر آہستہ سے کہا کہ صرف خان ہی سن سکا۔ اس نے ایک پیر سے بالے کا پاؤں اس طرح دبا دیا کہ وہ تلملا اٹھا۔

"کیا بات ہے؟" ڈاکٹر نے چونک کر پوچھا۔

"جی کچھ نہیں۔ کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے میری انگلیوں کی نسیں چڑھ جاتی ہیں۔" بالے نے بات بنا دی۔

"ہُم تو آپ آدمی کی دم کے بارے میں پوچھ رہے تھے کچھ؟"

"جی ہاں، جی ہاں۔ وہ دم جواب جھڑ چکی ہے۔"

"نینڈرتھال میں کے دور کے انسانی ڈھانچوں میں پشتیر ریڑھ کی ہڈی کا سرا کسی قدر نکلا پایا گیا ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ ڈارون کی اس تھیوری میں کچھ صداقت ہو کہ انسان پہلے بندر تھا۔"

"اور بندر دم سمیت پیدا ہوتا ہے۔" بالے نے جلدی سے لقمہ دیا۔

لیکن ان کی گفتگو وہیں رک گئی۔ بنسی لال چپراسی آ پہنچا تھا۔ وہ دو اجنبیوں کو آفس میں موجود دیکھ کر ذرا بھی ہیں ٹھٹکا اور سلام کر کے ڈاکٹر کرشنن کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"دیکھو، صاحب لوگ جو پوچھتے ہیں اس کا صحیح صحیح جواب دو۔" ڈاکٹر خان اور بالے کی طرف اشارہ کر کے اس سے بولا۔

"جی صاحب؟" بنسی لال خان کی طرف رخ کر کر کے سوالیہ لہجے میں بولا۔

"تم کب سے یہاں کام کرتے ہو۔" خان نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

"چار سال سے۔" وہ ادب سے بولا۔

"اس سے پہلے کیا کرتے تھے؟"

"کلکتہ نیشنل بینک میں چپراسی تھا، صاحب۔" وہ بولا۔

"وہاں سے کیوں نکالے گئے؟"

"بینک دیوالیہ ہو گیا تھا۔"

"ہُم... تم اس کمرے میں روز جاتے ہو جہاں چوری ہوئی ہے؟"

"جی... جی ہاں۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"صاف اور صحیح جواب دو، تم پولیس کے افسروں سے گفتگو کر رہے ہو۔" ڈاکٹر نے اسے ڈانٹا۔

"صاحب، ایک آدھ دن ناغا بھی ہو جاتا ہے۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہم..." خان کچھ سوچنے لگا۔

"کل کس وقت گئے تھے؟"

"صبح ساڑھے نو بجے، صاحب۔"

"اور پرسوں؟"

"اسی وقت۔"

"کیا تم نے اس الماری کو کسی وقت کھلا ہوا پایا ہے؟"

"نہیں، صاحب۔ اس کی چابی صرف ڈاکٹر شرما صاحب کے پاس رہتی ہے۔ مگر میرے سامنے انھوں نے بھی کبھی اسے نہیں کھولا ہے۔"

"کیا ڈاکٹر شرما صاحب یا ان کے آدمیوں سے پچھلے چند دنوں میں کوئی آدمی ملنے آیا تھا یہاں؟"

"ملنے والے اول تو یہاں بہت کم آتے ہیں اور کوئی آتا بھی ہے تو اسے باہر ہال میں ہی بیٹھا دیا جاتا ہے، اندر نہیں آنے دیا جاتا۔" ڈائرکٹر بول اٹھا۔

"میرا سوال مختلف ہے۔" خان اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ "ہاں، تو؟" وہ پھر بنسی لال سے مخاطب ہوا۔

"صاحب، مجھے خبر نہیں۔ ویسے میں نے تو کبھی کسی کو نہیں دیکھا۔" اس نے بلا جھجک جواب دیا۔

"آپ کو معلوم ہے شہر میں طاعون کے کیسز ہو رہے ہیں؟" خان پھر ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔

"اس چیز نے تو مجھے اور چونکایا۔ کیوں کہ ڈائرکٹر آف پبلک ہیلتھ نے پرسوں مجھے خود ہی بتایا تھا کہ طاعون کے جتنے کیسز ہوئے ہیں، ان میں اسے پھیلنے والے آثار کا فقدان

ہے۔ مثلاً طاعون کی مکھیاں یا چوہوں کی موت وغیرہ۔" ڈاکٹر کرشنن نے بتایا۔ "بلکہ سچ پوچھیے تو اسی گفتگو کے بعد مجھے کل اس الماری کو دیکھنے کا خیال آیا، ورنہ میں کبھی اتفاق سے ہی اس طرف توجہ کرتا آیا ہوں۔ میری مصروفیت زیادہ تر انسٹیٹیوٹ کا نظام سنبھالنے میں رہتی ہے۔" ڈاکٹر کرشنن نے بتایا۔

"مجھے شبہ ہے کہ کہیں معصوم عوام کی زندگیوں کے ساتھ کوئی تباہ کن ڈرامہ تو نہیں کھیلا جانے والا؟" خان نے انگریزی میں ڈائرکٹر سے کہا۔ اس جملے پر نہ جانے کیوں خود اسے بھی جھرجھری سی آ گئی۔ اور بالے بھی کسی گہری فکر میں غرق ہو گیا۔

"مجھے بھی کچھ ایسا ہی شبہ ہو رہا ہے۔ اس انسٹیٹیوٹ کی ساٹھ سالہ زندگی میں کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا ہے۔ اور پھر زندہ جراثیم کی چوری کو کوئی اور مقصد بھی تو نہیں نظر آتا۔" ڈائرکٹر فکرمند لہجے میں بولا۔ خان نے چپراسی کو اشارہ کر دیا اور وہ باہر چلا گیا۔

"تجربہ گاہ کے کے جانوروں کو دانا پانی کون دیتا ہے؟" خان نے ڈائرکٹر سے پوچھا۔

"وسنت۔ اس کا کام ان جانوروں کی نگہداشت اور حسبِ ضرورت تجربوں کے لیے نئے جانور فراہم کرنا ہے۔" ڈاکٹر نے بتایا۔

"کیا اسے اس کمرے میں داخل ہونے کا کوئی موقع مل سکتا ہے؟"

"اسے... موقع...؟" ڈاکٹر سوچ میں پڑ گیا۔ "دونوں کمرے ملے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے... ممکن ہے..." وہ بڑبڑایا۔

"خیر، میں اسے خود دیکھ لوں گا۔ سردست جب تک میں اچھی طرح اس کمرے کا دوبارہ معائنہ نہ کر لوں، اسے کھولا نہ جائے۔" خان نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہیٹ سنبھالا۔

"لیکن...، لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس چوری کو مفادِ عامہ کی مصلحت سے ابھی راز میں ہی رکھا جائے۔" ڈائرکٹر فرمائشی لہجے میں بولا۔ "ورنہ لوگوں میں گھبراہٹ پھیل جائے اور

محکمۂ صحت کا کام بھی مشکل ہو جائے گا۔"

"میں جانتا ہوں۔" خان نے مسکرا کر وعدہ کیا۔ "لیکن سر دست آپ اس وسنت کو شبے کی نظر سے نہیں دیکھیں گے، تاوقتیکہ میں اس سے سوالات نہ کر لوں۔ اور ویسے بھی اپنا رویہ اس قسم کا رکھیے جیسے یا تو کچھ ہوا ہی نہیں ہے یا کوئی بہت معمولی بات ہوئی ہے۔" وہ باہر آتے ہوئے بولا۔ ڈائرکٹر اثبات میں سر ہلاتا ہوا ان کے ساتھ دروازے تک آیا۔ پھر وہ اس سے رخصت ہو کر اپنی کار میں روانہ ہو گئے۔

☆☆☆☆☆☆

صرف ایک گھنٹے بعد ہی خان بمع ایک فوٹو گرافر اور پرنٹ ٹیکر کے پھر انسٹیٹیوٹ کے اس کمرے میں موجود تھا۔ اسپرے ایکوزر کے ذریعے کمرے کے فرش پر جمے ہوئے خفیف سے نشانات کو ابھارا جا چکا تھا اور وہ غور سے جھک کر ان کا معائنہ کر رہا تھا۔ اچانک وہ چونک پڑا۔

"مجھے تو کسی جنس لطیف کی بو آ رہی ہے۔" بالے ناک سکوڑ کر بولا۔

"ہاں۔ اتنے چھوٹے اور پتلے پیر کسی عورت یا لڑکی کے ہی ہو سکتے ہیں۔" خان بڑبڑایا۔

اس کا اشارہ ایک دیوار کی جڑ میں ابھر آنے والے ایک چھوٹے سے پیر کے نشان کی طرف تھا جو سب سے علاحدہ اور دھندلا دھندلا تھا۔ بالے نے فوراً اس کا ناپ لے لیا۔ قدموں کے باقی نشانات مختلف، بڑے اور کمرے کے دروازے سے الماری تک تھے۔ پرنٹ ٹیکر نے بھی اس نشان کا پرنٹ لے لیا اور فوٹو گرافر نے قانونی طریقِ کار پر کمرے، الماری، دروازے اور دیواروں، روشن دان اور چھت وغیرہ تک کی تصویریں لے لیں۔ اتنی باریکی نہ کی جاتی اگر اس چھوٹے سے مسئلے سے ایک بھیانک امکانی مستقبل وابستہ نہ ہوتا۔ خان جس انہماک سے

ان حقیر کیڑوں کی چوری کی واردات کی جانچ کر رہا تھا، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ معاملہ کسی ہنگامی اہمیت کا حامل ہے اور بالے لال اسے اس وجہ سنجیدہ دیکھ کر خود بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت کوئی بھی الٹی سیدھی قیاس آرائی اس کی شامت لے آئے گی۔ پھر بھی ایک بار اس سے نہ رہا گیا۔ وہ بول ہی پڑا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کمرے میں بہت سے بھوت رمبھا کا رقص پیش کر چکے ہیں۔"

"اور ان میں سے ایک تم بھی ہو۔" خان نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"سمجھ میں نہیں آیا۔"

"اپنے قدموں کے نشانات خود پہچان لو۔" خان یہ کہہ کر الماری کے شیشے کے فریم اور اس کے کسی پھول کا معائنہ کرنے لگا۔

"الماری کا کی ہول کوئی خاص نہیں۔" وہ بڑبڑایا۔ "اسے صرف ایک ہیر پن کی مدد سے کھول لیا گیا ہے۔"

"ہیر پن...!" ڈائرکٹر چونک پڑا۔ "ہیر پن تو عورتیں یا لڑکیاں استعمال کرتی ہیں اور اس کمرے میں کسی عورت یا لڑکی کا گزر ناممکنات میں سے ہے۔" وہ بولا۔

"ناممکنات میں سے نہ ہوتا تو معاملہ اتنا پراسرار کیوں بن جاتا۔ ویسے کیا انسٹیٹیوٹ میں کچھ عورتیں یا لڑکیاں بھی کام کرتی ہیں؟"

"تربیتی شعبوں میں تین لڑکیاں زیر تربیت ہیں، لیکن ان کے اس طرف آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ وہ صرف نباتاتی ریسرچ سے متعلق ہیں۔" ڈائرکٹر نے بتایا۔

"تو کوئی اور ہی۔ لیکن کی ہول میں الجھا ہوا یہ ایک چھوٹا سا سنہری مائل ریشمی بال یقیناً کسی مرد کا نہیں ہوسکتا۔ جلدی میں سر کے بالوں سے نکالے جانے والے ہیر پن میں الجھ کر یہ اس جگہ تک پہنچا ہوگا اور پھر ہیر پن واپس باہر کھینچتے وقت یہیں اٹک کر رہ گیا۔" خان نے

بڑے احتیاط سے کی ہول میں اندر پھنسے ہوئے ایک بال کا سرا باہر پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے وہ بال بالے کی طرف بڑھا دیا تا کہ حفاظت سے رکھے۔

"مجھے اس پری کا قصہ یاد آ رہا ہے جس کے بال کو آگ دکھانے سے وہ فوراً حاضر ہو جاتی تھی۔ اے کاش۔" بالے لمبی ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولا، جس پر خان اسے گھورنے لگا۔

"میں سنٹ پرسنٹ سنجیدہ ہوں۔" بالے نے معصوم چہرہ بنا کر کہا۔ "کوئی چیز یاد آ جائے تو میرا کیا قصور؟"

"زمین پر پڑتے ہوئے قدموں کے ان نشانات میں، میرے بالے کے، آپ کے اور ڈاکٹر شرما کے جوتوں کے نشانات کے علاوہ چپراسی جسی اور ایک کسی لڑکی کے پیر کا نشان بھی نظر آ رہا ہے۔" خان ڈائرکٹر کو بتانے لگا۔

"ہائے لڑکی۔" بالے نے آہستہ سے سانس کھینچی۔ "جب بال ٹہرے تھے تو چوکھنا کیا رہا ہوگا۔" وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا۔

"تو کیا آپ کا مطلب ہے کہ کوئی لڑکی یہاں کسی کے ساتھ...؟"

"نہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی کے ساتھ ہی آئی ہو گی، کیوں کہ اس کے پیر کا نشان دیوار کی جڑ میں پایا گیا ہے، جب کہ دوسرے نشانات دروازے سے شروع ہوتے ہیں۔ وہ ضرور اس روشن دان سے اندر اتری ہوگی۔ میرا مطلب ہے جانوروں والی تحقیق گاہ سے روشن دان کے راستے۔" خان نے کہا۔

"اس کے علاوہ اس کے پیر کا نشان دوسروں کی نسبت دھندلا اور سب سے علاحدہ ہے۔ اس لیے ممکن ہے یہ کام کچھ دن پہلے کسی رات کو کیا گیا ہو۔ اور کمرے کی صفائی کرتے وقت یہ جگہ جھاڑو کی زد میں آنے سے بچ گئی ہو۔"

"خوب۔ آپ تو کسی جادوگر کی طرح سب کچھ جانے لے رہے ہیں۔" ڈاکٹر نے گویا خان کی اس حیرت انگیز دماغی صلاحیت کا اعتراف کیا۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں، ڈاکٹر صاحب۔“ بالے نے کچھ کہنا چاہا لیکن خان کی گھورتی نظروں کو دیکھ کر اس نے بات کا رخ بدل دیا۔ ”میں کہہ رہا تھا کہ... کہ... آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔“

”لیکن اس راستے سے بھی کوئی آ کیسے سکتا ہے، روشن دان تو خود بھی تنگ ہے؟“ ڈائرکٹر نے روشن دان کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اگر کوئی پچھلے کمرے سے اس کی مدد کر رہا ہو اور اسے اس روشن دان سے اندر ٹھیل دے تو اس میں سے سر کے بل نیچے لٹک کر ہاتھوں کی روک پر نیچے کود پڑنا آسان ہے۔“ خان نے بتایا۔ ”اور اسی طرح اسے روشن دان میں سے کسی رسی یا رسی کی پتلی سیڑھی کی مدد سے واپس لے جایا جا سکتا ہے۔“ خان نے روشن دان کو اور قریب سے جا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ ایک میز روشن دان کے نیچے دیوار کے سہارے رکھوا کر اس پر کھڑے ہوتے ہوئے روشن دان تک پہنچ گیا۔ اس کا اندازہ صحیح نکلا۔ اس گول روشن دان کی نچلی کگر پر کسی چیز کی رگڑ کا نشان موجود تھا۔

پھر وہ اس جانوروں والے کمرے میں آ گیا۔ یہاں بھی اس نے اس روشن دان کی کگر پر رگڑ کا نشان پایا۔ پھر وہ کمرے میں کھڑا ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

”ذرا آپ لوگ باہر تو چلے جایے، ایک منٹ کے لیے۔“ اس نے ڈائرکٹر اور ڈاکٹر شرما سے کہا، جو بعد میں آ پہنچے تھے۔ وہ لوگ بغیر وجہ پوچھے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہیں خان اور بالے کمرے کے داخلی دروازے سے باہر نکل گئے اور سیکنڈ بعد ہی پھر اندر گھس آئے۔ اس بار انھیں کسی مانوس چہرے کے ساتھ نہ دیکھ کر اس کمرے کے جانوروں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ خان مسکرا دیا۔

”اب آپ تشریف لے آیے۔“ خان نے ڈائرکٹر کو آواز دی۔ لیکن اس کے اور ڈاکٹر شرما کے اندر آتے ہی وہ تمام جانور خاموش ہو گئے۔

"اگر رات کے کسی وقت میں یہ جانور یہاں شور مچانے لگیں تو کوئی ان کی آواز باہر سن سکے گا؟" خان نے ڈائرکٹر سے عجیب سا سوال کیا۔

"لیکن یہ جانور لاؤڈ اسپیکر استعمال نہیں کرتے۔" بالے بیچ میں بول پڑا۔

"تم چپ رہو۔" خان نے اسے ڈانٹ دیا۔

"باہر دو دو چوکیدار تمام رات بیدار رہتے ہیں۔ وہ اندر باہر گشت بھی کرتے ہیں۔ اور رات کے سناٹے میں تو ان کے شور کی آواز دور دور تک سنائی دے سکتی ہے۔" ڈاکٹر نے بتایا۔

"تب ٹھیک ہے۔" خان نے مطمئن لہجے میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا ٹھیک ہے؟" ڈائرکٹر نے پوچھا۔

"یعنی جس نے جو کچھ کیا ہے سب ٹھیک کیا ہے۔" خان کی بجائے بالے بول اٹھا۔

"کیا مطلب؟" ڈاکٹر چونک کر بولا۔

"یعنی کہ... یوں سمجھ لیجیے..." بالے آہستہ سے بولا۔ "کہ خان صاحب کو بیٹھے بٹھائے سراغ کا الہام ہو گیا۔"

"بالے..." خان کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"وسنت کو گرفتار کر لو۔"

"وسنت کو...؟" ڈائرکٹر نے اور زیادہ حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "مگر وہ تو..."

"میں جو کر رہا ہوں، ٹھیک کر رہا ہوں۔ آپ ابھی نہ سمجھ سکیں گے۔" خان یہ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔ بالے کسی اجنبی کی طرح 'وسنت بھیا' آواز دیتا ہوا جب باہر برآمدے میں گیا تو وسنت اسے کوئی واقف کار سمجھ کر سامنے آ گیا۔ وہ قطعی مطمئن اور بشاش نظر آ رہا تھا، کیوں کہ خان کی ہدایت کے مطابق ڈائرکٹر مصلحتاً اسی کے سامنے ڈاکٹر شرما کو یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ کوئی خاص بات نہیں، کیڑے اور منگا لیے جائیں گے۔ اتنی سی بات کے لیے کیا

فکر کرنا'۔

مگر جس وقت بالے نے اس کی کلائی پر ہاتھ ڈالا تو وہ چونک سا پڑا۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

"کیا بات ہے؟ تم کون ہو؟" اس نے روندھے ہوئے گلے سے کہا۔

"ابے واہ، اپنے باپ کو نہیں پہچانتا؟" بالے نے اس کے سر پر ایک دھول جما کر کہا۔ "ہمیں کالا بخار کہتے ہیں۔ ہم جس پر آجاتے ہیں اس کی عاقبت تک کالی ہو جاتی ہے۔"

وسنت کے چہرے پر اس وقت عجیب سی تذبذب کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس نے ایک بار پوری طاقت سے ہاتھ جھٹک کر بالے کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی، لیکن گرفت اور وہ بھی سارجنٹ بالے کی، وہ خود ہی اپنی کلائی ٹوٹتی محسوس کر کے چیخ اٹھا۔

"یہ پانچ انگلیاں آکٹوپس کی سونڈیں ہیں، برخوردار۔" بالے نے اس کی کلائی اور جکڑ لی۔

"مگر تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"جہنم کے کیڑے بہت دن سے بھوکے ہیں، ڈیئر وسنت۔ تمہارا آچار ڈال کر ہم چوہوں کی دعوت کریں گے، موٹے موٹے پلیگ کے کیڑے۔"

بالے کے اس جملے پر وہ دوبارہ چونک پڑا۔ اس کے ہاتھ پیر کانپنے لگے۔

☆☆☆☆☆☆

"پولیس ہیڈ کوارٹرز کے محکمہ سراغ رسانی کے انویسٹی گیشن روم میں اس وقت تین آدمی تھے۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔

"کون تھی وہ لڑکی؟" خان درشت لہجے میں وسنت سے پوچھ رہا تھا۔ اور وسنت ایک کرسی پر خوف زدہ سا بیٹھا باری باری بالے اور خان کی صورت تک رہا تھا۔

”صرف ایک موقع اور، ورنہ تمہاری روح تک قبول دینے پر آمادہ ہو جائے گی۔“ بالے نے اس کے سر کے بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

”ہم... میں... میں کچھ نہیں جانتا۔“ وسنت نے شدتِ درد سے کراہتے ہوئے کہا۔

”تم سب کچھ جانتے ہو۔ تم نے ہی اس لڑکی کو رات کے وقت روشن دان سے اس کمرے میں داخل کیا تھا۔ پھانسی کی سزا تم کو ہی ملے گی۔“

”پھانسی...؟“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”ہاں۔ ان کیڑوں کی چوری کی وجہ سے ہزاروں انسانوں کی زندگیاں خطرے میں پڑ گئیں ہیں۔“

”مگر اس نے تو کہا تھا کہ وہ کوئی دوا چرانا چاہتی ہے۔“

”کس نے؟“ بالے جلدی سے سوال کر بیٹھا۔

”وہ... وہ... لڑکی...“

”کون ہے وہ لڑکی؟“

”میں نہیں جانتا۔“

”کتے کی دم پھر ٹیڑھی کی ٹیڑھی۔“ بالے نے اس کے بالوں کو پھر جھٹکا دیا۔

”مم... میں سچ کہہ رہا ہوں، صاحب، پرماتما کی سوگند میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں اسے بالکل نہیں جانتا۔ صرف صورت سے پہچانتا ہوں۔“

”کہاں ملی تھی تمہیں وہ؟“

”پہلے پہل مجھے ایک کالا سا چھوکرا چوراہے پر ملا تھا۔ وہ مجھے ایک پارک میں بلا لے گیا تھا، جہاں بینچ پر پہلے سے ایک جوان سی لڑکی بیٹھی تھی۔“

”اور تم اسے دیکھ کر ریشہ خطمی ہو گئے ہو گے؟“ بالے برا سا منہ بنا کر بول اٹھا۔

”جی...؟“ اس نے شاید اس کے جملے کا مطلب نہ سمجھ کر پوچھا۔

''ی حکمت کی باتیں ہیں، تم نہ سمجھو گے۔ ہاں بیان جاری رہے۔'' بالے خان کے بگڑنے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

''اس لڑکی نے مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، صاحب۔ اس نے صرف یہ کہا تھا کہ اسے ایک ایسی دوا چاہیے جو اس کمرے میں رکھی ہوئی ہے اور اس کے لیے وہ مجھے پانچ سو روپے دینے کا وعدہ کر رہی تھی۔ میں نے اس پر انکار کر دیا کہ میں اس کمرے میں نہیں جا سکتا، نہ ہی اس کی چابی مجھے مل سکتی ہے۔ لڑکی کچھ دیر سوچتی رہی، پھر اس نے مجھ سے کہا کہ اگر میں اسے جانوروں والا کمرہ ہی دکھا دوں تو وہ مجھے دو سو روپے دے گی۔ صاحب، میں نے لالچ میں آ کر منظور کر لیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ اتنی بڑی بھول ہو گی۔'' وہ گھگھیائے ہوئے انداز میں کہتے کہتے رک گیا۔

''جھوٹ مت بولو۔ تم نے خود اسے اس کمرے میں اتار کر اس کے باہر واپس آنے میں مدد کی ہے۔'' خان نے اسے گھور کر کہا۔

''وہ... وہ، صاحب... وہ بعد کی بات ہے۔ پہلے وہ ایک رات کو نہ جانے کس طرح اندر آ گئی تھی اور اسی وقت رات اس نے جانوروں والا کمرہ دیکھا۔ اس نے مجھے دو سو روپے بھی دیے اور یہ کہہ کر چلی گئی کہ وہ مجھ سے پھر ملے گی جس سے مجھے بڑا فائدہ ہو گا۔''

''پھر؟''

''پھر وہ تین چار دن پہلے مجھے اچانک راستے میں مل گئی۔ وہ ایک کار میں بیٹھی تھی۔ اس نے مجھے پاس بلا کر گاڑی میں بٹھا لیا۔''

''کیا اکیلی تھی وہ کار میں؟'' بالے نے سوال کیا۔

''ایک آدمی اور تھا، صاحب۔ وہ کوئی امیر آدمی معلوم ہوتا تھا۔ گاڑی وہی چلا رہا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''اس آدمی کی شکل یاد ہے تمہیں؟''

"میں نے اس کی صورت نہیں دیکھی، صاحب۔ اس کی آنکھوں پر کالی ٹھنڈی عینک چڑھی تھی اور نیچے کا منہ کوٹ کے کالروں میں اور پیشانی ہیٹ میں چھپی ہوئی تھی۔" وسنت نے کہا۔

"پھر وہ تمھیں کہاں لے گئے تھے؟"

"شہر سے باہر بیتی ندی کے پل پر۔ وہاں انھوں نے گاڑی روک لی۔ اس لڑکی نے مجھ سے وہاں کہا کہ اگر میں روشن دان کے ذریعے اس کمرے میں داخل ہو کر وہ دوا نکال لانے میں اس کی مدد کروں تو مجھے ایک ہزار روپے ملیں گے۔ صاحب، میں غریب آدمی پھر لالچ میں آ گیا۔ مجھے اپنی بیٹی کی شادی کرنی تھی اور روپیوں کی بہت سخت ضرورت تھی۔"

"تو چندہ کر لیا ہوتا، کم بخت، شریف آدمیوں سے۔" بالے نے اس کا سر جھٹک کر کہا۔

"اف..." وہ شدتِ درد سے کراہ کر رہ گیا۔

"اور پھر تم نے اس کا کام کرا دیا؟" خان نے اس کی طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر کہا، جس پر اس نے سر جھکا لیا۔

"اس لڑکی کا حلیہ کیا تھا؟"

"گورے رنگ کی پھرتیلی سی لڑکی تھی، صاحب۔ اس کی ٹانگیں آدھی ننگی تھیں۔ وہ سایہ پہنے ہوئے تھی۔ سر کے بال چھوٹے اور سنہرے سے تھے۔"

"شکل کیسی تھی؟"

"خوب صورت تھی، صاحب۔"

"ابے واہ، بیٹے۔ مجنوں کی اولاد معلوم ہوتے ہو۔ خوب صورتی بھی جانچ لی۔" بالے پھر بول پڑا۔

"میں تو حلیہ بتا رہا ہوں، صاحب۔"

”ہاں اور کہو۔“

”اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور چمک دار تھیں، صاحب۔ اور چہرہ گول سا تھا۔“

”اور کوئی خاص پہچان؟ ٹھیک سے یاد کرو۔“ خان نے اب اپنا لہجہ نرم کر دیا۔

وسنت کسی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کچھ دیر بعد وہ خود ہی چونک کر بولا۔ ”ہاں، صاحب۔ اس کے ایک پیر کی بیچ کی انگلی چھوٹی اور اوپر اٹھی ہوئی تھی۔“

”معلوم ہوتا ہے کافی غور سے دیکھا ہے تم نے۔“ بالے نے جلے ہوئے سے انداز میں کہا۔ اس کے لہجے میں ایک قسم کی رقابت سی جھلک رہی تھی۔ جیسے اسے ایک خوب صورت جوان لڑکی کے بارے میں وسنت کی اس قدر تفصیلی معلومات اچھی نہ لگی ہوں۔ اس کے دماغ میں تو وسنت کے بیان کردہ اس لڑکی کے سراپا کے تصور سے ہی کیڑے رینگنے لگے تھے۔

”روشن دان تک چڑھنے کے لیے اس نے اپنے جوتے اتار دیے تھے، صاحب۔ اور میں نے کیوں کہ اسے سہارا دیا تھا، اس لیے اس کے پیروں پر میری نظر پڑ گئی تھی۔“ وسنت نے خود ہی اس کی وجہ سمجھا دی۔

”اگر اسے کہیں دیکھو تو پہچان لو گے تم؟“ خان نے پوچھا۔

”جی ہاں، صاحب۔“ وسنت بولا۔

”خیر، اسے سر دست حوالات میں رکھو۔ بعد میں اس کے لیے سوچیں گے۔“ خان بالے کی طرف گھوم کر بولا۔

”لو بیٹے، اور مارو ایک تیر سے دو شکار۔ اب اس شاہی یتیم خانے میں تمہارا حساب کتاب برابر ہو جائے گا۔“

”یہ معلومات کافی نہیں ہیں۔ ہمیں اس لڑکی کا سراغ نکالنا پڑے گا۔ ہاں، کون سا پارک تھا وہ؟“ خان نے پھر وسنت سے پوچھا

”صاحب، راجا باغ۔“

"جگہ بھی خوب چھانٹی اس نے۔ جہاں ہزاروں مرد، عورتیں روز آتے جاتے رہتے ہیں۔" بالے بولا۔

"اور وہ کار کیسی تھی جس پر وہ لوگ تمہیں لے گئے تھے؟" خان نے پھر سوال کیا۔

"صاحب، لمبی سی تھی۔ کالا رنگ تھا اس کا۔"

"بالے، اسے نئے پرانے ماڈل کی کاروں کی کیٹلاگ دکھا کر معلوم کرو، کس قسم کی کار تھی وہ؟" خان نے بالے کو ہدیت کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆☆☆☆

چوہوں کی تقسیم

کیٹلاگ میں جو کار روسنت نے شناخت کی وہ بیڈفورڈ کے نئے ماڈل کی تھی۔ اس کا رنگ کالا بتایا گیا تھا۔ اور بعد میں رجسٹریشن آفس سے جب کالے رنگ کی بیڈفورڈ گاڑیوں کے نمبر نکالے گئے تو وہ تعداد میں پچاس سے زیادہ تھیں۔ اس طرح ان میں سے ہر ایک کے مالک کے متعلق تحقیقات کرنا کائی آسان بات نہ تھی۔ بالے نے شام کے وقت وہ فہرست لاکر خان کے سامنے رکھ دی۔

”لیجیے، یہ ایک شبے کی پچاس اولادیں ہیں۔ جس کا کان تھامنا ہو تھام لیجیے۔“

”یہ کام تو ایک معمولی کلرک بھی کرسکتا تھا، تم نے کون سا تیر مارا ہے۔“

”اسے کہتے ہیں نیکی کر دریا میں ڈال۔ تمام دن رجسٹریشن آفس میں سر مارا اور نتیجہ ڈھاک کے تین پات۔“

”ان کے مالک کون ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ شخصیتیں معتبر ہیں یا وغیرہ وغیرہ، مجھے یہ تمام تفصیل چاہیے؟“

”یہ آپ کو وغیرہ وغیرہ سے ملے گی۔“

”یعنی؟“

”ایک حرام مونچھ وغیرہ دوسرا اناٹیا وغیرہ وغیرہ۔“

”اور تم؟“

”میں صرف اس چھوٹی انگلی کو تلاش کرنا داخلِ ثواب سمجھتا ہوں۔“

”تمہیں تو عورتوں کے اسکواڈ میں بھرتی ہونا تھا، یہاں کیوں جھک مارنے چلے آئے؟“ خان نے مصنوعی جھنجلاہٹ سے کہا۔

"اب ٹرانسفر کرا دیجیے، میری عاقبت روشن ہو جائے گی۔"

"پہلے جنس تبدیل کرا لو اپنی۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ میں سمجھا آپ مجھے اس کا انچارج بنا کر بھیج رہے ہیں۔"

لیکن خان کے کچھ کہنے سے پہلے انسپکٹر ڈیسوزا آ پہنچا۔ وہ کچھ فکرمند سا نظر آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" خان نے پوچھا۔

"دو کیس اور ہوئے آج پلیگ کے۔" ڈیسوزا نے بتایا۔

"ہیلتھ ڈپارٹمنٹ کی رپورٹ کیا ہے؟"

"وہ لوگ پریشان ہیں۔ بظاہر اس وبا کے پھیلنے کے آثار نظر نہیں آ رہے اور پھر بھی کیسز ہو رہے ہیں۔ محلے محلے میں میونسپل کی طرف سے چوہے دان تقسیم کیے جا چکے ہیں اور ہر زندہ اور مردہ چوہے کی جانچ کی جا رہی ہے، مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اسے پھیلانے کی کوشش پوری طرح کی جا رہی ہے، لیکن قدرتی طور پر پھیلنے والی وبا جیسے اثرات وہ پیدا نہیں کر سکے ہیں۔"

"تو کیا اس میں کسی سازش کا پہلو ہے؟" ڈیسوزا حیرت سے چونک پڑا۔

"میرے خیال میں عوام کی زندگی کے ساتھ ایک خطرناک ترین سازش کی جا رہی ہے۔"

"لیکن حضرت عزرائیل پرمٹ کے بغیر کیسے جانیں لے لیتے ہیں؟" بالے پھر بول پڑا۔

"وہیں جا کر پوچھ لو ان سے۔"

"ہائے، ہم تو سو بار مرنے کو تیار ہیں، مگر کسی کی نگہِ ناز..."

"شٹ اپ..."

"ڈیسوزا صاحب، خاں صاحب کچھ فرما رہے ہیں۔"

"بھئی مجھے معاف رکھو۔" ڈیسوزا نے ہنس کر بات ٹال دی۔

"آپ ان ناموں میں سے ان آدمیوں کے متعلق مجھے رپورٹ دیجیے، جن کا تعلق کسی طبی ادارے یا دواؤں کے کاروبار سے ہو۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ وسنت نے موٹر کی شناخت میں محض اندازہ ٹھونک دیا ہو۔" بالے نے سنجیدگی سے کہا۔

"اس کیس کی اہمیت کے پیشِ نظر ہر معمولی سے معمولی امکان کا بھی ہمیں جائزہ لینا پڑے گا۔" خان نے ان دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے ہدایت کی۔

"کوئی ایسی فرم جو پلیگ کے انجکشن تیار کرتی ہو؟" بالے نے رائے دی۔

"اینٹی پلیگ ویکسین صرف ہافکن انسٹیٹیوٹ میں ہی تیار کیے جاتے ہیں۔" خان نے بتایا۔

"اور اگر کم پڑ جائیں تو؟"

"تو جاپان یا امریکہ یا یورپ سے منگوا لیے جاتے ہیں۔"

"تب تو معاملہ واقعی بڑا ٹیڑھا ہے۔"

"مجھے ڈر ہے کہ اگر ایک بار یہ وبا پھیلنی شروع ہو گئی تو اس پر کنٹرول کرنا مشکل ہو جائے گا۔" خان کا لہجہ کسی پیش آئندہ خوف سے متاثر تھا۔ "جس قدر جلد ہو سکے ہمیں اس کے اسباب کا سراغ نکالنا چاہیے۔"

"اس آدمی کا کوئی پتا چلا جو چندر کے ساتھ اس رات جوا کھیلتا بتایا گیا تھا؟" خان نے پوچھا۔

جی ہاں۔ وہ بھی اسی وبا کا شکار ہو چکا ہے۔ اور اس کے آگے کوئی سراغ نہیں مل پا رہا۔"

"آج جو دو کیس ہوئے ہیں؟"

”وہ لوگ کہاں سے اس بیماری کا اثر لے کر آئے، یہ پتا چلانے کی کوشش کی جا رہی ہے، مگر ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔“

”میرا خیال ہے منگل داس مارکیٹ سے خرید کر لائے ہوں گے۔“ بالے سے نہ رہا گیا۔

”پھر بکواس۔“

”آپ دو ہزار بار اس منحوس بیماری کا نام دہرا چکے ہیں، مجھے اب اس کے ذکر سے ڈر لگنے لگا ہے۔“

”ابھی کیا ہے، آگے تمہاری روح بھی فنا ہو گی۔“

”بالے صاحب کی روح پمپ سے بھری ہوئی ہوا نہیں ہے۔“

”اچھا، مسٹر ڈیسوزا، آپ گاڑیوں کے بارے میں دیکھیے۔“ خان یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہائے چھوٹی انگلی۔“ بالے خان کے پیچھے چلتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

”بہت نخرے ہیں تو ذرا ڈھونڈ کر دکھاؤ۔“

”آپ میری غیرت کو للکار رہے ہیں۔“

”جی نہیں، ایک بے غیرت کو۔“

”بالے صاحب، تم پر ہزار بار لعنت ہے اگر تم نے اس لونڈیا کو نہ ڈھونڈ نکالا۔“ وہ اپنے آپ سے بولا، لیکن خان نے اس کے الفاظ پر توجہ نہ دی۔ وہ باہر نکل گیا۔

☆☆☆☆☆☆

اندھیری رات کے سناٹے میں ایک نیلے رنگ کی کار برق رفتاری سے مین روڈ سے گزرتی ہوئی ٹرنر روڈ پر گھوم گئی۔ یہ بستی اوسط درجے کے شہریوں کی تھی، جن میں زیادہ تر نوکری

پیشہ لوگ تھے۔ پولیس کمشنر کے حکم کے مطابق یہاں تمام ہوٹل اور تفریح گاہیں زیادہ سے زیادہ صرف ۱۲ بجے تک کھلی رہتیں، اس کے بعد ہر طرف سناٹا چھا جاتا۔ ایسے میں چور دروازے سے بیوپار کرنے والوں کی قسمت جاگ اٹھتی اور وہ اکا دکا مسافروں یا کارخانوں اور ملوں سے رات کی شفٹ کر کے لوٹنے والے مزدوروں سے کھانے پینے کی چیزوں کے بھی منہ مانگے دام لیتے۔ پولیس کے گشت کرتے رہنے کے باوجود بعض چھوٹے چھوٹے ہوٹل باہر سے بند اور اندر سے کھلے رہتے۔ مگر چند دنوں سے موسم سرما میں شدت آجانے کی وجہ سے فرحت پسندوں نے اپنے مکانوں سے باہر نکل کر رات گئے تک بیٹھے رہنا یا گھومنا پھرنا بند کر دیا تھا۔

ٹرنر روڈ کے ایک کنارے قطار سے باضابطہ فوجیوں کی طرح سیدھے کھڑے ہوئے بجلی کے سرکاری کھمبوں کے مدھم روشنی کے بلب تھوڑی تھوڑی دور تک اجالا پھیلائے ہوئے تھے، لیکن اس سناٹے کی یہ یتیم تاریکی اور سوئے ہوئے ماحول کا ویران تصور سنسناتی ہواؤں کے ساتھ آج معمول سے زیادہ وحشت انگیز تھا۔ نیلے رنگ کی کار آہستہ ہوتے ہوئے ایک طرف سڑک کے کنارے رک گئی۔ پہلے اس میں سے ایک آدمی اترا اور پھر ارد گرد کا جائزہ لینے کے بعد اس نے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا جس کے ساتھ ہی چار دوسرے سیاہ سائے گاڑی سے اتر آئے۔ یہ پراسرار لوگ تاریکی کے بھوت معلوم ہو رہے تھے۔ انھوں نے لمبے سیاہ لبادے پہن رکھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کالے دستانے اور چہروں پر باریک سیاہ جالی منڈھی ہوئی تھی۔ سروں پر سیاہ رنگ کے فیلٹ ہیٹ اور پیروں میں جوتے تک سیاہ تھے۔ وہ پانچوں تیزی سے چلتے ہوئے ایک گلی میں گھوم گئے۔ یہاں بالکل سناٹا تھا۔

''تم... وہ سامنے والی عمارت لے لو۔ اور تم... وہ ادھر کے وہ ٹین کے سائبانوں والے مکانات... اور تم...'' اس نے تیسرے کو اشارہ کیا۔ ''وہ بائیں طرف، شاید کوئی ہوٹل ہے... آں... ہاں خیر، تم ادھر۔ اور ایکس تھری تم ایک پنجرہ لے کر میرے ساتھ آؤ۔'' پہلے والے آدمی نے ان چاروں کو حکم دیا۔ جس کے ساتھ ہی وہ دوڑ کر گاڑی تک گئے اور اس کی پچھلی

نشست پر سے چار آہنی پنجرے اٹھا لائے۔ ان پنجروں میں موٹے موٹے چوہے بند تھے اور قیدی چوہوں میں سے بعض کی کیفیت نڈھال تھی۔ بعض اندر ہی اندر اچھل اچھل کر گر رہے تھے۔

"جلدی کرو، یہیں نہ مرنے لگ جائیں۔" وہ پہلا سیاہ پوش تحکمانہ لہجے میں بولا۔ اس کا حکم پاتے ہی وہ چاروں ایک ایک پنجرہ لے کر منتشر ہو گئے اور ان کا سربراہ اور وہ ساتھی ایک کے پیچھے چلنے لگے۔

وہ آدمی اس گلی کو عبور کر کے ایک دو منزلہ مکان کے سائے میں رک گیا۔

"ہاں، ٹھیک ہے۔" باس نما سیاہ پوش آہستہ سے بولا۔ "کھول دو پنجرہ۔" چناں چہ اس آدمی نے اشارہ پاتے ہی پنجرہ کھول دیا اور اس میں سے تین چوہے نکل کر بڑی تیزی سے بھاگے۔ وہ چیں چیں چیختے جاتے تھے، جیسے ان کی موت ان کا پیچھا کر رہی ہو۔ وہ چوہے دوڑتے ہوئے اس عمارت کے سونے برآمدے میں داخل ہو گئے تب وہ دونوں پلٹے۔ خالی چوہے دان ایکس تھری کے ہاتھ میں تھا۔ جب وہ واپس گاڑی کے پاس پہنچے تو باقی تین بھی اپنا کام کر کے آ چکے تھے۔ خالی پنجرے توڑ کر اسٹپنی میں بند کرتے ہوئے وہ سب اس کار میں بیٹھ گئے اور ان کی گاڑی اسٹارٹ ہو کر تیزی سے آگے کی طرف روانہ ہو گئی۔

☆☆☆☆☆☆

صبح کا اخبار میز پر پڑا ہوا تھا اور خان پشت پر دونوں ہاتھ باندھے عالمِ اضطراب میں اپنے ڈرائنگ روم کے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگا رہا تھا۔ وہ اس وقت کسی گہری فکر میں کھویا معلوم پڑتا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے آپ ہی آپ اس کی تیوری پر بل پڑ جاتے پھر سر کو جھٹک کر ڈہلنے لگتا۔ اخبار کی بڑی سرخی نے آج اس کے دماغ میں ہی نہیں سارے شہر میں کھلبلی مچا دی تھی۔ طاعون کے مرے ہوئے چوہے شہر کے کئی حصوں میں پائے

گئے تھے جو اس بات کی علامت تھے کہ اب یہ وبا پھیلنے والی ہے۔

"بالے صاحب تشریف لائے ہیں۔" سارجنٹ بالے خود اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"اخبار پڑھا آج کا تم نے؟" خان نے پیپر کی طرف اشارہ کر کے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"میں فضولیات سے سر پھوڑنے کا عادی نہیں ہوں۔"

"تمھیں بسنت کی بھی خبر ہے کچھ؟"

"موسم بہار کو کہتے ہیں۔ لونڈیاں اس موسم میں پاگل ہو کر اپنے عاشقوں کی مغفرت کی دعائیں کیا کرتی ہیں۔"

"میں کرا دوں تمہاری مغفرت۔" خان نے اکھڑے ہوئے موڈ میں اس کی طرف گھوم کر کہا۔

"آپ نے ضرور کوئی پریشان خواب دیکھا ہے آج۔ خدا تعبیر الٹی کرے۔" بالے نے اس کے گھونسے کی زد سے باہر ایک گدے دار کرسی میں دھنستے ہوئے کہا۔

"طاعون شہر میں پھیل رہا ہے۔" خان چھت کو گھورتے ہوئے بڑبڑایا۔

"کیا فرمایا آپ نے؟" بالے چونک پڑا۔

"کئی علاقوں میں طاعون کے مرے ہوئے چوہے پائے گئے ہیں۔"

"ہمارے شہر کی بلیاں سب اپاہج ہو گئی ہیں۔ آپ انھیں تڑی پار کر دیجیے۔"

"مستی سوجھی ہے تمھیں۔ یہ ہزاروں جانوں کا سوال ہے۔"

"جواب میرے پاس نہیں ہے۔"

"کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

"آپ طاعون صاحب کو سمجھائیے۔ نہیں مانتے تو شوٹ کر دیجیے۔"

"پھر بکواس۔" خان کا ٹمپریچر گرم ہو گیا۔

"تو پھر کیا کر سکتے ہیں ہم؟"

"رات کے گشتی کانسٹیبلوں نے شہر میں کچھ گاڑیوں کی مشتبہ نقل و حرکت دیکھی تھی، لیکن کم بختوں نے یا تو انھیں اہمیت ہی نہیں دی یا زیادہ سے زیادہ اپنے تھانوں میں رپورٹ دے دی۔

"تو کیا آپ کے خیال میں یہ مرض تقسیم کیا جا رہا ہے؟"

"ایسا نہ ہوتا تو ابتدائی رپورٹوں میں ان چوہوں کا فقدان نہ پایا جاتا۔"

"ڈیسوزا صاحب نے گاڑیوں کی رپورٹ تو دی ہوگی؟"

اُن لوگوں میں ایک بھی ایسا نہیں جس کا تعلق کسی طبی ادارے یا دوا ساز کارخانے سے ہو۔ اور ویسے بھی میں بتا چکا ہوں کہ طاعون کے انجیکشن صرف ہافکن انسٹیٹیوٹ میں تیار ہوتے ہیں۔"

"تو پھر یہ بھی محض ہمارا شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ بیماری پھیلائی جا رہی ہے، ہو سکتا ہے کہ خود ہی رفتہ رفتہ پھیل رہی ہو؟"

"اور ہافکن انسٹیٹیوٹ سے کیڑے کیا آچار ڈالنے کے لیے چرائے گئے ہیں؟"

"گاڑی پھر اٹک گئی۔ بات ترکی کی..." بالے پھر سوچ میں پڑ گیا۔

"آج کل تمہارے رومانس کا کیا حال ہے؟" خان اس سے قطعی غیر متعلق اور عجیب سا سوال کر بیٹھا۔

"قطعی بنجر ہو گئی ہے یہ سر زمین۔ اپنا تو خودکشی کر لینے کو جی چاہتا ہے۔ جو لونڈیا ملتی ہے، وہ کسی نہ کسی کا دم بھرتی ہوئی۔ اور جو ایک آدھ گلے بھی پڑی، وہ رومانس سے پہلے ہی طلاق نامہ لکھے رہتی ہے۔"

"بڑی ٹریجڈی ہے یہ تو۔" خان اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا۔

“ایسی ویسی۔ دیوداس بھی اس کے سامنے پانی بھرتا۔”

“لیکن اس اتنے بڑے شہر میں ایک جگہ ایسی بھی ہے جہاں تم جیسے احمقوں کو بھی جنت مل سکتی ہے۔”

“آپ تو ہو کر ہی آئے ہوں گے وہاں سے۔ ویسے اس کوہِ قاف کا نام کیا ہے؟”

“اریزونا۔”

“اریزونا؟ مگر وہاں کا بل تو بڑا لمبا ہوتا ہے۔ بارہ روپے کا ایک لنچ اور روپے کی دو کافی۔” بالے نے کہا۔ “اور بالے صاحب حلال کی کمائی کرتے ہیں۔”

“بل میں چکا دوں گا۔”

“ارے واہ، پروردگار آپ کو سیٹھ رام کشن ڈالمیا کا ڈیڈی بنائے۔ آج آپ حاتم طائی کی قبر پر لات مار رہے ہیں۔”

“مجھے آج بہت سے کام ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ تم میرا دماغ نہ چاٹو۔”

“استغفر اللہ۔ استغفر اللہ۔”

“سہ پہر کو دفتر میں مجھ سے مل لینا۔”

“آپ مجھے ٹالنا چاہتے ہیں اس وقت؟”

“قطعی نہیں، اس وقت تو میں چاہتا ہوں کہ تم سیدھے نیشنل اسپتال چلے جاؤ اور وہاں یہ نوٹ کرو کہ اس وبا کے کتنے مریض اور کس کس علاقے سے آئے ہیں۔”

“یہ کام تو ایک حوالدار بھی کر سکتا ہے؟”

“لیکن وہ کسی ایسی ہستی پر نظر نہیں رکھ سکتا جو کسی مقصد کے لیے وہاں آئی ہو۔”

“مانا کہ سارجنٹ بالے ایک عقل مند آدمی کا نام ہے، لیکن آپ کا یہ جملہ کافی گول مول ہے۔”

“ہمارے شبے کے مطابق اگر یہ وبا کوئی مخصوص گروپ یا کوئی پراسرار شخصیت پھیلا

رہی ہے تو اس کی طرف سے کوئی نہ کوئی اسپتال می طاعون کے مریضوں کی تعداد اور ان کی کیفیت جاننے کے لیے کسی طرح ضرور موجود ہوگا۔" خاں نے اسے بتایا۔

"اور اگر خاکسار کو بھی کچھ ہو گیا تو؟"

"تم اینٹی پلیگ انجیکشن لے چکے ہو۔"

"آپ اپنے وفادار سارجنٹ کو پھانسی چڑھا رہے ہیں۔" بالے نے شکل بنا کر کہا۔

"اچھا جاؤ، تم جھک مارو۔ میں اریزونا میں رؤف کو بھیج دوں گا۔"

"کیا فائدہ، بھائی کسی اصطبل کے داروغہ معلوم ہوں گے۔ ویسے میں آپ کی اس رشوت کو قبول کرنے کو تیار ہوں۔"

"بس اب دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

"ہائے، آپ میری آئندہ نسلوں کو پیدا ہونے سے پہلے یتیم کیے دے رہے ہیں۔"

"تم یوں نہ مانو گے، سور۔" خان اس کی طرف بڑھا۔

"بس مان گیا، آپ تکلیف نہ کیجیے۔" یہ کہتا ہوا وہ باہر نکل گیا اور خان کچھ سوچتا ہوا ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد سپرنٹنڈنٹ خان کی کار ہارکشن روڈ پر دوڑ رہی تھی۔ اس وقت وہ اکیلا تھا۔ کار کی رفتار سست تھی اور وہ سڑک پر دونوں طرف کچھ دیکھتا چل رہا تھا۔ جیسے سرسری نظر سے اطراف کا جائزہ لے رہا ہو۔ یہاں دیواروں پر اور میونسپلٹی کے اعلانیہ بورڈوں پر اسے وہ سرکاری پوسٹر نظر آئے جو محکمۂ صحت عامہ کی طرف سے لگائے گئے تھے اور جن میں شہر میں طاعون پھوٹ پڑنے کے خطرے کے پیش نظر عوام کو چند احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا مشورہ دینے کے ساتھ ساتھ انسداد طاعون کے انجیکشن لینے کی ہدایت کی گئی تھی۔

ہارکس روڈ کو عبور کر کے فیئر روڈ پر خان نے ایک جگہ اپنی گاڑی روک لی، جہاں محکمۂ صحت عامہ کی ایک میڈیکل وین کھڑی تھی اور انجیکشن لینے کے لیے لوگوں کا ہجوم اس پر

ٹوٹا پڑ رہا تھا، لیکن اس ہجوم میں ایک آدمی ایسا بھی تھا جو اطمینان سے ایک طرف کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک پستہ قد سانولا سا آدمی تھا، جس کے سر کے بیچ کے بال اڑے ہوئے تھے۔ وہ ایک پرانا سا گرم سوٹ پہنے ہوئے تھا، لیکن اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے سنہری لیبل والے موٹے قیمتی سگار نے خان کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ اس پر نظریں جمائے ہوئے خان گاڑی سے نیچے اتر آیا اور پھر لاپرواہی کے انداز میں ٹہلتا ہوا مجمع کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کی نظریں اب بھی اسی آدمی پر لگی تھیں جو اب تک پبلک کے ہجوم کو دیکھ رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ خان ہجوم میں مدغم ہو کر اس تک پہنچے، وہ آدمی آپ سے آپ چونک پڑا۔ اتنے میں پبلک کا کیو پھر ٹوٹ گیا اور وہ وین کے دروازے تک پہنچنے کے لیے ریل پیل کرنے لگے۔ اور وہ آدمی اس بھیڑ کی آڑ میں خان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس موقع پر خان نے چاہا کہ بھیڑ کو چیر کر دوسری طرف نکل جائے، لیکن وہ لوگ کچھ ایسے بے سدھ سے ہو رہے تھے کہ بجائے منتشر ہونے کے ان کا ہجوم اور بڑھ گیا۔ خان فوراً پیچھے ہٹ آیا اور ہجوم کے دائیں سمت گھوم کر جس وقت اس جگہ پہنچا، جہاں وہ آدمی کھڑا تھا تو وہ جگہ خالی تھی۔

خان کی عقابی نگاہیں اسے مجمع میں تلاش کرنے لگیں، مگر وہ نظر نہ آیا۔ اس پراسرار طریقے پر اس کے اوجھل ہونے نے خان کے شبے کو قوی کر دیا۔ وہ ہجوم کی طرف سے ہٹ کر بیچ سڑک پر آ گیا اور وہ چاروں طرف نظریں دوڑانے لگا۔ لیکن خدا جانے اس آدمی کو زمین کھا گئی تھی یا آسمان۔ وہ کوئی فریب نظر بھی تو نہیں تھا۔ ایک جیتا جاگتا انسان، جسے وہ خود اپنی آنکھوں سے صرف ایک منٹ قبل یہیں دیکھ چکا تھا۔ اچانک کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ یہ ایک ٹیکسی تھی جو تقریباً سو دو سو فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ خان تیزی سے اپنی کار کی طرف لپکا۔ مگر اتنی دیر میں وہ ٹیکسی روانہ ہو چکی تھی۔ خان کی ہلمین اس کے پیچھے دوڑنے لگی۔ پیچھے سے صاف نظر نہ آ سکتا تھا کہ ٹیکسی میں کتنے اور کس قسم کے آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور پھر وہ کافی تیز رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ خان نے پہلے تو اپنی گاڑی کو فاصلے سے رکھا،

لیکن بڑی چوڑی سڑک پر آجانے کے بعد ٹیکسی غالباً ۴۰۔۵۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑنے لگی۔ خان نے بھی گاڑی کی رفتار بڑھادی اور وہ اسے اوورٹیک کر کے آگے نکلنے کی کوشش کرنے لگا تاکہ گاڑی آگے لا کر اسے روک سکے۔

اسی جدوجہد میں دونوں گاڑیاں ہارکنس روڈ سے گزر کر باہر ٹینک کی طرف دوڑنے لگیں۔ یہ راستہ پارکنس روڈ کی نسبت سوا اور کشادہ تھا۔ بالآخر چند منٹ کی جدوجہد کے بعد خان نے اسے جالیا۔ مگر جیسے ہی قریب گاڑی آگے نکالتے ہوئے اس نے ٹیکسی میں نظر ڈالی، اس کا ماتھا ٹھنک اٹھا۔ جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا اگر وہ سچ تھا تو اس نے بڑی آسانی سے ایک نامعلوم آدمی کے ہاتھوں آج دھوکا کھالیا تھا۔ ٹیکسی میں ایک داڑھی والے ٹیکسی ڈرائیور اور پچھلی نشست پر بیٹھی ہوئی ایک بوڑھی عورت کے سوا کچھ نہ تھا۔ خان نے غور سے دونوں کو دیکھ کر کار آگے نکال لی۔ اس نے اس سے بازپرس تک نہ کی۔ بلکہ گاڑی کو کچھ دور لے جا کر پھر لوٹا لے آیا۔ اب وہ پھر برق رفتاری سے اسی طرف لوٹ رہا تھا جہاں اسے فیروڈ پر پبلک کا ہجوم تھا۔ کوشش بہر صورت بے سود ثابت ہوئی۔ محکمہ صحت کی وین موجود تھی، مجمع چھٹ چکا تھا۔ صرف چند آدمی رہ گئے تھے اور وہ بھی اسی علاقے کے غریب لوگ معلوم ہوتے تھے۔ وہ پراسرار شخصیت پھر اسے کہیں نظر نہیں آئی۔

☆☆☆☆☆☆

ایک جرنلسٹ

نیشنل اسپتال میں اس وبا کے شکار مریضوں کے لیے پانچ وارڈ مخصوص کیے جا چکے تھے۔ ان وارڈز میں جو مریض پہلے سے موجود تھے انھیں دوسرے اسپتالوں میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ نیشنل اسپتال شہری آبادی سے دور مضافات اور شہر کی شمالی حدود پر الگ تھلگ واقع تھا۔ خان اپنی بڑی گاڑی خود لے گیا تھا۔ اور چھوٹی فیاٹ کو کل سے چھینکیں آ رہی تھیں، اس لیے بالے کو ٹیکسی ہی کرنی پڑی۔ نیشنل اسپتال سے باہر ٹیکسی سے اتر کر اس نے جیب سے پیسے چکاتے ہوئے نوٹ بک میں بل سپرنٹنڈنٹ خان کے نام لکھ لیا اور اسپتال کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو کر لاپرواہی سے پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے داخلی دروازے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ باہر ایمبولینس گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں، جن سے مریض شاید ابھی کچھ دیر قبل ہی اتارے گئے تھے۔ داخلی برآمدے کے سرے پر ہی اسپتال کے ڈین کا آفس تھا، جس کے باہر بہت سے پریس رپورٹر بھیڑ لگائے ہوئے تھے۔ اسپتال میں ڈاکٹروں، نرسوں اور نرسنگ اور اردلیوں کی نقل و حرکت کے سوا کوئی گڑبڑ نہ تھی۔ مریض لائے جاتے تو انھیں خموشی کے ساتھ وارڈز میں پہنچا دیا جاتا۔ اسپتال کے تقریباً تمام ہی عملے نے اس وقت ہاتھوں پر سفید دستانے اور پیروں میں گھٹنے سے اوپر تک کلاتھ کور پہن رکھے تھے۔ ان کے چہرے سر اور گردنیں بھی ڈھکی ہوئی تھیں۔ سرسری نظر سے دیکھنے پر وہ سفید سفید کفن پوش بھوت معلوم ہوتے اور کوئی بھی ان جان آدمی اس مقام کو بجائے اسپتال کے کوئی بھوتوں کا گھر سمجھ کر خوف زدہ ہو سکتا تھا۔ سامنے سے گزرتی ہوئی ایک سرخ و سفید رنگ کی گول چہرے والی نوجوان نرس کو دیکھ کر بالے نے کچھ اس انداز سے سسکی بھری کہ وہ چونک کر اسے دیکھے بغیر نہ رہ سکی۔

”معاف کیجیے گا، میڈم۔ میں دنیا چھوڑ کر دین کی تلاش میں آیا ہوں، کہاں ملے

گا؟" اس نے سرتاپا بے وقوف بننے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے سوال کر ہی دیا۔

"وہاٹ ڈین؟" نرس نے مصنوعی بے زاری کے ساتھ ایک لمحے رک کر جواب دیا۔

"ڈین، یعنی کہ ڈین۔ اوہو... اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟ وہ... وہ، جیسے کہ کسی اسکول کا ہیڈ ماسٹر، کالج کا پرنسپل وغیرہ وغیرہ۔"

"اوہ، یومین ڈین...؟" وہ اسے سر سے پیر تک مضحکہ آمیز نظروں سے دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولی۔

"اوہ نو۔ آئی وانٹ اونلی ڈین۔ اینڈ نو 'یومین ڈین'۔" بالے نے اسے دلچسپ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ اب اس کے اندازِ کلام میں رومانیت کا بخار جھلکنے لگا تھا۔

"یوشٹ اپ۔" وہ شاید اس زبردستی کی گفتگو کا مقصد سمجھ گئی۔ بالے نے سر ہلا کر ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس بھری اور چھت کو گھورنے لگا۔ وہ پیر پٹکتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"دال نہیں گلی، باؤلے صاحب۔" کسی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ لانگ فیلو پیچھے سے آ پہنچا تھا۔

"اوہ، تو آپ ہیں کباب میں ہڈے۔" بالے برا سا منہ بنا کر اس کی طرف گھوما۔

"کوئی خاص بات نہیں کہی، میں تو میں ہو ہی۔" وہ قریب آ گیا۔ اس کا ڈی لکس کوڈک فلیش کمرہ ایک سیاہ بیلٹ کے ساتھ اس کے کندھے سے لٹک رہا تھا۔ ان دنوں انگریزی اخبار 'نیشنل اسٹینڈرڈ' کے مقامی اسٹاف میں وہ کرائم رپورٹر کی حیثیت سے ٹرانسفر ہو کر آیا تھا۔ بالے اس کی دلچسپ شخصیت سے پوری طرح 'پالا کے غار والے کیس' میں ہی واقف ہو چکا تھا اور تب سے ہی ان میں کافی بے تکلفی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے دوست بھی تھے اور ہم عمر بھی۔ لیکن بالے ہر ایسے موقع پر اس سے کتراتا تھا جہاں کسی لونڈیا کا معاملہ ہو، کیوں کہ لانگ فیلو اپنے چھ فٹ کے قد کی طوالت کے اعتبار سے ایسے موقعوں پر بقول بالے کافی پھوہڑ

ثابت ہوتا تھا۔ اس کی بے تکی مداخلت سے کئی بار بالے کو بعض نئی لڑکیوں سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔

”لونڈیا تو پٹاخہ تھی۔“ لانگ فیلو نے قریب پہنچ کر رازدارانہ لہجے میں اس سے کہا۔

وہ اس قسم کے اندازِ گفتگو کا عادی تھا۔ اور اس کی وجہِ تسمیہ شاید یہ تھی کہ جرنلسٹ کیوں کہ عوام پسند ہوتے ہیں اس لیے عوامی زبان ہی ان کی زبان ہونی چاہیے اور اس عوامی زبان میں وہ دنیا بھر کی مغلظات بھی شامل کر دیا کرتا تھا، جو سڑکوں اور گلیوں میں ایسے موقعوں پر سنی جاتی ہوں، جب کچھ ان پڑھ یا غیر مہذب قسم کے لوگ آپس میں لڑ پڑیں۔

”یہ کیا جانگڑوش پن ہے؟“ بالے نے پلٹ کر اسے گھورا۔

”یار تم آدمی ہو یا کریم الغات۔ روز روز نئے نئے الفاظ تراشا کرتے ہو۔“

”میں عبدالکریم ول الغات ہوں، فرمایئے، آپ کو کیا تکلیف ہے؟“

”میں طاعون کے کیسز کی رپورٹ لینے آیا ہوں۔ کیا خبر تھی کہ تمہاری شکل دیکھنے کو ملے گی۔“ لانگ فیلو اس کے ساتھ ساتھ ڈین کے آفس کی طرف چلتے ہوئے بولا۔

”کیوں، کیا میری شکل کچھ منحوس ثابت ہوئی ہے آپ کے لیے؟“ بالے نے جلے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”جس دن میں صبح صبح کسی پولیس والے کی شکل دیکھ لیتا ہوں سارا دن کڑکی میں گزرتا ہے۔“ لانگ فیلو نے جیب سے برکلے کی صرف ایک سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔

”اخاہ، تو یہ بات ہے۔ اونٹ کو پہاڑ نظر آجاتا ہوگا، شاید۔“

”شاید تمھیں سربلندی کے معنی نہیں معلوم۔“

”اچھا بیٹے سربلند، اور سناؤ کیا حال چال ہے۔“ بالے نے ڈین کے آفس کے باہر کھڑے ہو کر جرنلسٹوں کے قریب پہنچتے ہوئے گفتگو کا رخ بدل دیا۔

”ارے، وہی رفتار بے ڈھنگی۔ جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔“ لونگ فیلو لمبی سی ٹھنڈی

سانس کھینچ کر بولا۔ وہ دونوں باقی لوگوں سے علاحدہ برآمدے کی فینسنگ سے ٹک کر کھڑے ہو گئے۔

"بے ڈھنگیوں کی رفتار تو ہمیشہ بے ڈھنگی ہوا ہی کرتی ہے۔ ویسے آج کل کچھ عشق زدہ معلوم ہوتے ہو۔"

"عشق زدہ نہیں، غم زدہ کہو مجھ بدنصیب کو۔ کم بخت کہتی ہے پہلے اپنا قد چھوٹا کر کے آؤ۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔"

"مگر روبی تو تمہیں پسند کرتی ہے۔"

"پسند کرے گی، وہ سالی! مذاق اڑاتی ہے۔ کل کہہ رہی تھی ایک سیڑھی ساتھ لے کر آیا کرو، میں اس پر چڑھ کر تم سے پیار کروں گی۔ ہشت۔"

"تم بھی تو پورے بے غیرت ہو، جو پھر جوتے کھانے وہیں پہنچتے ہو۔"

"کیا کروں، یار۔ دل کا معاملہ ہے۔ اب تم سے کیا چھپا ہے، میں اس پر آج پورے ساڑھے تین برس سے عاشق ہوں۔"

"اور وہ تمہاری منگیتر؟" بالے نے مسکرا کر پوچھا۔

"وہ والد صاحب کے بوڑھاپے کا خبط ہے۔ نہ صورت نہ شکل، پوری چڑیل ہے سالی۔ بس خاندان اچھا ہے، بالے بھائی۔ بھلا خاندان کو چاٹنے کا زمانہ ہے یہ؟"

"ہرگز نہیں۔ تم کسی خوب صورت بھنگن سے شادی کر لو۔"

"میں سوا سو فیصدی سنجیدہ ہوں۔"

"بیٹے، یہ قومی خدمت ہے۔ چھوت چھات کے خلاف جہاد۔"

"اور سالے سب مر گئے کیا اس جہاد کے لیے؟ کیا میں ہی ایک الو کا پٹھا بچا ہوں؟" لانگ فیلو چڑ سا گیا۔

"یہ تم جانو، میں نے تو نیک مشورہ دیا ہے۔"

”رہنے دو اپنا نیک مشورہ۔ تم مجھے پھنسانا چاہتے ہو۔“ وہ یہ کہہ کر اکھڑنے لگا، لیکن بالے نے اس کا بازو تھام لیا۔

”وہ جو ٹنڈن کے پاس کھڑا ہے، کون سے پریس کا ہے؟“ بالے نے دروازے کے قریب کھڑے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

”ٹھیکا لیا ہے کیا میں نے، ہوگا کسی التو فلتو کا۔“ لانگ فیلو جھنجلا گیا۔

”ابے او شتر مرغ، میں کام کی بات پوچھ رہا ہوں۔“ بالے نے پیچھے سے اس کا کالر تھام لیا۔

”میں چیخ چیخ کر کہتا ہوں، یہاں ایک جاسوس کھڑا ہے۔“ وہ اسے دھمکی دینے لگا۔

”بارہ کے بھاؤ بیچ دوں گا۔“

”بہت دیکھے۔ میں بھی اخبار کا رپورٹر ہوں، کوئی ایرا غیرا نہیں جو تمہاری دھونس میں آجائے۔“

”پوچ...“ بالے نے اسے چمکارا۔ ”ناراض ہو گئے، نورِ نظر۔“ وہ اس کی ٹھوڑی پکڑ کر بولا۔ حالاں کہ اس کے لیے اسے اپنا ایک ہاتھ اونچا کرنا پڑا۔ لانگ فیلو سے گفتگو کے درمیان اس کی نگاہیں دروازے کے پاس موجود تمام پریس رپورٹرو کا جائزہ لیتی ہوئی اس پستہ قد اکہرے بدن کے سانولے سے آدمی پر جمی ہوئی تھیں، جو بڑی بے چینی سے دروازے کے نزدیک ان کے ہجوم میں کھڑا بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ بالے نے پیچھے ہٹ کر فینسنگ کے پاس لانگ فیلو کو اسی لیے باتوں میں لگا رکھا تھا کہ اس طرح اس جگہ کھڑے ہو کر جہاں روشنی کا انعکاس صاف نہیں پڑتا تھا، کسی کی توجہ اس کی طرف منعطف نہ ہو اور لانگ فیلو کے ساتھ اسے بھی دوسرے لوگ جرنلسٹ ہی سمجھے رہیں۔ حالاں کہ اگر وہ ان کے قریب پہنچ جاتا تو ان میں سے تقریباً سب ہی اسے پہچان لیتے۔ کیوں کہ تنویر اور لانگ فیلو کی وجہ سے صحافیوں کے حلقے میں بھی لوگ اس کے صورت آشنا ہو چکے تھے۔

وہ سب اس وقت ڈین کے باہر آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈین وارڈز کا معائنہ کرنے گیا ہوا تھا اور کیوں کہ وبا خطرناک اور اڑکر لگنے والی تھی۔ اس لیے صحافیوں کو اندر نہیں جانے دیا گیا تھا۔

"تم اس سے ذرا دوستی تو گانٹھو، مجھے اس کی شخصیت اجنبی معلوم ہوتی ہے۔" بالے نے لانگ فیلو سے آہستہ سے کہا۔

"چہ خوش۔ ورو تمہیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں۔" لانگ فیلو سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"بی فاختہ، انڈے تمہیں ہی ملیں گے، تم جاؤ تو، سور۔"

"نہیں جاتا، گالی کیوں دی؟"

"پیارے، اچھا چلو شالیمار میں ڈنر۔"

"وعدہ؟ مگر نہیں یار، تم سے ڈر لگتا ہے اور وہ سالی بھی بڑی ایڈوانس ہے۔" وہ کچھ سوچ کر خوش ہوتے ہوتے رہ گیا۔

"قسم لے لو جو اسے منہ بھی لگاؤں۔"

"تو پھر طے رہی۔" یہ کہہ کر لانگ فیلو وہاں سے کھسک کر رپورٹرز میں جا ملا اور بالے لاپرواہی کے انداز میں ٹہلتا ہوا برآمدے کے دوسرے تاریک سرے پر جا کھڑا ہوا۔ یہاں سے وہ روشنی میں کھڑے ان لوگوں کو بخوبی دیکھ سکتا تھا، لیکن خود اندھیرے میں محفوظ تھا۔ لانگ فیلو اپنا کیمرہ سنبھالتا ہوا دروازے کے قریب پہنچ گیا۔

"کیا معاملہ ہے؟ ڈین صاحب کہیں گول تو نہیں ہو گئے؟" اس نے ای پستہ قد آدمی سے پوچھا۔ اندازِ کلام ایسا تھا جیسے وہ اسے مدت سے جانتا ہوں۔

"اب تک آ تو جانا چاہیے تھا انھیں۔" وہ آدمی اس کی طرف دیکھے بغیر آہستہ لہجے میں بولا۔

"آپ شاید گلوب سے آئے ہوں گے؟" لانگ فیلو نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کشمش نکال کر منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"جی؟ جج... جی ہاں۔ گلوب سے۔"

"مسٹر فلفیٹ کا کیا حال ہے؟"

"فلفیٹ؟" اس آدمی نے چونک کر پوچھا۔

"ارے وہی، آپ کا جنرل منیجر۔"

"اوہ... جنرل منیجر... اچھی طرح سے ہیں۔ اچھے ہیں۔"

"کیا خاک اچھے ہیں۔ نہایت منحوس آدمی ہے یار وہ تو۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ گڈ مارننگ کہو تو پوچھتا ہے، مارننگ کا کیا گڈ ہے۔" لانگ فیلو اس سے بے تکلفی پیدا کرنے لگا۔ لیکن وہ کافی محتاط معلوم ہوتا تھا۔ وہ اس کی باتوں کا جواب دیتا جاتا، ساتھ ہی اس کی نگاہیں بار بار دروازے پر جا پڑتیں۔ اس کا اندازِ گفتگو چڑچڑا پن لیے ہوئے تھا، حالاں کہ الفاظ وہ کافی نرم استعمال کر رہا تھا۔

"مجھے لانگ فیلو کہتے ہیں۔ نیشنل اسٹینڈرڈ کا رپورٹر ہوں۔" لانگ فیلو نے خود ہی اس سے اپنا تعارف کرایا۔ "اور آپ کی تعریف؟"

"مچھی چاؤ چاما تا نیگ پو۔"

"کیا فرمایا آپ نے؟"

"میرا افریقی نام ہے۔" پستہ قد آدمی بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "ویسے آپ صرف نیگ پو کہہ سکتے ہیں۔"

"ضرور ہوگا۔ گلوب نیوز ایجنسی میں تو دنیا بھر کے لوگ کام کرتے ہیں۔" لانگ فیلو نے اپنا لہجہ اور اپنی شکل حد درجہ بیوقوفانہ بنائی۔

"کیا اب کسی اور کا دماغ نہیں چاٹ سکتے؟" پستہ قد آدمی جھنجلا کر بولا۔

"اوہ۔ آپ تو کاٹنے کو دوڑ رہے ہیں۔ اچھا، ٹاٹا۔" یہ کہہ کر لانگ فیلو وہاں سے ہٹ گیا۔ ٹھیک اسی وقت ڈین آ پہنچا۔ یہ ایک قد آور تن درست اور ہنس مکھ ڈاکٹر تھا۔ اس نے پریس رپورٹر سے بڑی خندہ پیشانی سے ملاقات کی اور ان کے سوالوں کے جواب میں بتایا کہ ابھی تک ۲۵ کیسز رجسٹرڈ کرائے گئے ہیں۔ چار موتیں سہ پہر کے بعد سے ہو چکی ہیں۔ پانچ کی حالت کچھ بہتر ہے۔ باقی کے لیے یقینی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

رپورٹر نے اپنی نوٹ بک میں تفصیلات لکھ لیں۔ لیکن وہ آدمی اس بھیڑ میں لانگ فیلو کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ایسے موقع پر لانگ فیلو کی طوالت کام آ گئی۔ اس نے اپنی اونچی گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ آدمی اس وقت اسپتال کے داخلی دروازے کی طرف جا رہا تھا اور بالے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔

"اے بھئی، وہ اپنا شالیمار کا ڈنر۔" لانگ فیلو نے پیچھے سے جا کر بالے کو پکڑ لیا۔

"اس کام سے فارغ ہو کر وہیں ملنا۔" بالے یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

وہ آدمی اسپتال کی عمارت سے باہر نکل کر سڑک پر آ گیا۔ بالے جس وقت باہر نکلا تو اس نے بس کے کیو میں کھڑے دیکھا۔ اور وہ خود بھی اس کیو میں اس سے دور چار پانچ آدمیوں کے بعد جا کھڑا ہوا۔ اب اس آدمی کے چہرے پر بے چینی کے آثار نہ تھے۔ وہ مطمئن اور لاپرواہ نظر آ رہا تھا۔ اس عرصے میں اس نے ایک بار بھی بالے کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ کیو میں اپنے قریب کھڑے ہوئے دوسرے آدمی سے گفتگو کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں بس آ گئی اور وہ اس میں سوار ہو گیا، لیکن بالے اس وقت تلملا کر رہ گیا جب بس کنڈکٹر نے کیو میں سے صرف پانچ آدمی لیے اور ان میں خود اس کا نمبر نہ آیا۔ مجبوراً اسے پھر ٹیکسی کا سہارا لینا پڑا۔ ٹیکسی اسے اتفاق سے ایک منٹ بعد ہی مل گئی۔ اور وہ بس یقیناً ابھی زیادہ دور نہیں گئی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے جلد ہی اس بس کو جا لیا۔ پھر وہ ٹیکسی کو اور آگے نکلوا لے گیا اور ایک اگلے بس اسٹاپ پر پہنچ کر وہ ٹیکسی سے اتر گیا۔ ابھی اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ دے کر رخصت ہی کیا تھا کہ بس آ پہنچی اور

اسے اس میں جگہ مل گئی۔ بس کا نمبر ۲۲۱ تھا اور یقیناً یہ وہی بس تھی۔ لیکن جب اس نے اندر داخل ہو کر اس ڈبل ڈیک بس کے دونوں حصوں میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کا جائزہ لیا تو وہ حیران رہ گیا۔ وہ آدمی ان میں موجود نہ تھا۔

کہیں وہ دوسری بس میں تو نہیں بیٹھ گیا۔ یہ سوچ کر اسے جب گھوم کر کنڈکٹر کی طرف دیکھا تو اسے اپنا یہ خیال بدلنا پڑا۔ کنڈکٹر وہی تھا جس نے اسے پچھلے اسٹاپ پر بس میں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔ پھر وہ کہاں گیا کم بخت۔ کنڈکٹر اس کے قریب سے گزرنے لگا۔

"اے مسٹر، کیا نیشنل اسپتال والے بس اسٹاپ اور اس اسٹاپ کے درمیان بھی کوئی بس اسٹاپ ہے؟" بالے نے اس سے کسی پردیسی اجنبی کی طرح پوچھا۔

"جی ہاں۔ ایک ایکوئسٹ اسٹاپ ہے۔"

"کیا گاڑی وہاں رکی تھی؟" بالے نے پھر پوچھا۔

"ہاں۔ شاید کوئی اترا تھا۔"

"لاحول ولاقوۃ۔" بالے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی پشت پر پاس بیٹھا ہوا آدمی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ شاید وہ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسپتال سے بھاگا ہوا کوئی خبطی مریض تو نہیں ہے۔

"کنڈکٹر سے ایک آنے کا ٹکٹ لے کر وہ نیچے اتر گیا۔ اس وقت اس کا موڈ بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ لیکن مصیبت تو یہ تھی کہ سوائے تعاقب کے اس آدمی کو روک بھی نہ سکتا تھا۔ ممکن ہے وہ کوئی پریس رپورٹر ہی رہا ہو تو الٹا اس کے گلے پڑ جاتا۔ لیکن وہ مشکوک آدمی ضرور تھا اور اسی وجہ سے بالے کو اس وقت اس کے نکل جانے کا شدید قلق ہو رہا تھا۔

وہ منہ ہی منہ میں اپنی اس صحافت کو کوستا ہوا فٹ پاتھ کے کنارے چلنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆

سرخ سایہ

راہ چلتے چلتے اچانک اسے ایریزونا کا خیال آ گیا۔ خان نے بے سبب اس کا ذکر نہ کیا ہوگا۔ ایریزونا... حسین لڑکیاں... رقص... موسیقی... اس کے ذہن سے کچھ دیر پہلے کا بوجھ ہٹنے لگا اور وہ خود کو تازہ دم محسوس کرنے لگا۔ لیکن آج ٹیکسیوں میں اس کے کافی روپے خرچ ہو گئے تھے اور اس وقت وہ اسی تذبذب میں مبتلا تھا کہ ٹیکسی کر لے یا کسی جان پہچان والے کی موٹر کا راستہ دیکھے۔ وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس نے لانگ فیلو سے ہوٹل میں ملنے کا وعدہ کیا ہے۔ اور لانگ فیلو سے اس قسم کے وعدے تو وہ اکثر کیا کرتا تھا جن میں بہت کم ہی ایفا ہوتے تھے۔ وہ ان ہی خیالات میں کھویا چلا جا رہا تھا کہ کسی کار کے بریک لگنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"شش شش..." پورٹیبل چھت والی زرد فورڈ کار کے اسٹیرنگ پر بیٹھے ہوئے موٹے سے آدمی کے ہونٹوں سے دبی آواز نکلی۔ بالے اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔ وہ اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے بالے کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کا نام شوکت تھا اور وہ تعمیرات کا ٹھیکیدار تھا۔ بالے سے اس کی دوستی ابھی دو تین مہینے قبل ہی ایک دعوت پر ہوئی تھی۔ وہ تینتیس چونتیس سال کا کافی تن درست مگر چھوٹے قد کا ہنس مکھ آدمی تھا۔ وہ خود بھی بے تکلف دوستوں کو زیادہ پسند کرتا تھا اور بالے کی شخصیت سے تو اسے جیسے عشق سا ہو گیا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ وہ خود بھی گوری پنڈلیوں اور سڈول جسم کے چکر میں بالے سے دو جاتے آگے تھا اور جب ان میں بے تکلفی ہو گئی تو وہ بہت جلد ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے۔ شوکت مخلص قسم کا زندہ دل آدمی تھا اور ایک بار اس کی تعریف سپرنٹنڈنٹ خان نے بھی کی تھی۔ مگر بقول خان ہر آدمی کا کوئی نہ کوئی اسکرو ڈھیلا ہوتا ہے۔ اس کے اعصاب پر بھی بالے کی طرح عورت سوار رہتی۔ وہ ہر وقت ہنستے رہنے کا

عادی تھا لیکن اگر کبھی اسے غصہ آ جاتا تو وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدل کر ایک دم سرخ ہو جایا کرتا تھا۔ نسل کے اعتبار سے وہ بھوپال کے ایک جاگیردار خاندان سے تھا۔ اس لیے تفریح اور تعیش پسندی اس کے بھی حصے میں آئی تھی۔ خدا جانے وہ بھی بالے کی طرح جنم جنم کا کنوارا تھا یا شادی شدہ۔ لیکن بالے کے اس نظریے کا وہ پورا پورا مقلد تھا کہ شادی کرنے کے بعد ایک آدمی اور ایک گدھے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ان کا یہ مشترک خیال تھا کہ جب قدرت نے روئے زمین پر رنگ برنگے پھولوں کی طرح رنگ برنگی لڑکیاں بھی پیدا کی ہیں تو کسی ایک کی جاگیر بن کر رہ جانا سراسر ناشکرا پن ہے۔ ایسے آدمی پر دنیا کی نعمتیں محدود کر دی جاتی ہیں۔ مگر بالے اس سے صرف فرصت کے اوقات میں ہی ملا کرتا تھا کیوں کہ وہ اس کا کافی وقت برباد کر دیتا تھا۔ رہا شوکت تو اسے سرِ شام سے ہی روز فرصت رہا کرتی تھی۔

"خدا نے منہ میں زبان نہیں کیا کیا؟" بالے فٹ پاتھ چھوڑ کر گاڑی کے قریب آ گیا۔

"اے لو، نیکی کر دریا میں ڈال۔ حاتم طائی نے سچ کہا تھا۔" شوکت نے برا سا منہ بنایا۔

"کون سی نیکی فرمائی ہے مردِ خدا تم نے؟"

"تم پیدل گھسیٹ رہے تھے، میں نے رحم کھا کر گاڑی روک دی۔ یہ اور کیا ہے؟"

"تو تم رحم بھی کھا جاتے ہو۔" بالے پاس والی نشست پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"لاحول پڑھو۔ کیا گندی زبان ہے تمہاری۔" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

"کدھر کا رخ ہے؟"

"میاں، اپنا کیا، بس یہ گئے ادھر جدھر ہوا لے چلی چلے۔" وہ ونڈ اسکرین سے آگے جھانکتے ہوئے گاڑی بڑھا کر بولا۔

"ایسے لوگوں پر لعنت بھیجنے کو جی چاہتا ہے جو شعر کہنا نہیں جانتے پھر بھی کہہ ڈالتے

ہیں۔" بالے نے برا سا منہ بنایا۔ وہ خان سے اس قسم کے جملے بارہا اپنی شان میں سن چکا تھا اور آج اس کی کسر شوکت سے اس نے نکال لی۔

"لعنت خود تم پر۔ تم کیا جانو شعروعر کی قدر۔ میرے ابا حضور مرحوم تو میر داغ کے شاگرد تھے۔"

"زاغ کے رہے ہوں گے۔ داغ تو بے چارے کب کے گزر چکے۔"

"اچھا گولی مارو شعر شاعری کو۔ بولو کدھر چلا جائے۔"

"اریزونا۔"

"ہوشت۔ وہ بھی کوئی جگہ ہے سالی۔ نہ جانے کدھر کدھر کے بھرے رہتے ہیں۔"

"میری بلا سے۔ ورنہ ایسی ایسی لونڈیاں ہیں وہاں تو..."

"میری قسم؟" شوکت نے اپنی پلکیں جھپکا کر پوچھا۔

"تمہارے باپ دادا تک کی قسم۔"

"تو پھر چلو نہ آج وہیں ہو جائے۔" اگلے چوراہے سے شوکت نے گاڑی کا رخ اریزونا کی طرف کر دیا۔

"کیا ہو جائے؟"

"ارے کچھ عشق وشق... یار اپنا دل تو سالا کئی ہفتوں سے اجاڑ پڑا ہے۔ ملتی بھی ہیں تو سالی اینگلو انڈین۔ ذرا پیار کی بات کی اور... 'ڈارلنگ ہمارا اپوائنٹمنٹ ہائے'۔" وہ بیٹھے بیٹھے مٹکتے ہوئے بولا۔ "'ادھر ہمارا ایک فرینڈ ڈیٹ مارتا ہائے'۔ اور اپن جیسے جھک مار رہے ہوں ادھر۔" شوکت نے یہ کہہ کر برا سا منہ بنا لیا۔

"تم چلو تو، اللہ رازق ہے۔"

"میں رزق کی نہیں لونڈیا کی بات کر رہا ہوں۔"

"ایک ہی بات ہے۔"

"ارے واہ.. خان کی ٹھوک چلے۔"

لیکن ان کی گاڑی جب ایریسونا کے ابھر رکی تو بالے یہ دیکھ کر چونک پڑا کہ باہر کھڑی ہوئی گاڑیوں کی قار میں خان کی گاڑی بھی موجود تھی۔

"غضب ہوگیا۔" بالے اسے دیکھتے ہی بولا۔

"کیوں، جمن کیڑے نے کاٹ کھایا کیا؟" شوکت نے اپنی سو فیصدی بھوپالی زبان میں پوچھا۔

"تمہارا باپ۔ مگر یار تم یہ گھٹیا قسم کے الفاظ نہ بولا کرو میرے سامنے۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ یہ تو اپنی زبان ہے، میاں خاں۔"

"چو لہے میں گئے میاں خاں۔ یہاں تو سارا مزا کرکرا ہوگیا۔"

"آخر کچھ بکوگے بھی۔"

"خان صاحب ضرور اندر موجود ہیں۔ وہ گاڑی دیکھو۔"

"تو کیا ہوا، پھانسی تھوڑی چڑھا دیں گے۔" وہ گاڑی پارک کرتے ہوئے بولا۔

"تم کیا جانو اس صوفی منش کو۔ نہ کھائیں نہ کھانے دیں۔"

"واہ میاں، کوئی زبردستی ہے۔ اپن تو ڈٹ کے کھائیں گے۔ جان بھری تو کھیتی ہری۔"

"تم یار آدمی کام کے ہو، مگر عقل موٹی ہے۔"

"موٹی وٹی تمہاری، ہونہہ۔ خامخا.."

یہ کہتے ہوئے اس نے کار کی چابی جیب میں ڈال لی اور بالے سے پہلے ایریزونا کے دروازے میں داخل ہوگیا۔ باوجود تلاش کے بالے کو اندر ریسٹورینٹ میں خان کہیں نظر نہیں آیا۔ لیکن اس کی گاڑی باہر موجود تھی اس لیے ضرور آج کچھ نہ کچھ گڑبڑ تھی یا ہونے والی تھی۔ شوکت اور وہ ایک ٹیبل کے گرد بیٹھ گئے۔ شوکت کی للچائی ہوئی نظریں اس ہال کی ہر میز

پر کچھ تلاش کر رہی تھیں اور یہ 'کچھ' وہی چیز تھی جس کا بالے نے ذکر کیا۔ یہ دیکھ کر اس کے چہرے پر ڈبل تازگی آ گئی کہ یہاں 'بہت کچھ' موجود تھا۔ گوری گوری ننگی پنڈلیوں والی کرسچین لڑکیاں اور سڈول اور خوب صورت بدن والی جوان خوب صورت عورتیں جن کی اس ہوٹل میں موجودگی ان کی خاص ترقی پسندی بلکہ مغرب پسندی کی دلیل تھی۔ وہ یا تو کنوارہ ہی رہی ہوں گی یا پھر شادی شدہ ہونے کے باوجود کنواری نظر آنے کی کوشش کرتی رہی ہوں گی۔ شوکت نے چاروں طرف نظر ڈال کر ایک جذبات سے بھری سسکی لیتے ہوئے چھچھوندر کے منہ کی طرح چونچ نکال کر ہولے سے سیٹی بجائی اور پھر بالے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”کیوں خان، کیا مراقبے میں چلے گئے؟“ اس نے اسے ٹوک دیا۔

”جی نہیں، اپنے ہی رقبے میں ہوں۔ فرمایئے؟“

”کیا سوچ رہے ہو؟“

”سوچ رہا ہوں، بھائی اگر یہاں کہیں موجود ہوئے تو اپنی آزادی تو خطرے میں رہے گی۔“

”ارے گولی مارو یار آزادی وازادی پہ۔ شکر کرو پیدا کرنے والے کا کیا کیا مال پیدا کیا ہے روئے زمین پر۔“

”کیا کوئی جچ گئی نظر میں۔“

”حیران ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں۔ کسے دیکھوں کسے نہ دیکھوں۔“ شوکت شاعرانہ موڈ پیدا کرتے ہوئے بولا۔

”پھر وہی بکواس۔“

”یار تم آدمی ہو یا خرسطو۔ اے لو، یہ ہوئی کچھ بات۔“ کہتے کہتے شوکت کی نظریں ہال کے اندرونی حصے کے ایک ادھ کھلے دروازے کے اس پار گزر گئیں۔

”کیا معاملہ ہے؟“

"قسم اللہ پاک کی، حور نہیں تو حور کی بچی ضرور ہے۔" شوکت نے آنکھوں سے اس طرف اشارہ کیا۔

اور بالے غور سے اس سرخ سائے والی گوری چٹی لڑکی کو دیکھنے لگا جو ہال کے دوسرے حصے میں جس پر فار فیملیز لکھا ہوا تھا، بیٹھی تھی۔ اس کا دروازہ شاید بیرے کی غلطی سے کھلا رہ گیا تھا۔ اس لیے وہ بالے کی ٹیبل سے صاف نظر آرہا تھا۔

"جیسے قندھاری انار۔" شوکت پھر بڑبڑایا۔ "کیا زوردار لونڈیا ہے۔"

"صاحب، کچھ منگتا ہے؟" بیرے نے میز کے قریب آ کر اسے ٹوکا۔

بالے نے گھوم کر دیکھا، وہ ایک موٹا تازہ اور کسی قدر خوفناک سی شکل کا بڑی بڑی مونچھوں والا بیرا تھا۔

"مرغی لاؤ.. اور.. اوران کے لیے..؟" شوکت بالے کی طرف دیکھنے لگا۔

"صرف مینگو لا۔"

"ارے تو کھاؤ گے نہیں کچھ؟"

"میں تمہاری طرح پیٹو نہیں ہوں۔ جب دیکھو، جب بھوکے۔"

"جاؤ، میں بھی نہیں کھاتا۔ اے بیرا، دو مینگو لاؤ۔"

"مینگو نہیں، مینگو لا۔" بالے نے تصحیح کی۔

"ارے جاؤ، کچھ بھی لاؤ۔ میرا سر لاؤ۔ صورت کیا دیکھ رہے ہو کھڑے ہوئے۔" جھنجلاہٹ میں شوکت بیرے پر ہی بگڑ گیا۔ اور بیرا اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔

اتنے میں اس لڑکی نے ایک بار پلٹ کر دروازے سے ہال کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہیں شوکت سے ٹکرا گئیں۔

"ہائے..." شوکت سینے پر ہاتھ رکھ کر کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔

"کیوں، خیر تو ہے؟"

"سالی نے وہیں سے تیرِ نظر کھینچ مارا۔"

"کفن دفن کا انتظام کراؤں کیا؟"

"لاحول بھیجو۔ اب تو جیئیں گے بس اسی بتِ طلسم ہوش ربا کے لیے۔"

"بتِ طلسم ہوش ربا؟"

"کسی مشہور شاعر کا شعر ہے۔ برا نہیں ہے۔"

لیکن بظاہر تمام تر توجہ سے شوکت سے گفتگو کرتے ہوئے بھی بالے کا دماغ اب تک سوچ رہا تھا۔ خان نے اسے یہاں کیوں بھیجا۔ اگر پیچھا ہی چھڑانا تھا تو کسی اور ہوٹل کا نام کیوں نہ لیا۔ ساتھ ہی اس کی نظریں کاؤنٹر پر موجود موٹی قلموں اور پھولے گال والے اس سانولے رنگ کے بھدے سے بارٹنڈر کی حرکتوں کا بھی جائزہ لے رہی تھیں جو بار بار کسی قدر چونک کر اس فیملیو سرکل کی طرف دیکھنے لگتا۔ ایک تن درست سا خوش رو آدمی سرمئی گرم سوٹ پہنے کاؤنٹر کے دوسرے سرے پر ٹیلی فون پر جھکا ہوا تھا۔ وہ کسی سے گفتگو کرنے میں اس طرح منہمک تھا کہ جیسے اسے دنیا و ما فیہا کی خبر تک نہ ہو۔ اس تقریباً سو فٹ وسیع اور اتنے ہی عریض ہال کی چاند جیسے چھت گیر روشن ہنڈوں کے پھیلی مگر ٹھنڈی روشنی کے نیچے تقریباً تمام نشستیں مردوں اور عورتوں سے پر تھیں۔ عورتیں جن میں جوان اور خوب صورت بدصورت لڑکیاں بھی تھیں اور مرد جن میں بوڑھے بھی تھے اور جوان بھی۔ لیکن یہاں کی سوسائٹی مغرب زدہ ہوتے ہوئے بھی شریفانہ تھی۔ ہال میں موجود تمام تر لوگ تعلیم یافتہ یا کم از کم تہذیب یافتہ ضرور معلوم ہوتے تھے۔ ان کی بات چیت، ان کے اٹھنے بیٹھنے کے طریقے اور ہال میں کم سے کم شور، یہ سب باتیں اس مقام کی سوسائٹی کی آئینہ دار تھیں۔ لیکن کسی بیرے نے فیملی سرکل کا وہ کھلا دروازہ بند کر دیا اور شوکت کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔

"دھت تری کی... سالا لکھی بیر کر گیا۔" وہ یہ کہہ کر اب دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔

لیکن اسی وقت ایک دہرے بدن کی گوری سی جون عورت ہال میں داخل ہو کر ادھر ادھر نشست

تلاش کرتی ہوئی ان کی ہی میز پر آ بیٹھی۔

"معاف کیجیے گا، بیٹھ سکتی ہوں یہاں؟" اس نے بڑے پر تکلف لہجے میں اجازت طلب کی۔

"ج... جی ہاں... ضرور... کیوں نہیں..." شوکت نے ایک نظر بالے کو دیکھ کر کرسی پیش کر دی۔

"کیا آپ مسٹر ولسن کو جانتے ہیں؟" وہ شوکت سے پوچھنے لگی۔

"مسٹر ولسن؟" شوکت نے دہرایا۔ پھر وہ بالے کی طرف گھوم پڑا۔ "تم جانتے ہو کیا؟"

"میں نے اس ناک کا آدمی پیدا ہوتے نہیں دیکھا ہے۔" بالے نے ان کی طرف دیکھے بغیر ٹیڑھا سا جواب دیا۔

"کیوں، بیٹا، جل رہے ہو کیا؟" شوکت نے اس کی طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔

"بس آپ ہی کو مبارک ہو، یہ بارہ بجکی کی بھینس۔"

"کیا کہا؟" شوکت چڑ گیا۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔؟" موٹی عورت نے شوکت کو ٹوکا۔

"اور لو، بیٹھتے ہی حق بھی جتانے لگی۔" بالے نے یہ کہتے ہوئے رخ پھیر لیا۔

"میڈم، میں سراغ لگا رہا ہوں آپ کے مسٹر ولسن کا۔"

"وہاٹ؟ وہاٹ ڈو یو مین بائی آپ کے مسٹر ولسن؟" وہ ایک دم بگڑ گئی۔

"معاف کیجیے گا، میں سمجھا تھا..."

"آپ خاک سمجھے تھے۔ وہ سور کا پلا میرا کون ہو سکتا ہے۔ جھڑوس کہیں کا۔"

"جی ہاں، ضرور ہوگا۔"

"کیا ہوگا؟"

"جھڑوس۔"

"اوہ، کتنے سمجھ دار ہیں آپ۔" موٹی عورت نے شرماتے ہوئے کہا۔ "مجھے میری انٹونیا کہتے ہیں۔ آپ کا نام؟" اس نے شوکت سے سوال کیا۔

"انھیں میرفتولی کہتے ہیں۔" بالے بیچ میں بول پڑا۔

"میں آپ سے نہیں پوچھ رہی۔" وہ اسے دیکھتے ہوئے برا سامنہ بنا کر بولی۔

"اور بولو۔" شوکت نے بھی طنز بھرے لہجے میں کہا۔ اس کے اندازِ کلام میں ایک چیلنج تھا۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو، دیکھا، عورتیں کتنی جلدی مجھ پر مرمٹتی ہیں اور ایک تم ہو، الو کے پٹھے۔

"میڈم..." شوکت موٹی عورت کی طرف مخاطب ہوا۔

"اونہونہہ... صرف مس انٹونیا۔" وہ زیادہ بے تکلف ہو کر بولی اور شوکت ایک بار سنجیدگی سے اس کے پھولے ہوئے مگر سرخ وسفید چہرے کے نقش ونگار کا جائزہ لینے لگا۔ وہ خوب صورت تو ضرور تھی۔ اور پھر صحت مند بھی۔

"مس انٹونیا، مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ مجھے شوکت کہتے ہیں۔"

"ساکٹ۔" انٹونیا نے دہرایا۔ "وہاٹ اے لولی نیم۔" وہ ہلکی سی سسکی بھر کر بولی۔ اور شوکت نے اپنا سینہ ضرورت سے زیادہ پھلا کر بالے کی طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ اس کی نالائقی کو پھر چیلنج کر رہا ہو۔ لیکن وہ چونک پڑا۔ بالے کی نشست خالی تھی۔ چاروں طرف گھوم کر دیکھنے پر وہ اسے ہال میں بھی نظر نہ آیا۔ شوکت دیکھ ہی چکا تھا کہ خان کی کارباہر دیکھنے کے بعد اس پر ایک قسم کی سنجیدگی کا دورہ پڑ چکا تھا۔ ورنہ وہ اتنی دیر خاموش بیٹھنے والا نہ تھا۔ پھر وہ یہ سوچ کر کہ جہاں ہوگا خود ہی لوٹ آئے گا۔ اس فربہ خاتون سے باتیں کرنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆

بالے چند منٹ بعد ہی لوٹ آیا۔ لیکن اس بار شوکت یہ دیکھ کر چونک گیا کہ اس کے

ساتھ ایک جوان سی خوبصورت لڑکی بھی تھی، جس نے سفید ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ سیدھا شوکت کی میز کے قریب آگیا۔

"چلو، شاکت۔ فیملی سرکل میں بیٹھیں گے۔ یہاں کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔" وہ بولا۔

"مگر میں تو اکنڈا ہوں۔" شوکت نے پھر اپنی زبان استعمال کی۔ "وہاں تو ودھ فیملی ہی جاسکتے ہیں لوگ۔"

"میں چلتی ہوں آپ کے ساتھ۔ ولسن سو نہیں آئے گا۔" مس انٹونیا بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"لو، بیٹے، بھگتو اب۔ گلے پڑ گئی تمارے۔" بالے نے آہستہ سے شوکت سے کہا۔

"گندم اگر ہم نہ رسد بھس غنیمت است۔" شوکت نے فارسی میں جواب دیا۔ جسے مس انٹونیا سمجھ نہ سکی، وہ اسے کوئی اچھا سا جملہ سمجھ کر خود مسکرا دی۔

فیملی سرکل میں داخل ہو کر انھوں نے دیکھا، یہ ایک تقریباً ساٹھ ستر فٹ لمبا اور ۴۰۔۵۰ فٹ چوڑا ہال تھا۔ اس میں علاحدہ علاحدہ میزیں رکھی تھیں جن میں سے ہر چیز صرف ایک فیملی کے لیے تھی، خواہ اس کے ممبر دو ہوں یا پانچ چھ۔ دو میزیں اس وقت بھی خالی تھیں، جن میں سے ایک پر وہ لوگ بیٹھ گئے۔ یہ میز اس میز کی پشت پر تھی، جس پر وہی سرخ سائے والی خوب صورت لڑکی ایک آدمی کے ساتھ... مگر اس کی شکل دیکھتے ہی بالے کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ سپرنٹنڈنٹ خان کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ خان کو اس طرح اکیلے میں ایک جوان اور خوب صورت لڑکی کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ اور خوب صورت بھی ایسی ویسی نہیں، شاید سینکڑوں میں ایک۔ خان اس کی طرف دیکھے بغیر اس لڑکی سے انگریزی میں گفتگو کرتے ہوئے صرف مسکرا دیا۔ اس وقت بالے کو اس کی یہ مسکراہٹ بھی زہر میں بجھی معلوم ہوئی۔ وہ کرسی پر پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔ حالاں کہ وہ اس سرخ سائے پر فوراً عاشق

ہو جانے کا پروگرام بنا کر آیا تھا۔

"شوقت بھائی۔" اس نے بیٹھتے ہوئے گلے سے شوکت کو مخاطب کیا۔

"لاحول بھیجو، یار۔ اب کیا تکلیف ہے؟"

"بڈھی گھوڑی لال لگام۔" بالے نے چھت کی طرف گھورتے ہوئے ذرا اونچی آواز میں کہا۔ مگر شوکت نے جب گھوم کر خان کو دیکھا تو اس کی سٹی گم ہو گئی۔ اور ان دونوں کی یہ کیفیت دیکھ کر مس انٹونیا بھی ادھر دیکھے بغیر نہ رہ سکی۔

"کیا یہ آپ کا کوئی بڑا بوڑھا ہے؟" اس نے شوکت سے رازدارانہ لہجے میں سوال کیا۔

"صرف بڑا ہی بڑا ہے، بوڑھا نہیں ہے۔" شوکت نے کہا۔ "بڑا اجلا آدمی ہے۔"

"تو کیا کرے گا آپ کا؟"

"مس انٹونیا، میں آپ کا بنگلا بہت جلد تعمیر کرا دوں گا۔ ایک ہفتے میں کرا دوں گا۔"

شوکت خان کو سنانے کے لیے اونچی آواز میں اس سے کہنے لگا۔

"بنگلا! کیسا بنگلا؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" موٹی عورت چونک کر بولی۔ جس پر شوکت نے آنکھوں ہی آنکھوں میں خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے سمجھانا چاہا۔ خان اب بھی مسکرا رہا تھا۔ اور وہ لڑکی ہنس ہنس کر اس سے کسی پروگرام کے بارے میں گفتگو کر رہی تھی۔

"شوکت بھائی، جو کسی کے حق پر ڈاکا مارے اسے کیا کہتے ہیں؟" بالے نے دوسری میز پر سنائی دینے والی آواز میں شوکت سے پوچھا۔ بالے کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی خاموشی سے مسکرا رہی تھی۔

"ڈاکو، اور کیا۔" شوکت نے اس کا مطلب سمجھے بغیر جواب دیا۔

"اور جو ساٹھ سال کی عمر میں بھی ایک جوان لونڈیا سے رومانس کرے اسے کیا کہنا

چاہیے؟" بالے نے کنکھیوں سے خان کی طرف دیکھ کر شوکت سے سوال کیا۔ وہ لڑکی اب بھی پوری طرح خان کی طرف ہی متوجہ تھی۔

"الو کا پٹ... اررر... اللہ توبہ... یار میں تمہاری باتوں میں آنے والا نہیں، مجھے جوتے کھلواؤ گے کیا؟" عالمِ بے خیالی میں الٹا جواب دیتے ہوئے شوکت کو عقل آ گئی۔ "ایسے آدمی کو دنیا کا عقل مند ترین آدمی، بلکہ چنگیز خان کہیں گے۔"

"کیا کہا تم نے... چنگیز خان؟"

"اور نہیں تو کیا۔ چنگیز تو مرتے دم تک رومان لڑاتا تھا۔" بیوقوفوں کی طرح شوکت بحث پر اتر آیا۔ وہ پھر یہ بھول گیا کہ بالے خان کو سنانے کے لیے یہ سب کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ تو وہ خان کی بے تعلقی سے ہی سمجھ گئے تھے کہ وہ اس وقت ان لوگوں کو اپنا یا خود کو ان کا واقف کار ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن بالے کو تو اس سرخ سائے کا غم ستا رہا تھا۔ کتنی حسین عورت اور کس کے پلے۔ وہ کسی طرح یہ جاننے کی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ آخر یہ لڑکی ہے کون اور خان سے اس کا کیا واسطہ۔"

آخر یہ مسئلہ بھی کچھ دیر بعد آپ سے آپ حل ہو گیا، جب اس نے دروازے سے داخل ہوتے ہوئے ڈاکٹر بٹلر کو دیکھا۔ ڈاکٹر بٹلر کی شخصیت ان کے لیے نئی نہیں تھی۔ وہ چھوت کی بیماریوں کے اسپتال کے انچارج تھے اور اکثر اموات کی تحقیق کے سلسلے میں پولیس کا بھی ان سے کئی بار پالا پڑ چکا تھا۔ بہرحال خود بالے کی شخصیت ڈاکٹر کے لیے اجنبی تھی۔ وہ انھیں پہچانتے ہوئے بھی خود ان سے کبھی نہ ملا تھا۔

"معاف کیجیے گا، مجھے زیادہ دیر تو نہیں ہوئی؟" ڈاکٹر نے خان کی میز کے قریب پہنچ کر کہا۔

"جی نہیں، ہم صرف آدھ گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہے تھے۔"

"اوہ، تب تو بہت تکلیف ہوئی ہوگی آپ کو۔"

"جی نہیں۔ میں ڈوری سے باتیں کر رہا تھا۔" خان نے لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ہاں۔ یہ مجھ سے پہلے ہی یہاں پہنچ جایا کرتی ہے۔" ڈاکٹر مسکراتا ہوا یہ کہہ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ڈیڈی، خان صاحب بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔" وہ لڑکی ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر ہنستے ہوئے بولی۔

"کیوں نہ ہوں گے بھلا، دل جو چپکاتے پھرتے ہیں۔" بالے زیرِ لب بڑبڑایا۔ لیکن ڈاکٹر کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی۔ نہ ہی اس نے دوسری میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف کوئی دھیان دیا۔

"میں آپ سے شہر میں پھیلتی ہوئی طاعون کی وبا کے سلسلے میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا تھا۔"

"اوہ، ٹھیک ہے۔ آج ڈائرکٹر آف پبلک ہیلتھ نے بھی فون پر مجھ سے اسی سلسلے میں مشورہ مانگا تھا۔ میں نے انھیں یہی بتایا کہ طاعون کی مکھی جو جب چوہے نہیں ملتے تب ہی وہ انسانوں پر حملہ کرتی ہے۔ اس لیے طاعون زدہ علاقوں میں دوسرے علاقوں سے چوہے پکڑوا کر پہنچائے جانے چاہئیں۔" ڈاکٹر نے بتایا۔

"میں طریقِ علاج کے بارے میں نہیں، بلکہ اس بیماری کے اسباب پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں؟" خان بولا۔

"اچھا تو فرمایئے۔"

"کیا یہ وبا آپ سے آپ پھیلتی ہے؟"

"یقیناً۔"

"اور کیا یہ ممکن نہیں کہ اسے کوئی پھیلائے؟"

“میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟”

“مثلاً فرض کیجیے میں چاہتا ہوں کہ آپ کی موت طاعون سے ہو اور میں آپ کو اس کے کیڑوں کا انجکشن دے دوں تب؟”

“میں مر سکتا ہوں۔ ”ڈاکٹر مسکرایا۔ “لیکن اس طرح وبا نہ پھیل سکے گی۔ ”

“اور اگر میں چاہوں کہ یہ پھیلے؟”

“تو اس کے لیے آپ کو انسانوں کی بجائے چوہوں کو پلیگ کے زندہ کیڑوں کے انجکشن دینے پڑیں گے۔ اس طرح مرنے والے چوہوں سے پلیگ کی مکھیاں جراثیم لے کر منتشر کرتی پھریں گی اور وبا پھیل جائے گی۔ ”

“ڈیڈی، آپ لوگ کتنی بھیانک باتیں کر رہے ہیں۔ ”لڑکی بول اٹھی۔ وہ اس گفتگو سے اکتاہٹ محسوس کر رہی تھی۔

“ہم لوگوں کو ان سے زیادہ بھیانک واقعات سے پالا پڑتا ہے، بیٹی۔ ہمارے دل پتھر کے ہو جاتے ہیں۔ ”ڈاکٹر نے اسے سمجھایا۔

“کیا یہ فارمولا کوئی اور بھی جانتا ہے یہاں؟”

“میڈیکل سائنس کا ہر ماہر جانتا ہوگا۔ ”

“خیر، ان قیمتی مشوروں کا شکریہ۔ ”خان یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

“ارے تو کیا جا رہے ہیں آپ؟”

“مجھے کچھ ضروری کام ہیں۔ ضرورت پڑی تو پھر کبھی تکلیف دوں گا۔ ”خان نے یہ کہہ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ سرخ سائے والی لڑکی نے بھی مسکرا کر رخصتی کا سلام کیا اور وہ کچھ اس انداز سے اس میز سے ہٹ کر کتراتا ہوا نکلا کہ بالے کے داہنے بازو سے ٹکرا گیا اور پھر بغیر اس کی طرف دیکھے، بغیر معذرت کیے آگے بڑھ گیا۔ بالے اس بے تعلقی کا مطلب سمجھ کر زیرِ لب مسکرایا اور پھر بڑبڑانے لگا۔

"اندھے بن کر چلتے ہیں لوگ، جیسے خدا نے دو کی جگہ ایک بھی نہ دی ہو۔"

"ارے، نگرو ہتو خان..." شوکت نے کہنا چاہا۔

"شٹ اپ۔ تم مجھے اخلاقیات کا سبق مت دو۔ مجھے اس آدمی پر غصہ آ رہا ہے۔ میں تمہیں چبا ڈالوں گا۔"

"اے لو، طویلے کی بلا بندر کے سر۔" شوکت نے حونق جیسی شکل بنا کر اظہارِ حیرت کیا۔

"اگر تم بندر ہو تو میں نے معاف کیا۔"

"او بھائی سا..." شوکت نے اکھڑے لہجے میں جواب دینا چاہا۔

"ساربان تم، تمہارا خاندان۔" بالے نے اسے آنکھ مارتے ہوئے اس کے الفاظ بدل دیے۔ لیکن ایک خوب صورت لڑکی کی موجودگی میں شوکت کو یہ انسلٹ کھل گئی۔ اس کا ضدی پن عود کر آیا۔ وہ بگڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم نے کیا بھڑ بھونجا سمجھا ہے مجھے، جو منہ میں آیا بک دیا۔ لاحول بھیجو جواب کبھی تمہارے ساتھ آؤں۔" وہ بچوں جیسے انداز میں، لیکن سنجیدگی سے روٹھ گیا۔ اور بالے کی ہم نشین لڑکی مسکرا دی۔

"یس مسٹر..." موٹی عورت نے بھی شوکت کی طرف داری کرنی چاہی۔ لیکن وہ بالے کا نام نہیں جانتی تھی۔

"بالچند۔" بالے جلدی سے بول اٹھا۔

"مسٹر بالچند، آپ اپنے دوست کی براہِ راست بے عزتی کر رہے ہیں۔" وہ انگریزی میں بولی۔

"دوستی ووستی گئی تیل لینے سالی۔ میں اب شکل بھی نہ دیکھوں گا۔" شوکت لمبے لمبے ڈگ بھرتا دروازے کی طرف چل دیا۔ بالے مسکرا کر جھپٹا اور نہ جانے کیا کان میں کہہ کر اسے

موم کر کے لے آیا۔ وہ موٹی عورت اور بالے کی ساتھی لڑکی، جو اب تک بالکل خاموشی سے ان کی گفتگو سنتی، اب تقریباً اکتا گئی تھیں۔ ان کے واپس آ کر نشستوں پر بیٹھتے ہی دونوں چہکنے لگیں۔

"آپ لوگوں کی باتیں کچھ سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ آپ اس آدمی سے لڑ بھی رہے تھے اور اس کے جانے کے بعد بگڑ بھی رہے ہیں؟" لیڈی انٹونیا نے شوکت سے پوچھا۔

"یہ سب اس شریف آدمی سے پوچھیے۔ یا تو یہ کریک ہے یا پاگل۔" شوکت نے بالے کی طرف اشارہ کیا۔

"دونوں۔" بالے پلکیں جھپکا کر بولا۔ "مس انٹونیا۔"

"انٹونیا۔" موٹی عورت نے برا سا منہ بنا کر تصحیح کی۔

"آئی ایم ساری۔ تو مس انٹونیا، دراصل وہ آدمی ایک پولیس افسر ہے اور میرا خاندانی دشمن بھی ہے۔" بالے نے اسے یقین دلانے والے لہجے میں بتایا۔

"اور ہاں۔ ان کا تو تعارف کرایا ہی نہیں اب تک تم نے۔" شوکت کا اشارہ بالے کی ساتھی لڑکی کی طرف تھا۔ جو اب تک چہرے پر ایک شرمیلی مسکراہٹ لیے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی خاموشی اب تک برقرار رہی تھی اور وہ اس وقت بھی کچھ نہ بولی۔

"یہ میری کالج کے زمانے کی دوست مس شیلا نائک ہیں۔" بالے نے ایک نظر پچھلی میز پر ڈال کر اپنے ساتھ والی لڑکی کا ان دونوں سے تعارف کرایا۔ لیکن ڈاکٹر اور ڈوری اب تک اسی میز پر بیٹھے تھے۔

"اوہ، بڑی خوشی ہوئی۔" شوکت اور لیڈی انٹونیا کے منہ سے ایک ساتھ نکلا تو پھر وہ جھینپ کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"اور آپ دونوں؟" بڑی دیر بعد شیلا نائر کے پتلے خوب صورت ہونٹوں سے ایک مترنم سی آواز نکلی۔

"ہم ایک دوسرے کے نئے نئے دوست ہیں۔" اس بار پھر اتفاق سے وہ دونوں ایک

ساتھ بول اٹھے اور شیلا نائر سے ہنسی ضبط نہ ہوسکی۔ اب شوکت اور لیڈی انٹونی ایک دوسرے کو غصے سے گھور رہے تھے۔ بوجھل پپوٹوں کے نیچے قوسی گہرائی میں چمکتی خوب صورت آنکھوں سے ڈوری اب اس میز پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو تقریباً گھورنے لگی تھی۔ شیلا نائر کی بے اختیار ہنسی نے اسے اس طرف متوجہ کرلیا تھا۔ ڈاکٹر کچھ بے چین سا نظر آرہا تھا۔ اس کی نظریں بار بار دروازے کی طرف اٹھ جاتیں۔ بالے ایک طائرانہ نظر میں یہ محسوس کرتے ہی چونک سا پڑا۔ اسے کچھ یاد سا آگیا۔ سپرنٹنڈنٹ خان نے اس کے لیے اجنبیت کا اظہار بے سبب نہ کیا ہوگا اور پھر وہ اس سے ٹکرایا کیوں تھا۔ یہ سوچتے ہی اس کا ہاتھ کوٹ کی نچلی جیب میں چلا گیا اور وہ خالی ہاتھ باہر نکال کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب کیا وحشت سوار ہوگئی؟" شوکت نے سوال کیا۔

"ڈبلیو سی۔" بالے نے اس کی پیٹھ پر مسکرا کر تھپکی دی اور دروازے سے نکل کر ڈبلیو سی کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔

اندرونی ہال کا پیشاب خانہ علاحدہ بنا تھا اور اس وقت بالکل خالی تھا۔ بالے نے اندر داخل ہوکر دروازہ بند کرلیا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر کاغذ کا وہ پرزہ نکالا لیا جسے چھوکر وہ چونکا تھا۔ یہ کسی سگریٹ کے پیکٹ کا وہ اندرونی ٹکڑا تھا جس میں سگریٹیں محفوظ رہتی ہیں۔ خان نے اس پر شاید بغیر دیکھے لکھی جانے والی بگڑی سی تحریر میں صرف چند سطور لکھی تھیں۔

"مس بورکر کو ڈوری کی نگرانی کے لیے چھوڑ دو اور تم ڈاکٹر کا پیچھا کرو۔"

اسے پڑھ کر بالے نے جیب سے سگریٹ لائٹر نکالا اور اس کی لو میں کاغذ کو جلا کر راکھ کر ڈالا۔ پھر وہ اس راکھ کو واش بیسن میں بہا کر دروازہ کھول کر رومال سے منہ پونچھتا ہوا باہر نکل آیا۔ خان کی اس ہدایت کو پڑھ کر اس کا دل اپنے آپ کو داد دینے کو چاہ رہا تھا۔ حالاں کہ محض فیملی سرکل میں داخلے کی شرط کے پیشِ نظر اس نے زنانہ فورس کے نائٹ ڈیوٹی اسٹاف میں سے مس بورکر کو فون کرکے یہاں بلوالیا تھا اور حسنِ اتفاق سے اس کی یہ حماقت کام آگئی۔

چلتے چلتے وہ آپ ہی مسکرایا اور پھر اس خیال سے اس نے سینہ پھلا لیا کہ اب وہ مس بورکر کی موجودگی کو اپنی عقل مندی کا ثبوت بنا کر خان کے سامنے کم از کم یہ دعویٰ کر سکے گا کہ وہ بھی دور کی سوچنے لگا ہے۔ اس نے دوبارہ چھوٹے ہال میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا، لیڈی انٹونیا بڑے رومان انگیز انداز سے مسکرا مسکرا کر شوکت سے گفتگو کر رہی تھی اور شوکت کچھ اس قسم کا منہ بنا رہا تھا جیسے اسے کونین کی بوتل زبردستی پلائی جا رہی ہو۔ حالان کہ کچھ دیر پہلے وہ گندم اگر بہم نہ رسد کی تمثیل کے ساتھ لیڈی انٹونیا کو ہی غنیمت قرار دے چکا تھا، مگر اب اس کی جھینپی ہوئی سی نظریں بار بار مس بورکر یا شیلا ٹانک کے اوسطاً خوب صورت چہرے کے گرد منڈلا رہی تھیں۔ اور لیڈی انٹونیا کی موجودگی اسے بار ہونے لگی تھی۔

"بھئی شفقت۔" بالے نے مصلحتاً اس کا نام بگاڑ کر سنجیدگی سے کہا۔ "میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ میں زیادہ دیر نہ بیٹھ سکوں گا۔"

"ارے بیٹھو نا، یار۔ پیٹ کا درد بھی کوئی بات ہے۔ سوڈا منگا لیتے ہیں۔" شوکت نے اصرار کر کے اسے بٹھا لیا۔ اور بالے یہ جان کر مسکرا دیا کہ وہ محض شیلا ٹانک سے بے تکلفی پیدا کرن کے لیے یہاں زیادہ دیر بیٹھنے پر اسے مجبور کر رہا ہے۔ دوسری میز پر بیٹھی ہوئی ڈوری کو تو اس نے یوروپین یا کم از کم زیادہ مہذب قسم کی اینگلو انڈین لڑکی سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا اور ویسے بھی خان اسی میز سے اٹھ کر گیا تھا۔ اس لیے وہاں دال گلنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لے دے کر مس بورکر ہی اس کی وقتی منظورِ نظر رہ گئی تھی۔ اور وہ بھی کبھی کبھی اس سے نظریں ملا کر کچھ اس انداز سے مسکرا بھی دیتی کہ بچے شوکت ریشہ خطمی ہو جاتے۔ بالے نے پیٹ کے درد کا بہانہ کچھ اتنی اونچی آواز میں کیا تھا کہ اس کی آواز دوسری میز تک بھی جا سکے اور اس کا مقصد وہی بہتر جانتا تھا۔

"ہیلو ڈارلنگ۔" ایک موٹی سی بھدی آواز نے ان چاروں کو چونکا دیا۔ یہ ایک سیاہ رنگ کے موٹے اونی سوٹ والا گندمی رنگ کا اوسط قامت آدمی تھا جو بشرے سے ادھیڑ عمر کا

معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جبڑے پھیلے ہوئے اور ناک موٹی سی تھی۔ آنکھیں موٹی اور باہر کی طرف نکلی ہوئیں اور سر کے بال اگرچہ کالے تھے، لیکن کنپٹی کے قریب کچھ سفیدی جھلک رہی تھی۔ اس کے کندھے چوڑے اور قوی مضبوط معلوم ہوتے تھے۔ اس کا مخاطب براہِ راست لیڈی انٹونیا سے تھا، جو اسے دیکھتے ہی چونک پڑی۔

"ہیلو ولسن۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ تم نہیں آئے تو میں اپنے دوستوں میں بیٹھ گئی۔"

اس نے اس آدمی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔

"آپ حضرات کا شکریہ۔ میں اپنی مخصوص میز پر بیٹھنے کی اجازت چاہوں گا۔" وہ بڑے مہذب اور مؤدب پیرائے میں سب سے مخاطب ہو کر بولا۔

"ارے دفان بھی ہو نا اب۔" شوکت زیرِ لب بڑبڑایا۔

"کوئی بات نہیں۔ آپ شوق سے اپنی میز سنبھالیے۔" بالے نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ اور وہ دونوں دوسرے سرے کی ایک میز کی طرف چلے گئے۔

"شوکت۔" بالے نے سنجیدگی سے شوکت کو مخاطب کیا۔

"ہاں، بولو۔" شوکت کہنیاں میز پر ٹیک کر اس طرح اس کی طرف جھک گیا کہ شیلا نائک کا چہرہ اس کے بالکل سامنے آ گیا۔ لیکن بالے کا جواب اس کے لیے غیر متوقع تھا۔

"میں کسی وقت بھی یہاں سے جا سکتا ہوں۔" بالے آہستہ سے بولا۔

"وہ تو سب ہی جائیں گے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

"بکو نہیں۔ میرے چلے جانے کے بعد بھی تم یہاں مس شیلا کے ساتھ ٹھہرو گے۔"

"مس شیلا کے ساتھ؟" شوکت نے حیرت سے دہرایا۔ "کیوں مذاق کرتے ہو، یار۔"

"مذاق نہیں، کام کی بات ہے۔ ویسے تم اگر میرے ساتھ ہی چلنا چاہتے ہو تو چل سکتے ہو۔"

"لعنت بھیجو تمہارے ساتھ جانے والے پر۔ اپنا تو میاں بس یہ قول ہے کہ حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے۔" وہ دزدیدہ نظروں سے شیلا کی طرف دیکھ کر بولا۔ "مگر تم جاؤ گے کہاں؟"

"جہنم میں۔"

"چچ چچ... کیسے بد اعمال ہیں تمہارے۔" شوکت نے اظہارِ افسوس کیا۔

"ابے او بوڑم۔" بالے جھنجلا اٹھا۔

"کیا معنی ہوئے؟"

"تمہارا سر۔" بالے یہ کہہ کر دروازے کی طرف دیکھنے والے انداز میں داہنی آنکھ کے کونے سے ڈاکٹر ٹیلر کی میز کا جائزہ لینے لگا۔ ڈاکٹر اور زیادہ مضطرب نظر آ رہا تھا۔ اس نے یا اس کی لڑکی نے اب تک بالے یا اس کے ساتھیوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ صرف ایک بار ڈوری اسے گھور چکی تھی۔ پہلے تو شوکت کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ بالے واقعی اسے مس شیلا کے ساتھ چھوڑ کر جانا چاہتا ہے۔ لیکن بالے کے سنجیدہ موڈ نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ضرور یہاں کوئی گول مال ہے۔

"بالے بھائی، کچھ گھپلا تو نہیں ادھر؟" اس نے جھک کر آہستہ سے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" بالے نے کہا۔

"مطلب کچھ گڑبڑ شڑبڑ، خون فساد وغیرہ۔"

"شاید لیڈی انٹونیا کا ساتھی تمہارا ہی خون کر دے، بے طرح گھور رہا تھا تمہیں۔"

"توبہ کرو میاں۔" شوکت نے شیلا ناتک کو دکھانے کے لیے بڑے بہادرانہ انداز میں کہا۔ "وہ سالا، ہونہہ۔ اس کا تو ٹینٹوا پکڑ کر گرگٹ کی طرح مسل دوں گا میں۔" اور اس گرگٹ مسلنے کے مظاہرے میں اس نے اپنی سگریٹ مسل ڈالی۔ پھر وہ داد طلب نظروں سے شیلا ناتک کو دیکھنے لگا، جس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ شوکت اور اترا گیا۔

"ای بار تو اس جیسے دو مسٹنڈوں کے سر پکڑ میں نے لڑا دیے تھے، قسم سے دونوں وہیں اٹا غفیل ہو گئے۔" لیکن اسے اس وقت کافی جھینپ محسوس ہوئی جب اس نے دیکھا کہ بالے کسی اور طرف متوجہ ہے۔ ایک تن درست سا بیرا اندر داخل ہو کر ڈاکٹر کی میز کی طرف آ رہا تھا۔ یہ قطعی غیر فطری سی بات معلوم ہوتی تھی اس کے لیے۔ وہ کبھی نچلا بیٹھنے والا آدمی نہ تھا۔ آج ضرور کوئی بات تھی۔ بیرے نے ڈاکٹر کے قریب آ کر آہستہ سے کچھ کہا، جس کے ساتھ ہی ڈاکٹر اٹھ کھڑا ہوا۔

"ڈوری، تم بیٹھو۔ میرا فون آیا ہے، میں ابھی آتا ہوں۔" ڈاکٹر یہ کہتا ہوا بیرے کے پیچھے ہی باہر چلا گیا اور ڈوری میز پر تنہا رہ گئی۔ دوسری طرف لیڈی انٹونیا اپنی میز پر بیٹھی ولسن سے گفتگو کر رہی تھی، مگر کبھی کبھی وہ رشک بھری نظروں سے اس نرم و نازک حسین لڑکی کو بھی دیکھ لیتی جو اپنے سرخ سائے میں سب سے علاحدہ کھلے ہوئے کنول کے پھول کی طرح نظر آ رہی تھی۔ ڈاکٹر چند منٹ بعد ہی لوٹ آیا، لیکن بالے یہ دیکھے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی کیفیت اس وقت بدلی ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے کے بشاش چہرے پر زردی سی دوڑ گئی تھی اور انداز رفتار سے ہی وہ کچھ نڈھال معلوم ہو رہا تھا۔

"ڈیئر، مجھے ایک ضرور کام سے جانا ہے، دیر ہو تو تم گھر چلی جانا۔"

"او کے ڈیڈی۔" وہ مسکرا کر بولی۔ مگر پھر غور سے باپ کو دیکھ کر چونک سی پڑی۔

"مگر آپ کچھ اداس معلوم ہو رہے ہیں، کیا بات ہے؟" اس نے پوچھ ہی لیا۔

"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ صرف سر میں کچھ درد ہے۔"

"تو پھر میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں نہیں، تم نہیں جاؤ گی۔ تم نہیں، مجھے تنہا ہی جانا چاہیے۔ مریض کا معاملہ ہے۔" ڈاکٹر نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اچھا۔" وہ یہ کہہ کر پھر بیٹھ گئی اور ڈاکٹر ایک نظر ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر ڈالتا

ہوا باہر نکل گیا۔

"بھئی شوکت، میرے پیٹ میں تو گڑبڑ ہو رہی ہے، میں تو جاتا ہوں۔" بالے بھی اس کے جاتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا، تمہاری خوشی۔ لیکن بدہضمی ہو تو ڈاکٹر کو ضرور بلوا لینا۔" شوکت نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

"اس پر نظر رکھنا، ممکن ہو تو تعاقب بھی۔" بالے نے چلتے چلتے شیلا نائک کے کان میں آہستہ سے کہا۔ وہ صرف مسکرا دی اور شوکت کا منہ بن گیا۔ اسے شک گزرا کہ شاید بالے اسی کے بارے میں کچھ کہہ رہا ہے۔ وہ بالے کو ایسی نظروں سے گھورنے لگا جیسے کہہ رہا سمجھ لوں گا، بچے سارجنٹ۔

بالے کے جانے کے بعد شوکت اپنی کرسی چھوڑ کر اس کرسی پر آ بیٹھا جس پر بالے اب تک بیٹھا رہا تھا، شیلا نائک کے پاس والی کرسی پر تھی۔ وہ نہ جھینپی نہ شرمائی، صرف مسکراتی رہی۔

"آپ چپ چپ کیوں بیٹھی ہیں؟" اس نے بھونڈا سا افتتاح کیا۔

"جی... نہیں تو... آپ کچھ بولیے، میں بھی بولوں گی۔"

"ارے واہ۔ سبحان تیری قدرت، بت بولنے لگے۔" شوکت کی باچھیں کھل گئیں، مگر اسے فوراً بالے کا خیال آ گیا اور وہ گھوم کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا کہ کم بخت کہیں پھر نہ آ ٹپکے۔

"یہ سارجنٹ بالے بہت برا آدمی ہے۔" وہ سرگوشی کے لہجے میں شیلا نائک سے بولا۔

"اچھا۔" وہ مصنوعی حیرت سے چونکی۔ "میں تو بھلا آدمی سمجھتی تھی۔" اس نے معصومانہ انداز میں کہا۔

"اجی آپ کیا جانیں، پورا تھالی کا بینگن ہے، تھالی کا۔"

"تب تو سب طرف لڑھکتا ہوگا۔" اس نے بڑی دل فریب ادا سے ہونٹ سکوڑ کر کہا اور شوکت کا دل منہ میں لٹکنے لگا۔

"بالکل، کل ہی مجھ سے کہہ رہا تھا، مجھے تو روز ایک نئی چاہیے۔"

"کیا؟" شیلا نائک نے بھولے پن سے پوچھا۔

"اونہوں... اب کیسے سمجھاؤں آپ کو۔ یعنی کہ فرض کر لیجیے لڑکی۔"

"میں کیوں فرض کر لوں؟ بتا تو آپ رہے ہیں۔"

"اچھا آپ بھونرا سمجھتی ہیں بھونرا؟"

"ہوں، کالا کالا ہوتا ہے۔"

"لاحول ولا... تو پھر خاک سمجھیں گی آپ۔"

"واہ بھنورے کو خاک کیسے سمجھ لوں گی میں؟"

"ایک بات کہوں؟" شوکت نے زچ ہو کر کہا۔

"کیا؟"

"ہار مانتا ہوں۔" اس نے اپنے دونوں کان تھام لیے۔

"کیوں؟"

"آپ سیانی، میں الو کا پٹھا۔"

"چھی چھی... ایسے کیسے ہو سکتے ہیں آپ۔"

"ارے صاحب، میں ہوں۔ دس ہزار بار ہوں۔" وہ جھنجلا کر بولا۔ "کہاں پھنسا کے چلا گیا، کم بخت۔" وہ منہ پھیر کر بڑبڑانے لگا۔

"آپ روٹھ گئے شاید؟" شیلا نائک نے ناز سے منہ بنا کر یہ کہتے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا اور شوکت کی تمام جھنجلاہٹ کافور ہو گئی۔ اس نے کسی ایپ بندر کی طرح ہنستے

ہوئے دانت نکال دیے۔

‘‘میں کافی پیوں گی۔’’ وہ اٹھلا کر بولی۔ لیکن لہجے میں شرارت تھی۔

‘‘اہاں ہاں، ضرور ضرور۔ اے بیرا، کافی لاؤ فرسٹ کلاس۔’’ شوکت نے سامنے سے آتے ہوئے بیرے کو اشارے سے بلا کر کہا۔ اور بیرا سر ہلا کر چلا گیا۔ لیکن شوکت سے گفتگو کرتے ہوئے بھی شیلا نائک کی دزدیدہ نگاہیں ڈوری پر جمی ہوئی تھیں۔ بالے جو کچھ کہہ گیا تھا اس کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ اکیلی ہی تو تھی، ایک بے ضرر لڑکی۔ لیکن وہ یہاں تن تنہا بیٹھی کیوں تھی۔ لیکن اچانک وہ چونک پڑی۔ ہال کے دروازے میں ایک سرخ و سفید رنگ کا نوجوان آدمی کسی قدر گھبرایا ہوا سا داخل ہوا۔ اس کا رخ ڈوری والی میز کی طرف تھا۔ ڈوری اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

‘‘ہیلو، ڈیوڈ۔’’ اس نے اسے خوش آمدید کہنے والے انداز میں کہا۔ لیکن اس نوجوان آدمی نے کوئی جواب دینے کی بجائے قریب آ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ کافی پریشان معلوم ہو رہا تھا۔

‘‘یہاں سے فوراً نکل چلو، ڈوری۔ چلو۔’’ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

‘‘آخر بات کیا ہے؟’’

‘‘یہ بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی تو اتنا ہی سمجھ لو کہ ہم خطرے میں ہیں۔’’ اس نے کسی خوف سے متاثر لہجے میں کہا۔

‘‘مگر ہم نے کیا کیا ہے؟ کس بات کا خطرہ ہے؟’’

‘‘اف فوہ، یہ گفتگو کا وقت نہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔’’ یہ کہہ کر اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹا اور وہ بھی خموشی سے اس کے ساتھ ہو لی۔

‘‘ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔’’ شیلا نائک نے آہستہ سے کہا۔

‘‘اجی، کالا کیا سفید بھی ہو تو ہمیں کیا؟’’ شوکت نے اسے پھر اپنی طرف متوجہ کرتا

چاہا۔

"ہم بھی چلیں گے۔" شیلا ناٹک خود اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈوری اور وہ آدمی باہر جا چکے تھے۔

"کہاں؟"

"ان کے پیچھے۔"

"ارے واہ، یہ کیا ہوئی۔" شوکت حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگا۔

"کام کی بات ہے۔" وہ بولی۔ "آیئے، دیر نہ کیجیے۔" وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ پیچھے شوکت کو بیرے کی پلیٹ میں دو روپے کا نوٹ ڈالتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑ کر آنا پڑا۔

☆☆☆☆☆☆

خون یا حادثہ

ڈاکٹر بٹلر ہوٹل سے نکل کر باہر کھڑی ہوئی ایک چھوٹی ہلمین کار میں بیٹھ چکا تھا، جب بالے اندر سے نکل کر ایریزونا کے دروازے پر آیا۔ ڈاکٹر کی کار کے روانہ ہوتے ہی اس نے باہر نکل کر ایک ٹیکسی پکڑ لی۔

"اگلی گاڑی کا پیچھا کرو۔" بالے نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا، صاحب۔" ڈرائیور اس کا مطلب سمجھ کر بولا، ساتھ ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔ اس نے یہ بھی نہ پوچھا کہ کسی کا پیچھا کرنے کی ہدایات دینے والا کون ہے اور کیوں ایسا چاہتا ہے؟ آگے پیچھے دونوں گاڑیاں تیز رفتاری سے دوڑنے لگیں۔ ان کی گاڑیاں مختلف سڑکوں کو عبور کرتی ہوئی ولفٹ روڈ پر نکل آئیں۔ یہاں سڑک پر آمدورفت بہت کم تھی۔ اکادکا راہ گیر یا گاہے بگاہے کوئی کار یا لاری گزر جاتی۔

یہ علاقہ شان دار بلڈنگوں اور شان دار قسم کے مکینوں کا تھا، اس لیے یہاں شہر کے دوسرے گھنی آبادی والے علاقوں کی طرح چہل پہل نظر نہیں آتی تھی۔ ڈاکٹر کی کار میں اس کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اس کی گاڑی ایک تنگ سی گلی میں گھوم کر دوسری طرف ایک کم وسیع مگر ستھری سڑک پر نکل آئی۔

بالے کی ٹیکسی نے بھی تعاقب جاری رکھا، لیکن شاید ڈاکٹر اس تعاقب سے بے خبر تھا یا ممکن ہے وہ اپنے خیالات میں اس قدر کھویا ہوا ہو کہ اس نے اس کی طرف دھیان ہی نہ دیا ہو۔ اچانک ڈاکٹر اپنی کار کے ڈیش بورڈ میں ٹک ٹک کی آواز سن کر چونک پڑا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے ڈیش بورڈ کا ایک چھوٹا سا سوئچ آن کردیا جس کے ساتھ ہی ایک شیشے کا چھوٹا سا خانہ روشن ہوگیا۔

”ڈاکٹر بٹلر... ڈاکٹر۔“

”یس، باس، بٹلر اسپیکنگ۔“ ڈاکٹر ڈیش بورڈ کی طرف جھک کر بولا۔

”تم نے اس پولیس افسر سے مل کر میرے اصولوں سے غداری کی ہے۔“ ڈیش بورڈ سے ایک تحکمانہ آواز سنائی دی، جس کے ساتھ ہی ڈاکٹر کا ہاتھ اسٹیئرنگ پر کانپ گیا۔

”میں نے کوئی غداری نہیں کی، باس۔ میں اس سے ملنے پر مجبور تھا۔“ ڈاکٹر نے کسی سہمے ہوئے چوہے کی طرح سمٹ کر جواب دیا۔

”خیر، کوئی تمہارا پیچھا کر رہا ہے۔ تم ڈیش بورڈ میں لگا ہوا سرخ سوئچ آن کر دو، گاڑی کی رفتار دوگنی ہو جائے گی۔“ ادھر سے آواز سنائی دی۔

”او کے، باس۔“ ڈاکٹر نے تقریباً مطمئن ہوتے ہوئے ڈیش بورڈ میں لگا ہوا ایک چھوٹا سا سرخ سوئچ آن کر دیا اور ایکسیلیٹر کو اور زور سے دبا دیا۔ لیکن دوسرے لمحے ایک زبردست دھماکے کی آواز نے پیچھے آتی ہوئی ٹیکسی میں سارجنٹ بالے کو بری طرح چونکا دیا۔ اور اگر ٹیکسی کا ڈرائیور بڑی مہارت اور ہوش مندی سے پوری طاقت سے بریک لگاتے ہوئے گاڑی کو کنارے کی طرف نہ موڑ دیتا تو اس ٹیکسی کی بھی خیر نہ تھی۔ ڈاکٹر کی کار ایک دھماکے کے ساتھ زمین سے تقریباً تین فٹ اچھل کر ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی اور اس کی پھٹی ہوئی پٹرول کی ٹنکی سے اڑ کر بکھر جانے والے تیل نے اس کے منتشر ٹکڑوں کو بھی آگ کی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ان شعلوں کی روشنی آس پاس کی عمارتوں تک پہنچ رہی تھی اور لوگ اپنے مکانوں سے گھبرا کر نکل آئے تھے۔ ذرا سی دیر میں بہت سا مجمع جلتی ہوئی کار کے گرد اکٹھا ہو گیا۔

”چلو، بیٹے۔ اب کیا رہ گیا ہے یہاں؟“ ٹیکسی ڈرائیور نے بالے کا بازو پکڑ کر اسے کار کی طرف کھینچا۔

”بیٹے...؟“ بالے چونک پڑا۔ ”آپ کون ہیں، ابا جان؟“ اس نے مسخری شکل بنا کر پوچھا۔ جس کے جواب میں ٹیکسی ڈرائیور نے اپنی پی کیپ کا آگے جھکا ہوا حصہ اوپر اٹھا دیا

اور سفید کوٹ کے کالر الٹا لیے۔

"آپ ...؟" بالے چونک پڑا۔ وہ سپرنٹنڈنٹ خان کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

"ہاں۔ بس نکل چلو یہاں سے۔ آج ان پراسرار بے وقوفوں نے خود یہ ثابت کر دیا کہ ہمارے شبہات غلط نہ تھے۔" وہ ٹیکسی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

"تو کیا آپ اس حادثے کو کسی مجرمانہ سازش سے تعبیر کر رہے ہیں؟"

"حادثہ نہیں، برخوردار۔ ڈاکٹر کو ایک نئے طریقے سے ختم کیا گیا ہے۔"

"کوئی جادوئی طریقہ ہے کیا؟" بالے نے پلکیں جھپکا کر پوچھا۔ وہ اب اس مجمع سے کافی دور نکل آئے تھے اور کسی نے ان کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

"اس وقت کچھ سمجھ میں نہ آئے گا اور شاید بعد میں بھی ہم کار کے جلے ہوئے ڈھانچے اور ڈاکٹر کی جلی ہوئی لاش سے کوئی سراغ نہ حاصل کر سکیں۔"

"کیا آپ جانتے تھے کہ ایسا ہوگا؟"

"میں کوئی ولی نہیں ہوں۔ البتہ ڈاکٹر کے اس انجام سے کم از کم یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ کوئی بہت پراسرار قسم کی مجرمانہ سازش بروئے کار ہے۔ کافی منظم۔ اس بت وہ پہلا امکانی ذریعہ ہی ختم کر دیا ہے جس کے سہارے ہم آگے بڑھ سکتے تھے۔"

"اور ڈاکٹر کی لڑکی؟"

"مجھے اب اس کے لیے بھی خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ حالاں کہ وہ قطعی ان جان اور بے واسطہ معلوم ہوتی ہے۔"

"اجازت ہو تو میں چلتی کار سے باہر چھلانگ لگا دوں؟"

"شوق سے۔" خان نے گاڑی کی رفتار اور تیز کرتے ہوئے کہا۔

"آپ نے وجہ نہیں پوچھی؟"

"کیا ضرورت ہے؟"

"میں اس کے عشق میں دل و جان سے مبتلا ہو چکا ہوں۔"

"جہنم میں گیا تمہارا عشق۔ کام کی باتیں کرو۔"

"ہائے، آپ کیا جانیں کہ عشق فرمانا بذاتِ خود کتنا بڑا کام ہے۔ آدمی چوبیس گھنٹے بزی رہتا ہے۔ سوئے تو خواب اور جاگے تو..."

"جوتے۔"

"اپنا اپنا خیال ہے۔"

"مس بورکر اس کے پیچھے گئی ہوگی؟"

"مجھے ڈر ہے۔"

"کیا؟"

"وہ بھوپالی بھینسا بھی اس کے ساتھ ہے۔ کہیں گاڑی روک کر محبت نہ جتانے میں لگا ہو؟"

"وہ اتنی بے وقوف نہیں۔"

"ارے آپ کیا جانیں ان حوا کی بیٹیوں کو، ذرا کسی نے پیٹھ پر ہاتھ پھیرا، بس دم ہلانے لگیں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ ڈاکٹر بے چارہ جان سے گیا۔"

"اگر اس کا تعلق بلیک کے کیڑوں والے کیس سے تھا تو میں اس کے جہنم رسید ہونے پر سوا پانچ آنے کی مٹھائی بانٹوں گا۔ لیکن اس کی لاش کا کیا ہوگا؟"

"سینٹرل پولیس اسٹیشن سے ابھی وسنت روڈ پولیس اسٹیشن کو فون کر دیں گے، وہ خود جا کر انتظام کر لیں گے۔ کیا اور کیسے ہوا، یہ تو ان کے بس کا روگ نہیں۔"

"روگ تو تمام آپ کے بس کے ہیں۔ کاش آپ ڈاکٹر ہی ہوتے؟"

"کیوں؟"

"یوں اس طرح وقت بے وقت دھکے تو نہ کھانے پڑتے اس غریب کو۔ کوئی سیدھا سادا افسر ملا ہوتا جو خود بھی دودھ ملائی کھاتا اور بالے صاحب بھی۔"

"حرام خوری کا پھل کبھی میٹھا نہیں ہوتا۔"

"آپ نے دیکھا ہوگا، میں نے تو سونگھا تک نہیں۔"

"تم فون پر وسنت روڈ پولیس اسٹیشن کو خبر کر دو کہ ان کے علاقے میں ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ میں اوپر آفس میں ہوں۔" خان گاڑی سے اترتا ہوا بولا۔ یہاں اس کی کار بھی پہلے سے موجود تھی۔ سینٹرل پولیس اسٹیشن کا عملہ پہلے تو خان کو اس لباس میں پہچانا نہیں، لیکن بالے کو ساتھ دیکھ کر جب ان لوگوں نے غور سے خان کو دیکھا تو سب اٹینشن ہو گئے۔ خان سر کی جنبش سے ان کے سلام کا جواب دیتا ہوا اوپر چلا گیا۔

"کیا بات ہے، بالے صاحب؟" پولیس اسٹیشن کے انچارج انسپکٹر شاہ نے پوچھا۔

"بات...؟" بالے چونک کر رکا۔ "کیا میں نے کوئی بات کی ہے آپ سے؟" اس نے شاہ کو تعجب زدہ نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

"بھئی، میرے پیچھے پنجے نہ جھاڑو، میں سنجیدہ ہو کر پوچھ رہا ہوں۔" شاہ نے اسے آ بیل مجھے مار والے موڈ میں دیکھ کر کہا۔

"پنجے ونجے جھاڑتے ہوں گے لال بیگی۔" بالے نے اظہارِ بے نیازی سے کہا۔

"پھر وہی تم سے کچھ پوچھنا ہی مصیبت ہے۔"

"اوہ، کچھ پوچھ رہے تھے آپ۔ اچھا فرمایئے؟"

"کہاں سے آ رہے ہو؟ کیا معاملہ ہے؟"

"معاملہ صاف ہے۔ ہم لوگ پکنک سے واپس آ رہے ہیں۔"

"اف... فوہ... تم آدمی نہیں مرکھنے بیل ہو۔" شاہ جھنجلا کر ڈیوٹی روم کی طرف چلا گیا

اور بالے مسکراتا ہوا بڑے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہاں چند ہیڈ کانسٹیبلوں اور ایک سب انسپکٹر کے علاوہ ایک میز پر محرر بیٹھا تقریباً اونگھ رہا تھا۔ دوسرے تو اسے دیکھ کر سٹ پٹا سے گئے، لیکن محرر کھلی ہوئی آنکھوں سے بھی شاید نہ دیکھ سکا۔ وہ ایک منحنی سا بوڑھا آدمی تھا۔

"چچا، تمہارے لیے افیون کی ٹکیہ منگائی ہے میں نے۔" بالے نے فون پر سے ریسیور اٹھا کر نمبر گھماتے ہوئے اسے کہا۔ وہ اسے قریب پا کر ہی چونک پڑا تھا۔

"سر... سر، وہ بات یہ ہے کہ آج مجھے نیند بہت آ رہی ہے۔ رات ڈبل ڈیوٹی کی تھی۔" محرر نے گھبرائے ہوئے لہجے میں صفائی پیش کی۔

"بڑا احسان کیا تھا تم نے۔ پولیس کمشنر کی سات پیڑھی تمہاری ممنون رہے گی، مگر ذرا ادھر ہٹ کر بیٹھو۔" اس نے محرر کی کرسی خود ہی ایک طرف کھسکا دی اور فون پر متوجہ ہو گیا۔ دوسری طرف کال اٹینڈ کرنے والا ونسنٹ روڈ پولیس اسٹیشن ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ اس نے جواب میں بتایا کہ یہاں اس کار کے حادثے کی اطلاع پہنچ چکی ہے اور ابھی ابھی اسٹیشن کا انچارج اپنی جیپ کار لے کر اس کے لیے روانہ ہوا ہے۔

بالے نے ریسیور رکھ دیا اور محرر پر ایک شرارت بھری نظر ڈالتا ہوا کمرے سے نکل کر تیز تیز زینہ چڑھتا اوپر چلا گیا۔

"اب فرمایئے، کیا ارادے ہیں؟" وہ خان کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ دوسری نشست پر علاقے کا انچارج ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کیلی موجود تھا۔ خان نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا، وہ کیلی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"وہ آپ کے گشتی ڈیوٹی آفیسر نے کیا رپورٹ دی تھی آپ کو؟"

"دو تین گاڑیاں مشتبہ حیثیت میں آدھی رات کو نقل و حرکت کرتی دیکھی گئی تھیں، لیکن انھیں روکنے پر معلوم ہوا کہ کچھ رامانہ جوڑے تھے جو سناٹے میں تفریح کر رہے تھے۔"

"کیا ان کی گاڑیوں کی تلاشی بھی لی گئی تھی؟"

"شراب کے بہانے تلاشی لی گئی تھی، لیکن کوئی قابلِ اعتراض چیز برآمد نہیں ہوئی، صرف ایک گاڑی کی اسٹپنی میں ایک چوہے وان رکھا تھا۔" ڈی ایس پی نے لاپرواہی سے بتایا۔

"چوہے وان...!" خان چونک پڑا۔

"کیوں؟ کیا یہ بھی کوئی خاص چیز ہے؟" ڈی ایس پی نے نیم طنزیہ انداز میں ہنس کر پوچھا۔

"خاص چیز...؟ نہیں تو... ویسے ہی... لیکن کار میں چوہے وان؟ اچھا، کیا آپ نے کبھی کسی کار میں چوہوں کے بل بھی دیکھے ہیں؟" خان نے بڑی سادگی سے سوال کیا۔

"چوہے کے بل؟ کار میں...؟ سمجھ میں نہیں آئی آپ کی بات۔"

"اوہ...نہیں... میں تو یوں ہی کہہ رہا تھا۔ بہرحال ان کاروں کے نمبر تو نوٹ کیے گئے ہوں گے؟"

"جی ہاں۔ انسپکٹر شاہ کے پاس ہیں۔"

"خیر، چھوڑیے اس تذکرے کو، لیکن..."

"صاحب، آپ کا فون۔" اردلی نے اندر داخل ہو کر بالے کو مخاطب کیا۔

"اچھا۔" بالے اٹھ کھڑا ہوا۔

فون پر آکر سب سے پہلے جو چیز اسے سننے کو ملی وہ ایک موٹی سی گالی تھی جو کسی موٹے سے آدمی کی ہی ہو سکتی تھی۔

"آخر بات کیا ہے، جانِ من؟" بالے نے شوکت کو اور تپاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ تمہاری مس مانک، سالی، چکمہ دے کر ہوا ہو گئی کہیں۔"

"کیا؟ بھاگ گئی تمہیں چھوڑ کر؟"

"تو تو اس طرح پوچھ رہے ہو جیسے میری سگی بیوی بھاگ گئی ہو کسی کے ساتھ۔"

شوکت نے بگڑے ہوئے لہجے میں ادھر سے جواب دیا۔

"خیر، غم نہ کر، وہ بھی ایک دن بھاگ جائے گی۔" بالے نے اسے اور اشتعال دلایا۔

"شٹ اپ۔" شوکت ادھر سے حلق کے بل چیخا۔ "میں اس وقت غصے میں ہوں۔"

"تو رسیور سے کشتی لڑو۔ مگر یہ تو بتاؤ، تم بول کہاں سے رہے ہو؟"

"جہنم سے۔"

"چچ چچ..." بالے نے اظہارِ افسوس کیس۔ "برے اعمال کا نتیجہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔"

"میں بہت غصے میں ہوں۔"

"کیوں؟ یہ ترقی کیوں؟"

"سالی نے مجھے بازار میں گاڑی روک کر رومال خریدنے بھیج دیا اور میری گاڑی لے کر وغیرہ وغیرہ ہوگئی۔"

گھبراؤ نہیں، واپس آجائے گی۔ مذاق کیا ہوگا تم سے۔"

"مذاق؟ میں کیا اس کا سگا لگتا ہوں؟"

"بھول گئے، تم تو عشق فرمانے جا رہے تھے اس سے؟"

"لاحول بھیجو اس عشق پر۔ لونڈیا ہے یا ہنٹر والی؟"

"اچھا، تم سیدھے یہیں چلے آؤ۔ تمہاری گاڑی بھی یہیں آجائے گی۔"

"میں کیا تمہارے سر پر چڑھ کر آؤں گا؟"

"ٹیکسی کرلو، جانِ من۔" بالے نے اسے چمکارا۔

"ہونہہ... تین چار روپے کا پھٹکا۔" یہ کہہ کر اس نے رسیور رکھ دیا۔

لیکن بالے ابھی وہ فون اسٹینڈ سے ہٹا بھی نہ تھا کہ پھر فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ بالے نے ریسیور پھر اٹھالیا۔ ”اوہ،...یس، میں بالے بول رہا ہوں... کیا؟... مگر کیسا آدمی ہے؟... قریب سے نہیں دیکھا۔... اچھا تم وہیں ٹھہرو، ڈاکٹر بٹلر کا خون ہو چکا ہے۔... ہاں ہاں، خون۔... کہیں ڈوری بھی خطرے میں نہ ہو۔... ہاں۔... عمدِ قتل ہو تو فوراً گولی... بالکل۔... خان صاحب یہیں ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور دوڑتا ہوا خان کے کمرے میں جا گھسا۔

”ڈوری بھی خطرے میں معلوم ہوتی ہے۔“ اس نے دروازے سے ہی خان کو مخاطب کیا۔

”ڈوری؟“ خان فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈی ایس پی انھیں حیران حیران نظروں سے دیکھتا ہی رہ گیا، اور وہ دونوں تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆☆☆☆

درگت

کان کی گاڑی بڑی تیزی سے بیرن روڈ پر بھاگ رہی تھی۔ آگے جمنا بائی اسٹریٹ تھی اور ڈاکٹر بٹلر اسی اسٹریٹ پر ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہتا تھا۔ انھیں وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہ لگی، لیکن جب وہ کار باہر روک کر احاطے کے بند دروازے کو اوپر چڑھ کر پار کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے تو یہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نیم تاریک برآمدے میں چند لمحے ٹھہر کر انھوں نے محسوس کیا کہ بنگلے کے ملازم وغیرہ بھی تو ہیں نہیں، یا پھر کچھ گڑبڑ ہے۔ انھیں مس بور کر بھی نظر نہ آئی اور بالے کو تعجب تھا کہ باہر سڑک پر اسے دور تک کوئی ایسی کار بھی کھڑی نظر نہیں آئی جو شوکت کی کار سمجھی جا سکے۔

“تمہیں یقین ہے کہ تمھیں مس بورکر نے ہی فون کیا تھا؟” خان نے سرگوشی کے لہجے میں بالے سے پوچھا۔

“جناب، میں پورا گدھا نہیں ہوں۔” بالے نے برا ماننے والے انداز میں کہا۔

“خیر، کچھ کم ہی سہی۔ اچھا، اب کال بیل بجاؤ۔” خان اسے آگے دھکیلتے ہوئے بولا۔ “اور ہاں، اندر صرف تم جاؤ گے۔ میں یہاں موجود نہیں ہوں۔”

“چہ خوش۔ تو میں کیا ساون کا اندھا ہوں؟”

“بکومت، جلدی کرو۔” خان نے اسے بند دروازے کے اوپری روشن دان سے چھن کر آتی ہوئی روشنی کی طرف دھکیل دیا اور خود برآمدے کے تاریک گوشے کی طرف کھسک کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

“مسلسل تین چار بار گھنٹی بجانے پر اندر سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور دوسرے لمحے ایک ادھیڑ عمر کی سیاہ فام ملازمہ نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ دروازے پر ایک

اجنبی کو کھڑا دیکھ کر وہ کچھ خوف زدہ سی ہو گئی۔

''ڈاکٹر گھر پر نہیں ہیں۔'' اس نے یہ کہہ کر دروازہ دوبارہ بھیڑنا چاہا، لیکن بالے نے ہاتھ اڑا دیا۔

''مس ڈوری ہیں؟'' اس نے نرمی سے پوچھا۔

''اوہ.. آپ پاپا کے دوست ہیں کیا؟''

''ہاں۔'' بالے نے جھوٹ بولا۔

''تب تو جلدی تشریف لایے۔ انھیں نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔'' وہ پیچھے ہٹ کر دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ بالے اندر داخل ہو گیا۔ سیاہ فام ملازمہ کے پیچھے چلتا وہ ایک ڈرائنگ روم نما بڑے کمرے سے گزر کر ایک کاریڈور میں کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہو گیا۔ یہاں دو آدمی اور موجود تھے، جو لباس و شکل سے ڈاکٹر کا خانساماں اور مالی معلوم ہوتے تھے اور ڈوری ایک صوفے پر بے جان سی پڑی ہوئی تھی۔

''کیا ہوا انھیں؟'' بالے نے صوفے کی طرف لپکتے ہوئے پوچھا۔

''خدا جانے۔'' خانساماں نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے جواب دیا۔ ''شام کو جو پاپا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گئی تھیں تو طبیعت ٹھیک تھی۔''

''پھر کیا ہوا؟'' بالے نے اسی سے سوال کیا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے میری نے مجھے خبر کی کہ پاپا اکیلی ہی واپس لوٹ آئی ہیں۔ میں باورچی خانے کا کام جلدی سے ختم کر کے ان سے کھانے کے لیے پوچھنے یہاں آیا تو پاپا ادھر صوفے کے پاس قالین پر بے ہوش پڑی تھیں۔'' خانساماں نے اشارے سے بتایا۔

''اور قالین پر کسی کے قدموں کے نشانات نہیں مل سکتے۔'' بالے زیرِ لب بڑبڑایا۔

''کسی ڈاکٹر کو خبر نہیں کی تم نے؟'' بالے نے سیاہ فام آیا سے پوچھا۔

''پاپا جب آئی ہیں تو اچھی خاصی تھیں۔ ابھی چند منٹ میں جو کچھ ہوا ہو، میں ڈاکٹر کو

فون کرنے جا ہی رہی تھی۔" وہ بولی۔

"بنگلے میں یہ اکیلی ہی داخل ہوئی تھیں کیا؟"

"بالکل اکیلی۔ اور یہ ٹیکسی پر آئی تھیں۔ پورٹیکو میں میں نے ہی اس کا بل چکایا تھا۔" آیا میری نے بتایا۔

"وہ اس وقت گھبرائی ہوئی کیفیت میں بالے کے متعلق بغیر یہ جانے کہ وہ کون ہے اور کیوں آیا ہے اس کے سوالات کا جواب دے رہے تھے۔ اور بالے نے نوکروں کے سامنے یہ بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا کہ وہ کون ہے۔

"ٹھیک سے یاد کرو۔" بالے نے اس سے دوبارہ کہا۔

"مجھے ٹھیک سے یاد ہے، جناب۔ میری یادداشت اور میری نظر دونوں پختہ ہیں۔ مجھے یہاں تک یاد ہے کہ پاپا نے جب ایک بار مجھے زپّی کہہ کر پکارا تھا، اس وقت پاپا کی عمر ۱۲ سال ۵ مہینے ۹ دن کی تھی۔" آیا نے اپنی یادداشت کا مظاہرہ بھی شروع کر دیا۔

"نہیں۔ کوئی نہ کوئی اور بھی ان کے پیچھے یہاں تک آیا ہے۔" بالے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ پھر کچھ سوچ کر جیب سے اس نے اسیز کا ٹیوب نکالا اور ڈوری کی ناک سے لگا دیا۔ وہ چند سیکنڈ بعد ہی کسمسانے لگی۔ پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ خوشی سے نوکروں کے چہرے کھل گئے۔ جنھیں دیکھ کر بالے کو اپنا یہ خیال بدلنا پڑا کہ وہ نامعلوم آدمی کہیں ان میں ہی موجود نہ ہو۔

اچانک ایک فائرنگ کی آواز نے سب کے کان کھڑے کر دیے۔ بالے تیزی سے دروازے کی طرف لپکا اور ڈرائنگ روم کو عبور کرتا ہوا برآمدے میں نکل آیا۔ اسے دور سڑک پر کسی کے دوڑتے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز۔ مگر جب وہ دوڑتا ہوا احاطے کے دروازے تک آیا تو سڑک صاف تھی اور خان کی کار کا بھی پتا نہ تھا۔

وہ چند سیکنڈ وہیں کھڑا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر واپس احاطے میں داخل ہو گیا۔

ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی اسے عجیب سا شور سنائی دیا۔ کوئی ہندوستانی اور انگریزی مشترک زبان میں زور زور سے گالیاں بک رہا تھا اور ساتھ ہی کھڑکیوں کے شیشوں کے ٹوٹنے کے چھناکے بھی اس کے کانوں میں گونج اٹھے پھر اس نے بھاگتے قدموں کی آوازیں سنیں اور ڈرائنگ روم کے پچھلے دروازے سے ایک نوکر ہانپتا ہوا داخل ہو کر فرش پر گر پڑا۔ اس کے بعد ہی خانساماں بھی گھبرایا ہوا سا بھاگتا آ پہنچا۔ اور ساتھ ہی آیا کی چیخیں سارے بنگلے میں گونجنے لگیں۔ بالے نے بغیر کچھ سوچے سمجھے ایک جست کی اور زمین پر پڑے نوکر کے اوپر سے ہوتا ہوا کاریڈور میں نکل گیا۔ اگر وہ یہاں بڑی پھرتی سے زمین پر نہ گر پڑا ہوتا تو اس کابی سر سلامت نہ رہتا۔ ایک اڑا ہوا گلدان اس کے سر کے اوپر سے گزرتا ہوا دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا اور آیا کی چیخیں پھر سنائی دینے لگیں۔ زمین پر رینگتا ہوا وہ جب ڈوری کی کمرے کے دروازے پر پہنچا تو یہاں اسے کچھ اور ہی تماشا نظر آیا۔ ڈوری کمرے کے وسط میں پاگلوں کی طرح اپنے بال پھیلائے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بپھری ہوئی شیرنی اپنے پنجرے سے نکل پڑی ہو۔ اس کے ایک ہاتھ میں بے چاری سیاہ فام آیا کے بال تھے اور دوسرے ہاتھ میں شیشے کی ایش ٹرے۔ بالے کا سایا دروازے کے پٹ پر لہراتے ہی اس کا ہاتھ اونچا اٹھا اور شیشے کی ایش ٹرے بالے کے سائے کے سر پر پڑتے ہی ریزہ ریزہ ہو گئی۔ بالے نے اگر پٹ کی آڑ میں رومال سے منہ نہ چھپا لیا ہوتا تو یقیناً شیشے کے کچھ ٹکڑے اس کے چہرے کو بھی زخمی کر دیتے۔

”پاپا... پاگل ہو گیا ہے... پاپا...“ آیا نے اس اذیت کے عالم میں بھی چیختے ہوئے دوسروں کو خبردار کیا۔

”شٹ اپ، یو کالی بلی۔ ورنہ میں تیری جیلی بنا کر چوہوں کو کھلا دوں گی۔ بول، کتنے چوہے کھائے ہیں تو نے؟“ وہ اس کے بالوں کو جھٹکا دیتی ہوئی انگریزی میں اس سے چیخ چیخ کر پوچھنے لگی۔ اس کی اس کیفیت سے کسی تصنع یا حماقت کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ وہ موسم بہار کی

نو شگفتہ کلی کی طرح معصوم اور خوب صورلڑکی چند گھنٹے قبل ایک بے ضرر اور نرم و نازک لطیف وجود نظر آتی تھی، اس وقت نا قابلِ یقین حد تک خوں خوار نظر آ رہی تھی۔

"گھبراؤ نہیں، آیا۔ میں پچھلی کھڑکی سے آ رہا ہوں۔" بالے نے خوف زدہ آیا کو تسلی دیتے ہوئے بلند آواز میں کہا، لیکن یہ دیکھ کر کہ اس کے الفاظ صرف آیا ہی نے سنے اور ڈوری پر ان کا کوئی اثر تک نہ ہوا، وہ دروازے سے کھسک کر کاریڈور سے نکلتا ہوا اس کمرے کے پشت والے لان میں آ گیا۔ پھر اس نے اس کمرے کی پچھلی کھلی کھڑکی سے ایک جست کی اور اندر پہنچ کر جھپٹ کر ڈوری کے دونوں بازو پیچھے سے تھام لیے۔

"اے، یو ایڈیٹ، سوائن، گدھا، الو کا فنا۔" وہ پوری طاقت سے گلا پھاڑ کر چیختی بالے پر پلٹ پڑی۔ آیا کے بال اس کی گرفت سے چھوٹ گئے اور وہ آزاد ہوتے ہی گرتی پڑتی دروازے کی طرف بھاگی۔

"آپ اسے پکڑے رہیے، میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔" اس نے دروازے پر پلٹ کر انگریزی میں بالے سے کہا۔

"نہیں، ابھی صبر کرو۔ میں سب انتظام کروں گا۔" بالے نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا اور وہ وہیں دروازے میں کھڑی رہ کر اپنا سر سہلاتے ہوئے تماشا دیکھنے لگی۔ خدا جانے اس نرم و نازک سی لڑکی میں اتنی طاقت اس وقت کہاں سے آ گئی تھی کہ وہ بالے سے بھی سنبھالے نہ سنبھل رہی تھی۔

"بلاڈی فول، آئی ول ایٹ یو رنوز... یو... فول فلائی فل فل فی۔" وہ دونوں پیروں پر اچھل کر چیخی۔ ایک اتنے حسین اور گداز وجود کو اپنی آغوش میں کسے ہوئے بالے کے رونگٹے تک کھڑے ہو گئے تھے اور پھر جب اس کی گوری گوری پنڈلیاں اس کی ٹانگوں سے الجھنے لگیں تو اسے عالمِ تصور میں ارسطو بھی بچہ مرغ نظر آنے لگا۔ لیکن دوسرے لمحے ہی اس نے محسوس کیا جیسے وہ کسی ربڑ کے گدے پر گر پڑا ہے۔ ڈوری ایک بار پوری طاقت سے اچھل کر بالے سمیت

صوفے پر گر پڑی تھی۔

''آیا، جلدی سے رسی لاؤ۔'' بالے نے ڈوری کے دونوں ہاتھ قابو میں رکھتے ہوئے آیا کو آواز دی، جو فوراً دوڑ کر رسی لینے چلی گئی۔

''حرام... ڈازہ۔'' وہ ہندوستانی میں گالی بکنے لگی۔ ''ام ڈونٹ روفی کھائیں گا۔ کھانسا ماں، کدھر... مرگئی آ... ٹم...''

پھر وہ دونوں پیر پٹک پٹک کر اچھلنے لگی۔ بالے حیران رہ گیا۔ وہ اب اپنے پتلے گلابی ہونٹوں کو سکوڑ کر سیٹی بجا رہی تھی۔ شاید انگریزی موسیقی کی کوئی دھن۔ پھر وہ ایک دم اتنی زور سے اچھلی کہ بالے فرش پر آ گرا اور وہ اس کی گرفت سے آزاد ہو گئی، غیر متوقع طور پر۔ اس سے پہلے کہ بالے فرش سے اٹھے، وہ منہ سے غراہٹ کی آوازیں نکالتی ہوئی خود ہی اس پر ٹوٹ پڑی۔ اور جب آیا ہاتھ میں رسی لیے دروازے میں داخل ہوئی تو اسے یہ دیکھ کر ہنسی آ گئی کہ بالے کے کوٹ کی ایک جیب لٹک گئی تھی، اس کی قمیض تار تار ہو رہی تھی اور سر کے بال نچے نظر آ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر ڈوری کے تیز ناخنوں کی خراشیں بھی پڑ گئی تھیں۔ عجیب حال تھا اس کا، لیکن اس بار اس نے ڈوری کے ہاتھ اس کی پشت پر کس لیے تھے۔ پھر اس نے اسے صوفے پر اوندھا گرا دیا۔ آیا رسی قریب لے آئی اور اس کے ہاتھ پیر کس دیے گئے۔ وہ شاید اب تھک چکی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی اس نے آنکھیں بند کر کے گردن ڈال دی۔

''آیا، تم یہاں ٹھہرو۔ میں ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔'' بالے اسے چھوڑ کر ہٹتے ہوئے بولا۔

''ڈاکٹر صاحب بھی تو نہیں آئے اب تک۔'' آیا نے تشویشناک لہجے میں کہا۔

''وہ... وہ اب کبھی نہ آئیں گے۔'' بالے نے آہستہ سے کہا۔

''کیا مطلب...؟'' آیا حیرت سے تقریباً چیخ اٹھی۔

''ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔''

"اوگاڈ..!" آپا دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر وہیں بیٹھ گئی۔

"ہیلو۔" بالے نے فون کا ریسیور اٹھا کر کہا۔ "کون ...؟ شیخ صاحب، ذرا اپنے پڑوس سے رؤف صاحب کو بلا دیجیے فون پر۔ شکریہ۔"

رؤف کو فون پر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ "ہیلو۔" اس کی آواز فون پر سنائی دی۔

"کیا آپ مونچھ خاں، آئی ایم ساری، رؤف خان بول رہے ہیں؟" بالے اس وقت چھیڑ سے باز نہ آیا اور ویسے بھی خان کی واپسی یا اس کی ہدایت آنے تک اسے فرصت ہی تھی۔ ڈوری کو تو قابو میں کیا جا چکا تھا۔

"اس طرح بڑوں کے منہ نہیں لگتے۔" رؤف نے بزرگانہ شان سے کہا۔

"لاحول ولا... میں اور تمہارا بوسہ لوں گا۔ لعنت اللہ علی العبد الروف غم۔"

"بالے صاحب، کسی دن میرا سر پھر جائے گا تو..."

"تو سیدھا پاگل خانے جاؤں گا۔" باقی جملہ بالے نے پورا کر دیا۔

"خدا سمجھے تم سے۔" رؤف بڑبڑایا۔ "آخر یہ آدھی رات کو سوجھی کیا ہے؟"

"آپ کی گھڑی بھی آپ کی طرح مریضِ غم معلوم ہوتی ہے۔ رات آدھی ہونے میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔"

"کچھ بکو گے بھی یا یوں ہی پریشان کرو گے؟"

"ہائے اس زود پریشان کا پریشان ہونا۔"

"یہ کیا لغویت ہے؟"

"لعنت نہیں ہے، شاعری ہے۔ خیر سنو، جمنا بائی اسٹریٹ، بنگلا نمبرے، یعنی ڈاکٹر بٹلر کے مکان پر فوراً ڈاکٹر بن کر پہنچ جاؤ۔ میک اپ کی ضرورت نہیں۔ صرف سوٹ اور بیگ کافی ہے۔"

"آخر کیا معاملہ ہے؟"

”ایک پاگل لڑکی۔“

”مجھے لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”ہونی بھی نہیں چاہیے۔ صوفی قسم کے لوگ ویسے ہی عین غین ہوتے ہیں۔ لیکن معاملہ سرکاری ہے، ذاتی ہوتا تو بالے صاحب اس پر آپ کی مونچھوں کا سایہ بھی نہ پڑنے دیتے۔“

”بہت بکنے لگے ہو۔ خیر، مگر مجھے وہاں کرنا کیا ہوگا؟“

”ناک پر انگلی رکھ کر ناچنا ہوگا۔ ارے، ڈاکٹر کا کام اور کیا ہوتا ہے۔ لڑکی کو دیکھ کر مشورہ دینا کہ اسے تمہارے اسپتال میں منتقل کردیا جائے۔ مرض خطرناک ہے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے، اس کے عزیز و اقارب بھی تو ہوں گے؟“

”صرف ایک ملازمہ ساتھ جائے گی، باقی کو میں سنبھال لوں گا۔“

”کہاں لے جاؤ گے؟“

”خان صاحب کے گھر۔“

”نا بھئی، میرے سر میں زیادہ بال نہیں۔“

”وہ ننگے پیر ہے۔ ویسے ذمے داری مجھ پر ہے۔“

”خان صاحب کچا کھا جائیں گے۔“

”وہ اگھوری نہیں ہیں۔ حالاں کہ خوب صورت لڑکیوں کا گوشت بڑا لذیذ ہوتا ہے۔“

”میں آرہا ہوں، لیکن معاملے کی نزاکت ایک بار پھر سمجھ لو۔“

”معاملے کی تو سمجھ لی، اب تمہاری نزاکت سمجھ رہا ہوں۔“

☆☆☆☆☆☆

”کیا بے ہودگی ہے؟“

”بے ہودگی نہیں لڑکی ہے۔“

”تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے؟ یہاں کیوں لائے ہو کسی لڑکی کو؟“

”میں سمجھا تھا آپ گھر پر نہ ہوں گے اس لیے پیٹ بھر کے رومانس کروں گا۔“

”بکومت، ورنہ کان پکڑ کر باہر نکال دوں گا۔“

”میں بکرا نہیں ہوں۔ ویسے آپ خفا ہوتے ہیں تو لے جاتا ہوں۔ بے چاری یتیم بچی، مس ڈوری۔“

”ڈوری...!“ خان چونک پڑا۔

”بھائی حرام مونچھ بھی باہر کھڑے ہیں۔ ڈر کے مارے اندر نہیں آتے۔“

”لیکن تم اسے یہاں کیوں لائے؟“

”میں نے سوچا شاید آپ اس کی تشہیر پسند نہ کریں۔“

”اوہ.. ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ اچھا ہی کیا، مگر وہ اسپتال جائے گی۔“

”یعنی یہ کیا بات ہوئی؟“

”قانونی طور پر ہم اسے یہاں نہیں رکھ سکتے، لیکن یہ خطرناک کھیل بھی ہمیں کھیلنا ہی پڑے گا۔“ خان کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”آپ کافی سنجیدہ نظر آ رہے ہیں اس وقت۔“

”بڑی خطرناک سازش سے پالا پڑا ہے، بیٹے۔ ایسے عیار لوگ میری نظر سے پہلے کبھی نہیں گزرے۔“

”تو کیا آپ شکست تسلیم کر رہے ہیں؟“

”خیر، شکست تو ہمیشہ برائی کی طاقتوں کی ہوا کرتی ہے۔ ان کی آج کی جیت ہی ان کی شکست کا آغاز ہے۔“

"آپ معمے بعد میں بھی بنا سکتے یں، سردست اس نازک اندام پاگل کے لیے کیا ارشاد ہے؟"

"اسے کارپوریشن کے مضافاتی اسپتال پہنچا دیا جائے گا۔"

"وہ کیوں؟"

"اور ایک ڈوری گورنمنٹ اسپتال میں بھی رہے گی۔"

"خاکسار الو کا پٹھا ہے۔ آپ ہی سمجھا دیجیے۔"

"خود سمجھ جاؤ گے، مگر ٹھہرو۔ میں ڈی آئی جی صاحب کی اجازت بھی لے لوں، معاملہ بڑے لوگوں کا ہے۔"

"بہتر ہے۔ میں اس بڑی بڑی مونچھوں والے بچے کو تسلی دیتا ہوں۔ سردی میں کھڑا بھیگ رہا ہوگا۔"

"رؤف کا ڈاکٹر بننا بھی اچھا ہی ہوا۔ ورنہ کوئی ڈاکٹر ہی بلا لیا جاتا تو شاید ہم اس پروگرام کو عملی جامہ نہ پہنا سکتے۔"

"پاجامہ نہ پہنا سکتے تو پتلون پہنا دیتے۔" بالے نے ڈھٹائی سے کہا۔

"نو بکواس۔"

"سبحان اللہ، کیا اردو ہے۔ آپ داستانِ امیر حمزہ معلوم ہو رہے ہیں۔"

"شامت آ رہی ہے کیا؟" خان اسے گھورتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ پھر وہ ڈی آئی جی کو فون کر کے اسی وقت لوٹ آیا۔ اس نے فون پر انسپکٹر ڈیسوزا کو بھی نیند سے جگا کر بلوا لیا تھا۔ رات ابھی زیادہ نہ گئی تھی۔ ورنہ ڈی آئی جی بھی شاید سو گئے ہوتے۔

ڈیسوزا کے آتے ی خان نے رؤف اور ڈیسوزا کو ڈوری سمیت اپنی کار میں ہی مضافاتی کیکابائی اسپتال روانہ کر دیا۔ آیا ڈیسوزا کی وردی دیکھ کر ہی سہم گئی۔ خان نے اسے یہ کہہ کر روک لیا کہ تمھیں بعد میں مریضہ کے پاس پہنچا دیا جائے گا، بشرطیکہ ڈاکٹر نے اجازت

دی، کیوں کہ وہ پاگل ہو گئی ہے اور پاگل کے پاس کسی کا رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ رؤف اور بالے اسے محض دوسرے نوکروں کو مطمئن کرنے کے لیے ساتھ لے آئے تھے، تا کہ انھیں ڈوری کے اکیلے لے جائے جانے پر کوئی شک نہ ہو۔ ویسے بالے نے انھیں یہ بتا دیا تھا کہ وہ پولیس آفیسر ہے۔ اب خان اور بالے تنہا رہ گئے۔ خان نے آیا کو ایک دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ملازم غلام رسول کو بلوایا۔ اس کے نوکر رات کو اس وقت تک جاگتے رہتے تھے جب تک کہ وہ گھر میں ہوتا اور سویا نہ ہوتا۔ ایک چھوٹے سے کاغذ پر خان نے کچھ لکھ کر اسے دے دیا۔

"ٹیکسی لے کر فوراً جاؤ اور اسے اپنے ساتھ لے کر آؤ۔" خان نے اسے ہدایت کی۔

"اچھا، صاحب۔" غلام رسول پرچہ سنبھالتا ہوا باہر نکل گیا۔

"آپ کچھ گھٹالا کر رہے ہیں۔"

"محض ایک معمولی سی چال۔ وہ نامعلوم لوگ بڑی چالاکی سے ہماری دسترس سے نکل گئے ہیں اور اب صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم ان کا کوئی سراغ حاصل کر سکیں گے۔"

"آپ وہاں سے غائب کدھر ہو گئے تھے اور وہ فائر؟"

"ڈوری کو کسی دوا یا انجیکشن سے پاگل کیا گیا ہے، ممکن ہے وہ اس سلسلے میں کچھ جانتی رہی ہو یا شاید اس کی وجہ سے انھیں اپنے کسی آدمی کے پہچانے جانے کا خطرہ ہو۔ بہر حال مس بورکر کی اطلاع صحیح تھی۔ ایک آدمی ضرور ڈوری کا تعاقب کرتا ہوا اس بنگلے میں داخل ہوا تھا اور ڈوری کے اس طرح اچانک پاگل ہو جانے کا ذمہ دار بھی وہی ہوگا۔ بہر حال جس وقت میں تمھیں اندر بھیج کر برآمدے سے ہوتا ہوا عمارت کے پچھلے حصے کی طرف جانے لگا، اسی وقت ایک کھٹکے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ آواز اوپر کی طرف سے آئی تھی۔ میں دیوار سے ہٹ کر نیچے

کے موگروں کے پودوں کے درمیان لیٹ گیا اور وہاں سے میں نے دیکھا مکان کی چھت پر کوئی سیاہ سا سایہ موجود تھا۔ وہ شاید ٹائلز میں لگے ہوئے شیشے کے روشن دان سے اندر جھانک رہا ہوگا۔ ممکن ہے ڈوری پر اپنی کاروائی کا ردِ عمل دیکھنے کے لیے۔“

”ممکن ہے کہ وہ کوئی بدنصیب عاشق رہا ہو جو اسے چھپ کر دیکھنے آیا ہو۔“

”میں ایک ہاتھ جڑ دوں گا۔ بے موقع بکواس اچھی نہیں لگتی۔“

”تو پھر کیسے کہہ سکتے ہیں آپ کہ وہ یہی دیکھنے کے لیے وہاں موجود تھا۔؟“

”اس انجکشن کے ردِ عمل میں کچھ وقفہ لگتا ہوگا اور یقیناً وہ اس کی تصدیق کرنے کے لیے ہی ٹھہرا رہا ہوگا۔ لیکن جیسے ہی میں پیٹ کے ذریعے چڑھ کر اوپر پہنچا، وہ بلی جیسی تیزی سے پلٹ کر بھاگا اور قبل اس کے کہ میں ریوالور نکالوں وہ پورٹیکو کے چھت پر کود چکا تھا۔“

”تو آپ نے اس پر فائر کیا تھا؟“

”ہاں۔ محض فرار سے روکنے کے لیے، لیکن وہ رکا نہیں۔ سڑک سے کچھ فاصلے پر ایک کالے رنگ کی گاڑی پہلے سے موجود تھی، وہ شاید اسی کی رہی ہو۔“

”لیکن آپ تو گاڑی لے کر اس کے پیچھے گئے تھے؟“

”ہُم... ایک کوشش جو ناکام ہوگئی۔“

”کیوں؟“

”وہی حادثہ۔“

”یعنی دھماکا...؟“

”ہاں۔ لیکن اس بار کار میں آگ نہیں لگی۔ اس کے سینے پر صرف تین گولیاں لگی تھیں۔“

”کہاں، آسمان سے؟“

”کار کے ڈیش بورڈ سے۔ جو کوئی بھی طاقت اس اندھیر کے پسِ پردہ ہو، یہ تسلیم

کرنا پڑے گا کہ بہت محتاط اور بہت چالاک ہے ۔ وہ اپنا کام نکالنے کے بعد ثبوت اور سراغ کے ہر امکان ہو ختم کر دیتی ہے ۔"

"کیا وہ فوراً مر گیا؟"

"ظاہر ہے کہ تین گولیوں نے اسے سسکنے کا بھی موقع نہ دیا ہوگا ۔"

"تو پھر آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ ڈوری کو انجیکشن دیا گیا ہے؟"

"اس کی جیب سے ایک زرد رنگ کا ٹیوب اور شیشے کا سرنج برآمد ہوا تھا ۔ وہ دونوں چیزیں میرے پاس محفوظ ہیں ۔"

"ڈیش بورڈ بھی اب فائرنگ فرمانے لگے ۔ واہ ری حیرت ۔"

"کار میں ٹرانسمیٹر نصب تھا، ہو سکتا ہے کہ اس آدمی کو اپنے نامعلوم باس کی کوئی ایسی ہدایت ملی ہو جس پر نادانستگی میں عمل کرنے سے اس کا یہ حشر ہوا ہو ۔ ڈیش بورڈ میں اندر کی طرف ایک اسٹیل بکس میں آٹو میٹک سسٹم کا پستول نصب کیا ہوا ملا ہے ۔ اور اس کے ٹرائیگر سے ایک تار نصب تھا جو کار کے ایک درخت سے ٹکرانے پر ٹوٹ کر علاحدہ ہو چکا تھا ۔ یہ تینوں فائر اسی پستول سے متواتر ہوئے ہوں گے، لیکن فائرنگ کے دوران پستول پر دھماکے کے نشانے میں تھوڑا سا فاصلہ پیدا کرتی رہی ہوگی ۔"

"باپ رے تو اب کی بار مجھے اپنا ڈبل بیمہ کرا لینا چاہیے؟"

دوسرے دن صبح کے اخبارات میں جہاں ڈاکٹر بٹلر کی موت کو حادثے سے تعبیر کرتے ہوئے اس پر اظہار افسوس کیا تھا تھا وہیں ان کی لڑکی، مس ڈوری، کا تذکرہ بھی مختلف ڈھنگ سے تھا ۔ ان خبروں میں لکھا تھا کہ باپ کی اچانک اور اندوہناک موت سے بیٹی کے دل و دماغ پر ایسا صدمہ پہنچایا کہ وہ پاگل ہو گئی ۔ ڈوری اس وقت گورنمنٹ اسپتال میں زیر علاج ہے اور رات سے اب تک اس کی حالت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا ہے ۔

"یہ ڈبل ڈوری سسٹم اپنے پلے نہیں پڑا کچھ؟" بالے نے مارننگ اسٹینڈرڈ ایک

طرف رکھتے ہوئے خان سے کہا۔

"خدا کے یہاں جب عقل بٹ رہی تھی تو تم کہاں تھے؟"

"میں ڈبلوسی گیا ہوا تھا۔"

"مجھے گری ہوئی باتیں بالکل پسند نہیں۔"

"یہ گروہ پڑوں کا ہی زمانہ ہے، قبلہ۔ آپ شاید جمہوریت کے قائل نہیں ہیں۔"

"شروع ہو گئے بس۔"

"برسبیل تذکرہ عرض کر رہا تھا۔ لیکن یہ تذکرہ کی سبیل کہاں لگتی ہوگی۔ میں نے محرم میں تو صرف پانی کی لگتی دیکھی ہے۔"

"بکواس پھر کرنا، تمہیں اب گورنمنٹ اسپتال پہنچ جانا چاہیے۔ وہ اسپیشل وارڈ نمبر دو میں ہے، جس میں تین بیڈ اور ہیں۔ اور ان تین میں سے ایک بیڈ تمہارے لیے مخصوص ہے۔"

"میرے لیے؟" بالے حیرت سے اچھل پڑا۔ "یعنی کہ میں ہٹا کٹا، الو کا پٹھا، بقول کسی کے، اور آپ مجھے زبردستی اسپتال میں داخل فرما رہے ہیں؟"

"جو کہا جا رہا ہے، وہ کرو۔ فضول کی بحث نہیں۔"

"چہ خوب۔ گرد پر چھری رکھ کر کہتے ہیں کہ فریاد نہ کر۔"

"پھر شعر نازل ہونے لگا تم پر۔"

"لیکن اس زبردستی کی بھرتی کا سبب بھی تو بتایئے؟ آخر مجھے کیا مرض ہے؟"

"مرض تم فرض کر لینا۔ بلکہ کسی فوری اثر یا صدمے سے پاگل ہو جانے والے مریض کی حیثیت سے تم اچھے رہو گے۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ تمہاری زبان نہ مانے گی۔"

"میں احتجاج کرتا ہوں اس اسپتال بازی پر۔"

"اور ابھی تمہاری کھوپڑی احتجاج کرنے لگے گی میری گھونسا بازی پر۔"

"اوگاڈ، تو سب کچھ بنانا، مگر کسی فرعون کا اسسٹنٹ نہ بنانا کسی شریف آدمی کو۔"

"جاؤ، دیر ہو رہی ہے۔ پہلے تم سیدھے ڈاکٹر باسو کے پاس جانا۔ وہ بحیثیت مریض تمہیں وہاں تک پہنچانے کا سب انتظام کر دیں گے۔"

"دوا دارو کا بھی؟"

"دارو وہاں نہیں ملتی ہے، دوا مل جائے گی۔"

"اس اسپتال کی نرسیں بوڑھی ہیں یا جوان؟"

"وہ سب اونچی ایڑی کے سینڈل پہنتی ہیں۔"

"آپ اپنا تجربہ ارشاد فرما رہے ہیں، شاید؟"

"اب تم ٹلو گے نہیں یہاں سے؟"

"میں یہیں سے کسی نہ کسی نرس کے نام پر عاشق ہو کر جاتا ہوں تا کہ وہاں رحلت فرمانے میں زیادہ اذیت نہ ہو۔"

"صاحب، ڈیسوزا صاحب۔" نوکر نے درمیان میں آ کر ٹوک دیا۔ اور بالے کو اب کھسکنا ہی پڑا۔ وہ ڈیسوزا کی موجودگی میں خود بور ہونے لگتا تھا۔ کیوں کہ ڈیسوزا کی عادت صرف کام کی باتیں کرنے کی تھی، جو ظاہر ہے کہ ایک پولیس رپورٹ کی طرح خشک سی ہوتیں۔ وہ سیدھا سادا، مگر محنتی آفیسر تھا۔ بالے اگر اسے زبردستی چھیڑنے کی بھی کوشش کرتا وہ وہ بلا مقابلہ ہتھیار ڈالنے والے انداز میں صرف مسکرا دیتا۔ ویسے خان کے پروگرام کے مطابق اسے اب ڈاکٹر باسو کے پاس چلا جانا چاہیے تھا۔

باہر نکل کر اس نے اپنی موٹر سائیکل نکلوائی اور لاپروائی کے انداز میں سیٹی بجاتا ہوا جیسے ہی اس پر سوار ہونے لگا، کسی کی آواز نے اسے چونکا دیا اور اس کی طرف دیکھتے ہی بالے نے کسی گوریلے کے انداز میں اپنے دانت نکال دیے۔ یہ چپی تھا، بندر کا بچہ، جسے بالے رائے سینا کے محل سے لایا تھا۔ بندر کا یہ بچہ جس نے اس کے ٹارزن بنے میں رہی سہی کسر بھی کر دی تھی، النگا کے اسرار والے کیس میں بھی اس کا ہم سفر رہا تھا اور راجہ سندری سے واپس لوٹنے کے

بعد سے تو بالے نے اسے باقاعدہ ٹریننگ دینی شروع کر دی تھی۔ ابتدائی تربیت تو صرف بچوں کے ہاتھوں سے کھانے کی چیزیں اچک لینے تک تھی، لیکن اب وہ اسے باقاعدہ ڈکیتی سکھا رہا تھا۔ مثلاً کسی عورت یا لڑکی کے سامنے پہنچ کر اسے دانت دکھا کر اپنی خوں خوں سے ڈرا دیتا اور ھرکم از کم اس کا رومال چھین کر لے آتا۔ ایک بار اس نے سپرنٹنڈنت کان کے سامنے سے ایک خوب صورت سی لڑکی کی تصویر بھی غائب کرا دی تھی، جو شاید کسی کیس کے سلسلے میں خان تک پہنچی تھی اور وہ اسے ہاتھ میں تھامے دیکھ رہا تھا۔ اس دن اس حرکت کے عوض بالے اور اس کے چپی دونوں کی مالکوشی ہوئی تھی۔ لیکن وہ باز آنے والے استاد و شاگرد نہ تھے۔ بالے کے پاس آ کر چپی کا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ وہ کیسعاک کی مدد سے ایک پتلون اور ایک آدھی آستیوں والی قمیض تو ہر وقت اس بھورے بندر کے بدن پر چڑھی رہتی اور اوپر سے سر پر الاسٹک کے فیتے سے کسا ہوا ایک چھوٹا سا فلیٹ ہیٹ جو بالے نے خاص طور پر اسی چھوٹی سی کھوپڑی کے لیے بنوایا تھا۔ شروع شروع میں تو اپنے آبا و اجداد کی طرح ننگے رہنے والے اس بندر کے بچے نے بالے کا کافی نقصان یا۔ کئی کئی سوٹ چندھیوں میں بدل دیے، لیکن مار بری چیز ہے۔ آخر اسے ان چیزوں کا عادی ہونا پڑا اور اب وہ بقول بالے پوری طرح ایک مہذب شہری بن چکا تھا۔ گھر پر فرصت کے اوقات میں جب دل جوئی کو کوئی نہ ہوتا تو یہی مہذب شہری اس کا شریکِ غم رہتا۔ کچھ سوچ کر بالے موٹر سائیکل سے اتر گیا۔ اس نے اندر جا کر بید کی بنی ہوئی ایک باسکٹ اٹھائی اور چپی کو بلا کر چمکارتے ہوئے اس کے اندر بند کر دیا، پھر اس نے وہ ڈلیا موٹر سائیکل پر لٹکا لی اور روانہ ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆

کرنل زپاٹا

''مریض نمبر۴، کیا میں پاگل ہوں؟'' گورنمنٹ اسپتال کے اسپیشل وارڈ نمبر۲ کے تیسرے بیڈ سے ایک مترنم آواز سنائی دی۔ وہ ڈوری تھی۔

''تم پاگل، تمہارے فرشتے پاگل، تمہارے وغیرہ وغیرہ سب پاگل۔'' مریض نمبر۴ نے اپنے بیڈ سے سر اٹھا کر کہا۔

''ہائیں تو کیا میں پاگل ہوں؟'' ڈوری نے حیرت سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''میرا دماغ مت چاٹو، وہ امرود کی چٹنی نہیں ہے۔'' مریض نمبر۴ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''اے چیں پوں، یہ تاج محل ہوٹل ہے، تمہارے باپ کا گھر نہیں ہے۔'' دوسرے بیڈ کے مریض نے غراتے ہوئے لہجے میں اسے ڈانٹ سنائی۔

''ہونہہ... تم بھی پاگل۔ یہ تاج محل ہوٹل ہے یا چنڈو خانہ؟ خدائے تعالیٰ نے تمہیں ناک کان نہیں دیے ہیں کہا جو دیکھ سکو؟'' پہلا مریض بھی بولے بغیر نہ رہ سکا۔

''اف فوہ۔ تم سب ایڈیٹ ہو۔'' ڈوری انہیں غصیلی نظروں سے دیکھ کر بڑبڑائی۔

''آرڈر... آرڈر...'' مریض نمبر۴ نے چیخ کر کہا۔ ''بھائیو، یہ بوڑھی عورت ہمیں ڈیوٹ بنا رہی ہے۔''

''ہائیں...، ڈیوٹ... اور ہم۔'' مریض نمبر۲ اور نمبر۱ نے آنکھیں پھاڑ کر حسرت ناک لہجے میں کہا اور پھر دم سادھ کر اپنے تکیوں پر گر پڑے، جیسے انھیں بڑا شاک لگا ہو۔

''میں... بوڑھی عورت...؟'' ڈوری نے عجیب سے لہجے میں دہرایا۔ ''او بڈھے، میں آج رات تیرا گلا دبا دوں گا۔'' ڈوری نے مریض نمر۴ کو چیلنج کیا۔

"اوہاہاہا... اوہاہاہاہا... ایہہ... ہی ہی ہی ہی... ہوا وا وا وا وا ف۔" مریض نمبر۴ کے قہقہے کمرے میں گونجنے لگے، جنہیں سنتے ہی بیڈ نمبر۲ اور نمبر۱ کے مریض گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور بڑی تیزی سے اپنے بستروں سے اچک کر اپنی پلنگوں کے نیچے گھس گئے۔

"زلزلہ آیا ہے۔" نمبر۱ نے نمبر۲ سے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

"ہائے تو میرے سالے سالیاں؟" نمبر۲ نے کانپتی ہوئی آواز میں دہرایا۔

"ابے چپ، دیکھتا نہیں مکان ہل رہا ہے۔" نمبر۲ نے اسے ڈانٹ دیا۔

"سچ مچ پاگل؟" ڈوری نمبر۴ کو ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

"خبردار جو مجھے پاگل کہا ہے۔" نمبر۴ نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "میرا باپ انڈونیشیا کا سب سے بڑا لیڈی ڈاکٹر تھا۔"

"ہی ہی ہی ہی الیف..." ڈوری ہنس پڑی۔ "باپ ہوتے ہی کہاں ہیں۔" اس نے گویا نمبر۴ کی حماقت کا مذاق اڑایا۔

"ہوتے کیوں نہیں؟... ہمالہ کی ترائی میں پیدا ہوتے ہیں۔ میں نے پاکٹر ایشوری پرشاد کے جغرافیہ میں پڑھا ہے۔" نمبر۴ نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ لیکن اسی وقت اندر داخل ہوتے ہوئے ایک ڈاکٹر کو دیکھ کر ان کی توجہ بٹ گئی۔ ڈاکٹر سعید بٹ سوٹ میں ملبوس تھا۔ اسٹیتھسکوپ اس کے گلے میں لٹک رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایم تن درست سا سانولا باس آدمی اور تھا۔

"اے بیرا، ہمارا ناشتا کہاں ہے؟" مریض نمبر۴ نے ڈاکٹر کو دیکھ کر غصے سے پوچھا۔ ڈاکٹر کو دیکھتے ہی نمبر۱ اور ۲ بھی پلنگوں کے نیچے سے نکل آئے اور ڈاکٹر کے دونوں طرف کھڑے ہو کر بڑے غور سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ پھر ان دونوں نے ڈاکٹر کے آگے پیچھے پورا ایک راؤنڈ لگایا اور بندر کی طرح دانت نکال کر ہنس دیے۔

"رام نرائن نے سیا ہوگا۔" نمبر۱ نے ۲ سے کہا۔

"ہونہہ..." دوسرے نے منہ بنایا۔ پھر وہ ڈاکٹر کے قریب پہنچ کر بولا۔ "ٹیکسی کہاں ہے؟ ساتھ کیوں نہیں لائے؟ معلوم نہیں ہم کو سسرال جانا ہے؟ وہاں ہمارے سالے سالیاں..." نمبر۲ نے ڈاکٹر سے کہنا چاہا۔ مگر نمبر۱ نے بات کاٹ دی۔

"تیری سالیوں کی ایسی تیسی، میری ساس ان سے اچھی ہے۔"

"ہُم... غرررراپ..." نمبر۲ نے سینہ اور گال پھلا کر کسی بل ٹیریر کی طرح غرایا۔

"یہ یہاں کا ایک دولت مند آدمی ہے۔ ایک کار ایکسیڈنٹ میں اس کی بیوی اور سالے سالیاں ہلاک ہو گئے ہیں، جس کے صدمے کا اثر اس کے دماغ پر پڑا ہے۔" ڈاکٹر نے اپنے ساتھی کو بتایا۔ وہ یا تو اس کا اسسٹنٹ تھا یا محکمہ صحت کا کوئی آدمی۔

"بے چارہ..." اس نے سر ہلا کر اظہارِ افسوس کیا۔ لیکن نمبر۴ نے اس کا جملہ سن لیا۔

"ہیرا..." وہ چیخ کر بولا۔ "صاحب کو چارہ لاؤ۔"

ڈاکٹر اور اس کا ساتھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"تو یہ ہے وہ نیا مریض، جسے ڈاکٹر باسو نے بھرتی کرایا ہے۔" ڈاکٹر یہ کہتا ہوا نمبر۴ کی طرف بڑھا۔

"تمہارا نام؟" ڈاکٹر نے قریب آ کر سنجیدگی سے سوال کیا۔

"بوم تڑاکا، باپ کا نام دھوم دھڑاکا، دادا کا نام مار جٹا خا، پر دادا کا نام سین سٹا خا۔" بمبر۴ نے بڑی سنجیدگی سے بولنا شروع کر دیا۔

"بس بس۔" ڈاکٹر نے مسکرا کر اسے روک دیا۔

"نہیں، میں اپنا پورا شجرہ سناؤں گا۔ میں افراسیاب جادوگر کی ایک ہزار دو سو پچاسویں اولاد ہوں، تمہیں جادو کے زور سے چھچھوندر بنا سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے نعرہ لگایا۔ "یا سامری، ڈھوڈا مری، یا جمشید تیرا باپ سفید، بنا دے اس ہیرے کو کھجور کا درخت بیچ ریگستان کے۔ جے جے کالی، مہا کالی، کو بھائی کی سالی، میرا پیٹ خالی، بھیج کوئی موالی، چھو چھو چھو آ چ

چھو...آج چھو...بن جا بیٹا مرغا، بول پیاؤں پیاؤں۔" یہ کہہ کر اس نے اچانک ڈاکٹر کی گردن تھام لی اور اسے جھکانا چاہا، لیکن ڈاکٹر نے قبل اس کے کہ اس کا ساتھی دخل دے ایک ہاتھ سے بڑی نرمی سے اپنی گردن چھڑا کر نمبر ۴ کو اس کے بستر پر دھکیل دیا۔

"ارے...ارے...تو...تو تو...تم بھی جادوگر ہو، کیا نام ہے تمہارا؟"

لیکن ڈاکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تیسرے بیڈ پر چپ چاپ اٹھ کر بیٹھی ہوئی ڈوری کی طرف بڑھ گیا۔ ڈوری اپنی پھیلی پھیلی حیران آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی ڈاکٹر قریب پہنچا، وہ اپنی جگہ سے اچھلی اور دونوں ہاتھ ڈاکٹر کے گلے میں ڈال کر لٹک گئی۔

"ڈیڈی، تم آ گئے، ڈیڈی۔" وہ بچوں کی طرح مچل کر کہنے لگی۔ "یہ بڈھا کتنی دیر سے گھور رہا تھا۔" اس نے نمبر ۴ کی طرف اشارہ کیا۔

ڈاکٹر نے بڑی آہستگی سے اس کے دونوں ہاتھ اپنی گردن سے علاحدہ کر کے اسے اس کے بیڈ پر لٹا دیا۔

"ڈیڈی، یہ لوگ کہتے ہیں میں پاگل ہوں۔ کیا میں پاگل ہوں، ڈیڈی؟" ڈوری نے معصومیت سے پوچھا۔

"نہیں، بیٹی۔ تم کو پاگل کہنے والےکود پاگل ہیں۔ تم لیٹ جاؤ۔" ڈاکٹر نے مشفقانہ انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"ہائیں، ہم پاگل ہیں؟" نمبر ۱، نمبر ۲ اوز نمبر ۴ ہم آاز ہو کر حیرت سے بولے۔

"مجھے اس نمبر ۴ پر کچھ شک ہو رہا ہے۔" ڈاکٹر کا ساتھ آہستہ سے بولا۔

"آؤ دیکھ لیتے ہیں۔" ڈاکٹر یہ کہہ کر نمبر ۴ کی طرف پلٹا جو انھیں اپنی طرف آتے دیکھ کر کمبل سر پر کھینچ کر لیٹ گیا تھا۔

"ابھی ہم سو رہے ہیں، خبردار جو ہمیں چھیڑا کسی نے۔" وہ اندر ہی اندر بڑبڑایا۔

"ڈیڈی، ہائے تم جا رہے ہو اور مجھے مرغے کی ایک ٹانگ کون لا کر دے گا؟"

مریضہ نمبر۳ نے روندھتی سی آواز میں اسے پیچھے سے ٹوکا۔

”ہم آتے میں ہیں ابھی، بیٹی۔“

”ٹی...؟ ٹی نہیں... مجھے مرغے کی ایک ٹانگ چاہیے۔ میں اس سے پولو گراؤنڈ پر ہاکی کھلوں گی۔“ ڈوری نے بچوں کی طرح مچلتے ہوئے وہیں سے ضد کی۔

”ہم وہی تو لینے جا رہے ہیں۔“ ڈاکٹر کے ساتھی نے چلتے چلتے رک کر اسے دلاسا دیا۔

”جا رہے ہو؟ اچھا جاؤ، خدا آفس، ڈیڈی سور۔“ یہ کہہ کر وہ تکیے میں منہ لپیٹ کر پڑ رہی۔ ڈاکٹر اور اس کا ساتھ اب نمبر۴ کے پلنگ کے قریب آ گئے تھے۔

”اے مسٹر...“ ڈاکٹر نے اس کا کمبل الٹنے کی کوشش کرتے ہوئے آواز دی۔ وہ اندر سے دونوں ہاتھوں سے کمبل اپنے اوپر جکڑے ہوئے تھا۔

”ڈڑ مت لگاؤ، یہ برسات نہیں ہے۔ ہم ابھی غسل فرما رہے ہیں۔“

لیکن ڈاکٹر نے اس کا کمبل الٹ دیا۔ وہ اچانک منہ بنا کر رونے لگا۔

”ہائے، تم نے مجھے ننگا کر دیا سب کے سامنے۔ خدا تمھیں غارت کرے، حرام زادوں، نامحرم۔ ہائے میری عزت، میری عصمت، میری عفت، میری عدت ودت وغیرہ وغیرہ۔ ارے نالائقو، اب کون سی لونڈیا مجھ الو کے پٹھے سے شادی کرے گی۔ میں ننگا ہو گیا۔“

لیکن ڈاکٹر اور اس کے ساتھی کے لبوں پر مسکراہٹ کا نام تک نہ تھا۔ وہ گہری نظر سے اس کی اس حرکت کو دیکھ رہے تھے۔ البتہ نمبر۲ اور نمبر۱ کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ پھر ایک دوسرے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگے، جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھ رہے ہوں کہ یہ کیا ظلم ہو رہا ہے۔ کچھ جواب دینے کی بجائے ڈاکٹر کی نظر نمبر۴ کے بستر کے ایک پھولے ہوئے کونے پر پڑ گئی۔

”یہ کیا ہے؟“

"یہ میرا خالا زاد بھائی ہے، تمہارا چچا لگے گا۔" نمبر۴ نے اسے اور چھپاتے ہوئے کہا۔

"یہ آدمی مجھے پاگل نہیں معلوم ہوتا۔" ڈاکٹر کا ساتھی اس سے بولا۔

"کون پاگل؟ پاگل تم، تمہارا باپ، اس کا بھی باپ اور اس کا بھی باپ۔ یعنی کہ تمہارے خاندان میں جتنے بھی باپ گزرے ہیں سب پاگل۔" نمبر۴ بری طرح بگڑ گیا۔

"ہمیں دکھاؤ، یہ پھولی ہوئی چیز کیا ہے؟"

"میرا بھائی دو دن سے روتے روتے ابھی سویا ہے، تم اسے جگاؤ گے تو تم پر قدرت کا عذاب نازل ہوگا۔"

"دکھاؤ ہمیں، ورنہ ہم زبردستی دیکھیں گے۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر نے خود کمبل کا وہ حصہ بھی الٹ دیا، جس کے ہٹتے ہی کوئی چیز اچھل کر اس پر آ پڑی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

بندر کا ایک بچہ، جس نے اپنے بھورے بدن پر سفید سوٹ پہن رکھا تھا اور جس کے سر پر فیلٹ ہیٹ کسی ہوئی تھی، اپنے دانتوں کی نمائش کرتا 'چیں چیں' کی ایک سلیک کے ساتھ ڈاکٹر پر آ گرا۔ وہ اور اس کا ساتھی دونوں پیچھے ہٹ گئے اور وہ پھر اچک کر پلنگ کے کنارے آ بیٹھا۔

"نہیں، کرنل زپاٹا، یہ بیرا ثریف آدمی معلوم ہوتا ہے۔" نمبر۴ نے بندر کے بچے کو پکڑ کر چمکارتے ہوئے کہا۔

"کرنل زپاٹا؟" ڈاکٹر کے ساتھی نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں۔ تم کیا جانو اسے، دم دار انسان بننے سے پہلے یہ نمبر۱۳ راجپوتانہ رائفلز میں لفٹنٹ کرنل تھا۔ ہائے، میرا بھائی۔" نمبر۴ نے صورت اور آواز دونوں روندھی بنا کر بندر کے بچے کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔

"اور اب کیا ہے؟"

”اب بھی کرنل ہے، مگر دم دار ہے، کم بخت۔“

”لطیفہ خوب ہے۔“ ڈاکٹر معنی خیز انداز میں ساتھی کی طرف گھوم کر بولا۔

”لطیفے ہوں گے کوئی عبداللطیف، یہ مجھ بد نصیب کا ایک ہی نورِ چشمی بھائی ہے۔“ وہ چہرے پر قطعی سنجیدگی اور معصومیت کے آثار پیدا کرتے ہوئے بولا۔ نمبر۱ اور نمبر۲ بڑی توجہ کے ساتھ اپنے کان اس طرف لگائے سن رہے تھے اور ڈوری تکیے سے منہ چھپائے سسکیاں لے رہی تھی۔ وہ دونوں بار بار اظہارِ افسوس کے لیے منہ سے 'چچ چچ' کی آوازیں نکالتے جاتے۔

”سندباد، الو کے پٹھے، نے یہ داستانِ نازک بیان نہ بتائی ہوگی دنیا والوں کو۔ مگر کلیجہ شق اور منہ فق ہوتا ہے یہ کہتے ہوئے کہ...“ یہ کہتے کہتے نمبر۴ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور دو چار سسکیاں لے کر وہ پھر کہنے لگا۔ ”میرا یہ بھائی، جو کرنل تھا، ایک جادوگرنی عاشق ہوگئی تھی اس پر، اچھا سا نام ہے اس چڑیل کا... ہاں، پولسن کافی اینڈ بٹر۔ میرا کرنل زپاٹا سٹس تو ہوگیا، مگر مس نہ ہوا تو اس نے گھا سلیٹ کے تیل پر آکاش وانی کے چار اشلوک پڑھ کر ایسے مارے کہ بے چارے کے دم اگ آئی اور لہجہ بدل گیا۔ ہائے اخروٹ، میرا بے چارہ، ز... پا...ٹا...“ یہ کہہ کر اس نے بندر کے بچے کو زور سے اپنے بازو میں دبا لیا۔ مگر بالآخر وہ بندر تھا، نمبر۴ کی اس ناشائستہ حرکت پر اسے غصہ آگیا۔ اس نے دانت نکال کر ایک بار 'خوں خپ' کی دھمکی دی اور پھر ڈاکٹر کے اسٹیتھسکوپ میں لٹک کر جھولا جھولنے لگا۔

”یہ... یہ کیا بدتمیزی ہے؟“ ڈاکٹر نے اسے دور ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے نمبر۴ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”پرانی عادت ہے۔ اس کے بیوی بچے اسے روز پالنے میں جھولا جھلاتے تھے، مگر ہائے اب تو لنڈورا رہ گیا کم بخت۔ کون پوچھے گا دو ٹکے کو۔ چل آجا... پوچ...“ بندر کے بچے کو چمکارتے ہوئے اس نے پھر اپنی گود میں لے لیا۔

”یہ... یہ تمہارا بھائی ہے؟“ نمبر۱ نے بڑی عقل مندی سے نمبر۴ سے سوال کیا۔

"اور نہیں تو کیا، تمہارا باپ ہے۔" نمبر۴ اس پر بگڑ گیا۔

"ہشت، باپ ہوتے ہی نہیں ہیں۔ ہی ہی ہی..." بیڈ نمبر۲ سے ڈوری کی آواز مداخلت کرتی سنائی دی۔

"ارے واہ۔" نمبر۲ بھی بول پڑا۔ "ایسے کیسے۔ میرے بھائی کا تو باپ تھا۔"

"تم جھوٹے ہو۔" نمبر۱ نے اسے ڈانٹا۔ "باپ تو تمہارے باپ کا بھی نہیں تھا۔ مگر تم نے میری سالیوں کو دیکھا ہے؟"

ڈاکٹر اب رخ پھیر کر نمبر۲ کی طرف مخاطب ہو گیا۔ یہ دیکھتے ہی نمبر۱ دوڑ کر اس کے پیچھے آیا اور ایک تاگا جیب سے نکال کر اسے ڈاکٹر کے کوٹ کے پیچھے چپکا دیا۔ ڈاکٹر پلٹنے ہی والا تھا کہ وہ بیچ وارڈ میں اچھل اچھل کر ناچنے لگا۔ "جس کی دُم میں دھاگا، دم دبا کے بھاگا، دم دبا کے بھاگا۔"

"کیا یہ سچ مچ پاگل ہو سکتے ہیں؟" ڈاکٹر کے ساتھی نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"ان میں سے نمبر۱ اور نمبر۲ سے تو میں واقف ہوں، ان کے پاگل پن کی تصدیق بھی ہو چکی ہے اور غالباً کہ پرسوں تک انھیں پاگل خانے بھیج دیا جائے گا۔"

"اور ڈوری؟"

"ابھی تک تو اس پر پاگل پن مسلط ہے، لیکن پہلے سے پرسکون معلوم ہوتی ہے۔"

"اور یہ نمبر۴؟"

"اس کا معاملہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بھی پاگل ہو اور اس کے پاگل پن کی کوئی ایک خاص رو یا کوئی مقامی موسمی اثرات ہوں۔ اسے ڈاکٹر باسو نے بھیجا ہے یہاں۔" ڈاکٹر نے بتایا۔ اتنی دیر میں ایک نرسنگ اردلی ٹرے میں سرنج وغیرہ لے کر آ پہنچا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر نے نمبر۱ اور نمبر۲ کو زبردستی انجکشن دیے، اس کا ساتھی ان کو قابو میں کیے رہا۔ نمبر۱ تو سوئی کے بازو میں گھستے ہی حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگا۔

''اے، کوئی بچاؤ...، کوئی بچاؤ...'' یہ قصائی مجھے حلال کر رہا ہے۔ ہائے، تلوار بھونک دی میرے سینے میں۔'' اور بجائے بازو کے وہ اپنا سینہ دونوں ہاتھوں سے دبا کر بستر پر گر پڑا۔ نمبر۲ نے خلافِ توقع بڑی دلیری کا مظاہرہ کیا۔ اس نے زمین پر حقارت سے تھوکتے ہوئے دوسرا بازو بھی آگے بڑھا دیا۔

''ادھر بھی چھید کر دو۔ تم میرا خون پینے آئے ہو نا؟ کھٹمل کہیں کے۔''

اب باری ڈوری کی تھی۔ وہ انجکشن کو دیکھتے ہی بری طرح سے خوف زدہ ہو گئی۔

''ہوں نہیں کھاؤں گی، میں نہیں کھاؤں گی۔'' اس نے پلنگ کے تکیے کی طرف کھسکتے ہوئے کہا۔ لیکن اسے بھی زبردستی انجکشن دے دیا گیا اور جب ڈاکٹر نمبر۳ کی طرف بڑھا تو اس نے پہلے اپنے کرنل زپاٹا کو آگے بڑھا دیا۔

''پہلے میرے بھائی کو چکھیے۔ اسے سائبریا ہو گیا ہے۔ ساری ساری رات ٹھنڈی آہیں بھرتا ہے... پوچ... بدنصیب، کرنل زپاٹا...'' وہ بندر کے بچے کو چمکارنے لگا۔ لیکن کرنل زپاٹا اس سفارش کی پرواہ کیے بغیر ایک ہاتھ سے اپنی پتلون اتارنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ جب نہ اتر سکی تو وہ جھنجلا کر ڈاکٹر کے ساتھی پر جھپٹ پڑا۔ جیسے سب کچھ اس کا قصور ہو۔ ڈاکٹر کا ساتھی تو پیچھے ہٹ گیا لیکن اس کی اوپری جیب سے باہر نکلا ہوا رومال کرنل زپاٹا کے ہاتھ میں آ گیا اور وہ اسے بڑی شانِ بے نیازی سے سونگھتا ہوا وارڈ کی ایک کھڑکی کے اوپری روشن دان میں جا بیٹھا۔ ڈاکٹر کے ساتھی کو شاید گمان بھی نہیں ہوا تھا کہ نمبر۴ کے نیم مہذب بھائی نے کسی تجربہ کار جیب کترے کی طرح اس کا رومال اڑا لیا ہے۔

''بھائیو، یہ غنیم کے آدمی ہیں، ہمارا خون چوسنے آئے ہیں۔'' نمبر۴ نے بلند آواز میں اپنے ساتھیوں سے فریاد کی۔

''ایسا...؟'' نمبر۱ نے آنکھوں کی پتلیاں گھما کر نمبر۲ سے پوچھا۔ ''یہ غنیم کے آدمی ہیں؟ جبھی میرے سینے میں تلوار ماری تھی۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے ایک دم اچھلا اور ڈاکٹر کے

اوپر آ گرا۔ قوی کا مضبوط آدمی ہوتے ہوئے وہ ڈاکٹر کے اوپر چھا گیا۔

”سالا، غمیم کا پٹو۔“ وہ ڈاکٹر کے سینے پر چڑھ کر دانت پیستے ہوئے بولا۔ نمبر ۴ نے اس سے قبل کہ ڈاکٹر کا ساتھی آگے بڑھے، اپنی پلنگ سے اچھل کر اسے پٹک دیا۔ نرسنگ اردلی یہ دیکھتے ہی بھاگ نکلا، ورنہ اس کی بھی کم بختی آ جاتی۔ نمبر ۴ نے ڈاکٹر کے ہاتھ سے سرنج چھین لی اور اسے، اس کے ساتھی کے بازو میں قمیض کی آستین کے اوپر سے ہی گھسیڑ دیا۔

”لے تو بھی لے۔ اور بن جا بکرا۔ جے مہا کالی، تیری بیوی میری سالی، ہاتھی پھد کے ڈالی ڈالی، بھیج کوئی اپنا موالی، چھو چھو... آ چھو... بن جا بکرا۔“ یہ بکتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔ اس وقت کرنل زپاٹا کو بھی نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ اچک کر نمبر ۴ کے کندھے پر آ بیٹھا اور نمبر ۴ نے ایک پیر ڈاکٹر کے ساتھی کے سینے پر رکھ کر تارزن کے انداز میں منہ پھاڑ کر چلانا شروع کر دیا۔ اواں، آنہہ، اُواں آاں، الہہ، چیں پوں چیں پوں، چیں پوں، ڈھررر۔“ نعرہ مار کر وہ اس کے سینے سے ہٹ گیا، ساتھ ہی بڑی صفائی سے اس نے بندر کے بچے کے ہاتھ سے وہ رومال چھین کر اپنی جیب تک پہنچا دیا۔ ڈاکٹر کا ساتھی اٹھتے ہی غصے سے سرخ ہو کر اس پر جھپٹا، لیکن اس سے پہلے کہ اس کے ہاتھ نمبر ۴ کی گردن تک پہنچیں، کرنل زپاٹا نے اپنی گول گول آنکھوں سے اسے گھور کر پہلے تو ’چچ چچ‘ کی آواز نکالی، پھر جست کر کے اس کا گریبان تھام لیا۔ ڈوری اپنے بیڈ پر اکڑوں بیٹھی باریک باریک قہقہے لگا رہی تھی اور نمبر ا نمبر ۲ ڈاکٹر کو نیچے دبائے بڑے اطمینان سے اس کی مونچھوں کے بال گن گن کر اکھاڑ رہے تھے۔ اسی وقت تین چار آدمی ڈاکٹر باسو کی معیت میں اندر آ پہنچے۔ ان میں وہ نرسنگ اردلی بھی تھا جو انھیں خبر کرنے کے لیے گیا تھا۔ تینوں پاگلوں کو قابو میں لے آیا گیا۔ انھیں ان کے بستروں پر لٹا دیا گیا اور ڈاکٹر اسر اس کا ساتھی اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے انھیں کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگے۔

”ڈاکٹر، مجھے یہ چوتھے بیڈ والا مریض خطرناک معلوم ہوتا ہے۔“ اس ڈاکٹر نے ڈاکٹر باسو سے کہا۔

"اوہ نہیں، وہ بے ضرر ہے۔ دراصل جب سے اس کا جوان بھائی ایک ٹرین کے حادثے میں مرا ہے، اسکی دماغی کیفیت غیر معتدل ہوگئی ہے۔ کبھی کبھی یہ بالکل قلندروں جیسی باتیں بھی کرتا ہے۔" ڈاکٹر باسو نے ہنستے ہوئے اسے بتایا۔

"کیا اس وارڈ میں بندروں کے لیے بھی جگہ ہے؟"

"اوہ، وہ... بھئی، یہ مریض یہاں دن دو دن کے مہمان ہیں۔ ان کی نفسیاتی تسکین کے لیے بعض بے اصولیاں بھی سہنی پڑتی ہیں۔ یہ جائزہ لینے کے بعد کہ آیا یہ وقتی علاج سے ٹھیک ہوسکیں گے یا نہیں، ہم یا تو انھیں ان کے رشتے داروں کو واپس کردیں گے ورنہ پاگل خانے بھیج دیں گے۔"

"ہُم..." ڈاکٹر نے سنجیدگی سے ایک نظر نمبر ۴ کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر ٹہلنے لگا۔

"میں نے انھیں اے سی ٹی ایچ کے انجکشن دے دیے ہیں۔ بیڈ نمبر ۲ کی مریضہ پہلے سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔" اس ڈاکٹر نے ڈاکٹر باسو کو رپورٹ دی۔

"میرا خیال ہے کہ میں کل تک اسے ٹھیک کرلوں گا۔" ڈاکٹر باسو نے ایک نظر چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

"اوہ... یہ تو اچھی بات ہے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ڈاکٹر باسو سے ہاتھ ملایا اور اپنے آدمی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی چاروں مریض ہم آواز ہوکر ہنس پڑے۔

"تم لوگ جاؤ، اب تمہاری ضرورت نہیں۔" ڈاکٹر باسو نے نرسنگ اردلی کے سوا سب کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور وہ لوگ خموشی سے باہر نکل گئے۔ ڈاکٹر اب سیدھا نمبر ۴ کے قریب آگیا، وہ مسکرا رہا تھا۔

"میں سارا ڈرامہ باہر سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے بھی اس پر شک ہے۔ وہ ڈاکٹر بھسیم ہے۔" وہ آہستہ سے نمبر ۴ کے قریب ہوکر بڑبڑایا۔

"لیکن یہ انجیکشن؟" نمبر ۱۴ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"وہ میرے ہی دیے ہوئے تھے۔ میں نے دانستہ اسے یہاں بھیجا تھا، کیوں کہ وہ کئی بار مجھ سے مس ڈوری کے بارے میں پوچھ چکا تھا۔"

"مگر کھیلا بھی تو ہو سکتا ہے؟" نمبر ۱۴ نے پوچھا۔

"میں یہ سب کچھ خان صاحب کے ایما پر کر رہا ہوں۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا، اس کے ذمے دار وہ ہوں گے۔ میں نے تعاون کا وعدہ کیا ہے اور اس پر کاربند ہوں۔"

"ہائیں... آپ کارمیکس بند ہیں؟" نمبر ۱۴ نے حیرت سے دہرایا۔ اس کی نظر داخلی دروازے کے شیشے پر باہر کی طرف سے لہراتے ہوئے ایک عکس پر پڑ گئی تھی۔ ڈاکٹر باسو اس کا مطلب سمجھ گیا۔

"تم چپ چاپ لیٹ جاؤ، ورنہ میں تمہیں پھر انجیکشن دے دوں گا۔" ڈاکٹر نے تحکمانہ لہجے میں اسے ڈانٹا۔

"نہیں... ایں ایں۔ میں نہیں لوں گا۔ میں نہیں لوں گا۔" یہ کہہ کر نمبر ۱۴ نے اپنے اوپر کمبل تان لیا اور اس کا کرنل زپاٹا اطمینان سے پلنگ کے سرہانے والے فولادی تکیے سے اتر کر اس کمبل کے اوپر اس طرح آ بیٹھا، جیسے یہ گدّا اسی کے لیے بچھایا گیا ہو۔

"ڈاکٹر بھشیم منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا کاریڈور عبور کرتا، لفٹ کے ذریعے نیچے آ گیا۔ اس کا ساتھی چپ چاپ اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ اسپتال سے باہر نکل کر وہ ایک سبز رنگ کی مرسیڈیز کار میں بیٹھ گئے۔

ان کی کار جیسے ہی اسپتال کے احاطے سے باہر نکلی، پورٹیکو کی سیڑھیوں تک آئے ہوئے ایک نرسنگ اردلی نے برآمدے میں بینچ پر بیٹھ کر اخبار پڑھتے ہوئے ایک دوسرے آدمی کو کچھ اشارہ کیا، جس کے ساتھ ہی وہ اخبار تہہ کر کے جیب میں ڈالتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر اسپتال کے احاطے سے باہر نکل آیا۔ سبز رنگ مرسیڈیز اب تقریباً دو سو گز

دور جا چکی تھی۔ اس آدمی کے اشارہ کرتے ہی فٹ پاتھ کے کنارے سامنے کھڑی ہوئی ایک ٹیکسی آگے بڑھ آئی۔ وہ جلدی سے اس کا پچھلا دروازہ کھول کر اس میں بیٹھ گیا۔

"اس کا پیچھا کرو۔" اس نے اشارے سے بتایا۔ یہ ہٹلری طرز کی مکھیوں جیسی مونچھوں والا ایک اکہرے بدن کا اوسط قد وقامت والا جوان آدمی تھا۔ اس نے آنکھوں پر ٹھنڈا چشمہ لگا رکھا تھا۔ ٹیکسی اس سبز مرسیڈیز کا پیچھا کرنے لگی۔

☆☆☆☆☆☆

"ہیلو۔" خان نے آفس میں بیٹھے بیٹھے فون کا رسیور اٹھا کر کہا۔

"سر، میں ابراہیم بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"ہاں ہاں، کہو، کیا بات ہے؟"

"میں نے اس ڈاکٹر کا پیچھا کیا تھا جس کے بارے میں باسو صاحب نے آپ کو فون کیا تھا۔"

"پھر؟"

"وہ سبزواری لین میں ایک مکان کے دروازے پر گاڑی روک کر تقریبا ایک گھنٹے سے اندر گیا ہوا ہے اور ابھی تک باہر نہیں نکلا۔ اس کی کار بھی وہیں کھڑی ہے۔ اس کے ساتھ ایک آدمی اور تھا۔" ابراہیم نے بتایا۔

"تم وہیں ٹھہرو، میں آ رہا ہوں۔" خان نے اسے ہدایت کی اور رسیور رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چپراسی گھنٹی بجاتے ہی آ پہنچا۔

"کریم سے بولو، گاڑی شیڈ سے نکال لائے۔" یہ کہتے ہوئے خان نے آفس میں میز کے پاس دیوار گیر کھونٹی پر ٹنگے ہوئے اپنے وردی والے سوٹ کو اتارا اور دفتر کے پچھلے حصے میں چلا گیا۔

ان کپڑوں کے علاوہ، جو اس کے بدن پر ہوتے، ہر وقت اس کے دفتر میں اس کی موجودگی تک اس کا ایک پلین سوٹ اور اس کی آفیسر یونیفارم، دونوں کھونٹی میں ٹنگے رہتے۔ کیا معلوم کب کس کی ضرورت پڑ جائے۔ اس کا آفس کافی بڑا تھا، جسے درمیان میں دو پارٹیشن ڈال کر تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ پہلا حصہ ملاقاتیوں کے بیٹھنے کے لیے تھا، درمیان کے بڑے حصے میں خود خان کی نشست تھی اور عقبی حصے میں باتھ روم، ڈبلوسی اور ریسٹ کارز تھا۔ پانچ منٹ بعد جب وہ اندر سے نکلا تو اپنی وردی میں تھا۔ نیچے آ کر وہ کار میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ انسپکٹر ڈیسوزا آپہنچا۔

"سر، پانچ اور کیس آج اب تک ہوئے ہیں۔" ڈیسوزا نے رپورٹ دی۔

"معاملہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔" خان جھنجلائے ہوئے انداز میں بڑبڑایا۔

"آپ محکمۂ صحت کے ڈائرکٹر سے مل کر معلوم کیجیے کہ وہ اس وبا کے پھیلنے کے اسباب کی تحقیق میں کس حد تک پہنچے ہیں اور اس پھیلاؤ کے آثار قدرتی ہیں یا غیر قدرتی۔" خان نے ہدایت کی۔

"بہتر ہے۔" ڈیسوزا نے کہا۔ اور خان نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆☆☆☆

وارننگ

سبز واری لین کوئی نیک نام جگہ نہ تھی۔ اسی وجہ سے خان کو شبہ ہوا تھا، ورنہ ڈاکٹر کہیں اور گیا ہوتا تو شاید وہ اس وقت خود اس کے پیچھے نہ آتا۔ سبز واری لین میں دو طرفا اکہرے اور دو منزلہ مکانات تھے، جن کے دروازے کھڑکیاں، دیواریں سب ہی سیلی اور برسوں سے غیر مرمت شدہ معلوم ہوتی تھیں۔ شہر میں یہ مقام اپنی آبادی کے لیے بدنام تھا۔ یہاں زیادہ لوگ اس قسم کے رہتے، جن کے کسب معاش کے ذرائع نامعلوم تھے۔ زیادہ تر آوارہ گردی کرتے ہی نظر آتے۔ کچھ مشہور جیب کترے تھے اور کچھ شراب فروش۔ کسی شریف آدمی کا گزر یہاں مشکل سے ہی ہوتا۔ ایسے مقام پر ڈاکٹر بھیشم کی آمد نہ صرف غیر متوقع، بلکہ خطرناک نوعیت کی حامل تھی۔

خان نے اپنی گاڑی گلی کے منہ پر ہی روک دی اور پیدل ہی گلی میں داخل ہو گیا۔ یہاں دور سے ہی ایک کار ایک یک منزلہ مکان کے دروازے کے سامنے کھڑی نظر آ رہی تھی اور اس سے کچھ فاصلے پر ایک آدمی کھڑا دیوار پر چپکے ہوئے ایک پوسٹر کو پڑھ رہا تھا۔ وہ ابراہیم تھا، جو خان کو دیکھتے ہی موَدب ہو گیا۔ گلی میں ایک بڑے باوردی پولیس آفیسر کو داخل ہوتے دیکھ کر بہت سی کھوپڑیاں کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانکنے لگی تھیں۔

گلی کے موڑ پر گشتی پولیس کے دو کانسٹیبل کھڑے ہوئے ہیں، انھیں بلا کے لاؤ۔” خان نے ابراہیم سے آہستہ سے کہا۔ ابراہیم لمبے لمبے قدم اٹھاتا فوراً چل دیا۔ خان اب ڈاکٹر کی کار کا معائنہ کرنے لگا۔ کار کے دروازے لاک نہیں کیے گئے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے بھی اترے ہوئے تھے۔ اس نے اندر جھانک کر دیکھا، سیٹیں بالکل صاف تھیں۔ پھر اس نے ڈیش بورڈ میں لگی ہوئی درازوں کو کھول کر دیکھا، ان میں بھی کچھ نہ تھا۔ اتنے میں ابراہیم ان دو

کانسٹیبلوں کو لیے آ پہنچا۔ وہ خان کو دیکھتے ہی اٹینشن ہو گئے۔

"تم دونوں یہاں ٹھہرو۔" خان نے ان کا سلام لیتے ہوئے کہا۔ "اور ابراہیم، تم میرے ساتھ آؤ۔ ہاں دیکھو کوئی اس مکان سے باہر نہ جانے پائے۔" خان نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے انہیں تاکید کی۔

"بہتر ہے، حضور۔" کانسٹیبلوں نے ہم زبان ہو کر کہا۔

مکان کا دروازہ دھکا دیتے ہی کھل گیا۔ خان ایک قدم پیچھے ہٹ گیا، لیکن اندر کی طرف کسی کی موجودگی کے آثار نہ تھے۔ پھر ہاتھ میں پستول تھامے وہ اس میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک تقریباً ۵۰ فٹ چوڑا اور اتنا ہی لمبا صحن تھا جس کی زمین خشک اور کھردری تھی۔ صحن کے مغربی سرے پر ایک برآمدہ تھا، جس میں دو پرانی بینچیں اور ایک سڑی ہوئی سی ٹیبل پڑی تھی۔ برآمدے میں دو کمروں کے دروازے تھے جن میں سے ایک بند تھا اور ایک کھلا۔ برآمدے میں پہنچتے ہی انھیں دیسی شراب کی بسی ہوئی بو آنے لگی۔ خان نے اس میز پر جھک کر سونگھا، وہ شراب کی بو میں اس طرح بس چکی تھی جیسے یہ بدبو اسی کی لکڑی کی صفت ہو۔ کمرے کے کھلے دروازے کے باہر دیوار سے چپک کر خان نے پہلے اپنا رومال جیب سے نکال کر اچانک اندر پھینک دیا، لیکن کوئی ردِ عمل نہ ہوا، تب اس نے جیب سے ٹارچ نکال کر اس کمرے کے ماحول کا باہر سے جائزہ لینا چاہا۔ کمرہ اندر سے تاریک تھا۔ اس کے پچھلی کھڑکیاں سب بند تھیں، صرف دروازے سے ہی تھوڑی بہت روشنی اندر پہنچ رہی تھی۔

اندر کوئی معلوم نہ ہوتا تھا۔ پھر خان آہستہ سے دروازے سے کھسک کر اندر داخل ہو گیا، مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ ایسا معلو، ہو رہا تھا جیسے پورے مکان میں کوئی نہ ہو۔

"صاحب۔" ابراہیم چونکا۔ اس کا اشارہ کمرے پڑی ہوئی ایک میز کے دوسری طرف تھا اور خان بھی ادھر دیکھتے ہی دوڑ پڑا۔

یہ ایک انسانی لاش تھی، جو خاک و خون میں غلطاں پڑی تھی۔ خون اس کی کنپٹی سے

بہا تھا۔ اس کی کنپٹی میں گولی ماری گئی تھی۔ خان نے جیسے ہی لاش کو الٹایا، ڈاکٹر ہشیم کا چہرہ ان کے سامنے تھا اور اس کالر میں ایک پن کے ساتھ کاغذ کا ایک پرزہ بھی لگا ہوا تھا، جس پر صاف انگریزی میں لکھا تھا۔ ”یہی حشر تمہارا بھی ہو سکتا ہے۔“

”ابراہیم کو لاش کے پاس چھوڑ کر خان نے اس مکان کا چپہ چپہ چھان مارا، لیکن انھیں نہ تو وہاں کوئی آدمی ملا اور نہ ہی کوئی قابلِ ذکر چیز۔ یہ مکان کوئی خفیہ شراب خانہ معلوم ہوتا تھا، لیکن ڈاکٹر کی ایک ایسی جگہ موجودگی اب بھی ایک راز تھی۔ یقیناً اس گھٹیا قسم کے شراب خانے یا اس کی سوسائٹی سے تو تعلق نہ رکھتا ہوگا، پھر وہ کسی سے ملنے یہاں آیا تھا۔ اگر ایسا تھا تو کس سے؟“

مکان سے باہر نکل کر کانسٹیبلوں سے جب پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ اندر سے کوئی نہیں نکلا۔ باہر ایک پڑوس کے آدمی سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ایک پنچایتی شراب خانہ ہے۔ محلے کے چند شراب خور آپس میں چندہ کر کے اس مکان کا کرایہ ادا کرتے ہیں اور یہ ہر وقت کھلا ہی رہتا ہے کہ جس کا جب جی چاہے اس میں جا کر لیٹے اور پیے۔ وہ صرف ان کے بیٹھنے کی جگہ ہے تا کہ وہ قانون کی نظر سے محفوظ رہیں۔

”ان شرابیوں کو جمع کروں؟“ ابراہیم نے پوچھا۔

”نہیں، یہ ان کی حرکت نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر کی موت اسی بڑی اور خوفناک سازش کی کڑی ہے۔ یہ معمولی قسم کے شراب خور اپنے محلے میں اس قسم کی جراُت نہیں کر سکتے۔“ خان نے کہا۔ پھر اس نے اسے ہدایت کی کہ دونوں کانسٹیبلوں کو وہ یہیں چھوڑ کر علاقے کے پولیس اسٹیشن کو فون کر دے تا کہ وہ لوگ آ کر لاش کو اپنے چارج میں لے لیں۔ یہ بات اب واضح ہو گئی تھی کہ ڈاکٹر کا خون کرنے والا یا خون کرنے والے مکان کی پچھلی دیوار پھاند کر دوسری طرف نکل گئے ہوں گے، کیوں کہ اس دیوار سے پانی کی ایک ٹنکی منسلک تھی اور اس کی مدد سے دیوار تک پہنچنا آسان تھا۔

سبزواری لین سے واپسی پر خان کا دماغ کافی مشتعل حالت میں تھا۔ عوامی زندگی کے ساتھ موت کا یہ خوف ناک ڈرامہ کھیلنے والے وہ پراسرار لوگ اب تک نامعلوم تھے اور پھر ان کے حوصلے دن بہ دن بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ وہ اتنے چالاک تھے کہ ہر اس ذریعے کو ختم کر دیتے، جس پر پولیس کا ذرا سا بھی شبہ ہوتا۔ ڈاکٹر ہشیم کی موت محض اتنی سی بات کے لیے ہی واقع ہوئی تھی، ورنہ شاید جو کام اس کے سپرد تھا اس کی تکمیل تو ابھی وہ نہیں کر پایا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

نمبر۴ نے سارا وارڈ سر پر اٹھا رکھا تھا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ اس کے کرنل زپاٹا کو اسپتال کے اسٹاف نے کچھ بھی کھانے پینے کو نہیں دیا تھا۔ وہ شاید اسے ایک فرد تسلیم کرنے کو ہی تیار نہ تھے۔ شور مچانے میں نمبر۱ اور نمبر۲ بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ نمبر۱ کو شکایت تھی کہ اس کے کان میں ریل چل رہی ہے اور نمبر۲ اسپتال والوں سے اس لیے ناراض تھا کہ اسے جا ناشتہ بھیجا گیا تھا اس میں گھاس نہ تھی۔ البتہ ڈوری کی حالت اب کافی پرسکون تھی۔ وہ اپنے بیڈ پر آنکھیں بند کیے خاموش پڑی تھی۔ نمبر۴ کا کرنل زپاٹا پورے وارڈ کا معائنہ کرتا پھر رہا تھا اور مریضوں کے سرہانے لگے ہوئے ٹمپریچر چارٹس اور ڈائیٹ شیٹس تو اس نے سب ہی پڑھ ڈالی تھیں۔ دو ایک پر اس نے رائے زنی بھی کر دی تھی، اس لیے ان کے کاغذ پھٹے ہوئے نظر آ رہے تھے اور اگر ڈاکٹر باسو کے نفسیاتی طریقِ علاج کا بہانہ کرنل زپاٹا کو اس وارڈ کا حقِ شہریت نہ دلواتا تو اسپتال کے ملازمین کرنل کو کبھی کے تڑی پار کر چکے ہوتے۔

ٹھیک دس بجے ڈاکٹر باسو ایک اسسٹنٹ سمیت اندر آیا۔ نمبر۱ اور نمبر۲ تو انھیں دیکھ کر سر پیٹ پیٹ کر رونے لگے۔ نمبر۴ اپنے بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”بے ادب باملاحظہ ہوشیار خرس بوم خارا حضرت آلو بخارا تشریف لاتے ہیں۔“ نمبر۴ نے ایک ہاتھ میں بلند کر کے نعرہ لگا۔ جس کے ساتھ ہی چیخ چیخ... کرتا ہوا کرنل زپاٹا جست کر

کے تپائی پر آ بیٹھا اور ڈاکٹر کو اپنی گول گول آنکھوں سے گھورنے لگا۔ ڈاکٹر مسکرا رہا تھا۔

”سلیوٹ کرنل، سلیوٹ۔ ڈسپلین پلیز۔“ نمبر۴ نے بندر کے بچے کو یہ کہہ کر کچھ ایسی نظروں سے گھورا کہ واقعی وہ ڈاکٹر کو سلام کرنے لگا۔

”آپ لوگوں کو کیا تکلیف ہے؟“ نمبر۴ نے نمبر۱ اور نمبر۲ کی طرف گھوم کر سوال کیا۔

”نہ پوچھ۔“ ایک بولا۔

”نہ پوچھ۔“ دوسرے نے کہا۔

”نہ پوچھو ہم دم وہم راز کیا گزرتی ہے۔“ پہلے نے شاعرانہ موڈ میں کہا۔

”جوش ملیا آبادی۔“ دوسرا فوراً بول اٹھا۔

”مسامت خیر آبادی۔“ پہلے نے گردن ہلا کر بڑے عالمانہ موڈ میں کہا۔

”اونہونہہ... سمندر دریا بادی۔“ دوسرا گھونسا ہوا میں بلند کر کے بولا۔

”اک دم غلط، یہ ثقیل بداونی کا فلمی گانا ہے۔“ پہلا سینہ پھلا کر اکڑ گیا۔

”تم الو کے پٹھے۔“

”تم... تم چڑی کے کاکے۔“

”ہش ہش... وہ کوئی اور ہوگا، میں اینٹ کا غلام ہوں، بڑی بڑی مونچھوں والا۔“

”غصہ...“

”ہُم... ہررررر...“

”گھونسے۔“

”چٹاخ۔“

”جوتا۔

”نہیں لڑتے جاؤ، ہم شریف آدمی ہیں۔“ یہ کہہ کر نمبر۱ نے کمبل میں منہ لپیٹ لیا اور کروٹ لے کر لیٹ رہا۔

"بھاگ گیا... آہا بھاگ گیا..." میں فاتح اعظم عبدل سکندر ہوں۔"

"آہاہاہا.... ہپ۔" اور قہقہے مارتا مارتا وہ بھی اپنے پلنگ پر گر کر اک دم خاموش پڑ گیا۔ ڈاکٹر نے ان لوگوں کی طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ وہ نمبر ۴ کے قریب آ گیا۔

"اخباروں نے آج صبح یہ خبر شائع کر دی ہے کہ ڈوری کی حالت روبہ اصلاح ہے اور کل دوپہر تک غالباً وہ اپنی اصلی دماغی کیفیت پر لوٹ آئے گی۔" ڈاکٹر نے اس کے سرہانے کے چارٹ پر نظریں جما کر بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ اس کا اسسٹنٹ دروازے کے نزدیک ہی میز کے پاس ٹھہر گیا تھا۔

"آج تو ان لوگوں کا آخری معائنہ ہو گا۔"

"ہاں، دو بجے دوپہر کو۔ اور خان صاحب کے اندازے کے مطابق جو کچھ ہونے والا ہو گا، وہ اس سے پہلے ہی ہو جائے گا۔" ڈاکٹر نے ایک ہاتھ سے اس کی آنکھ کے پپوٹے کو اونچا اٹھا کر اس کی آنکھ کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں پوری طرح ہوشیار ہوں۔ آنے دیجیے، جو آتا ہے۔" نمبر ۲ سرگوشی کے لہجے میں بولا۔

اس کے بعد ڈاکٹر نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے اس کے ٹمپریچر چارٹ پر کچھ لکھا اور اسے تاکتے ہوئے ڈوری کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اسے چند سیکنڈ تک خاموشی سے دیکھتا رہا پھر اپنے اسسٹنٹ کی طرف دیکھ کر کسی قدر بلند آواز میں بولا۔ "اب جب یہ ہوش میں آئے گی تو اس کی دماغی کیفیت ٹھیک ہو گی۔"

"اور یہ دوسرے؟" اسسٹنٹ نے نمبر ۱ اور نمبر ۲ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"انھیں بورڈ کے معائنے کے بعد پاگل خانے بھیج دیا جائے گا۔"

"کسے پاخانے بھیج دو گے؟" نمبر ۱ نے کمبل کی اوٹ سے سر نکال کر معصومیت سے پوچھا۔

"چپ بے۔" نمبر۲ نے اسے اپنی پلنگ سے ڈانٹا۔ "آدھی رات کو یہ نیند حرام کرتا ہے۔"

ڈاکٹر اور اس کا اسسٹنٹ باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی ایک نوجوان سی خوب صورت سی نرس آ پہنچی۔ پہلے اس نے نمبر۱ اور نمبر۲ کی طرف دیکھا پھر نمبر۴ کی طرف۔ لیکن وہ کمبل تان کر لیٹا ہوا تھا اور اس کا کرنل زپاٹا وارڈ کی کھڑکی کے اوپر روشن دان سے لٹک کر جمناسٹک کے کرتب دکھا رہا تھا۔ نرس یا تو دبے پاؤں اندر آئی تھی یا پھر اس کے جوتوں کے کریپ سول اتنے ملائم تھے کہ ان سے خفیف سی آواز بھی نہ ہوئی تھی۔ اس کی نظر کرنل زپاٹا پر نہیں پڑی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ڈوری کے بیڈ تک پہنچ گئی۔ وہ ہاتھوں میں چمڑے کے سفید دستانے پہنے ہوئے تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں کروشیا جیسی اسٹیل کی ایک باریک نلی دبی ہوئی تھی، جو یقیناً تھرمامیٹر تو نہ تھا۔ ڈوری کے پلنگ کے نزدیک پہنچ کر اس نے لاپرواہی کے انداز میں ایک بار چاروں طرف دیکھا اور پھر اس کے سرہانے کے چارٹ کو دیکھتے دیکھتے ایک ہاتھ سے اس نے چپکے سے ڈوری کی چادر اس کے سینے سے ذرا ہٹا دی جس سے اس کے بازو بھی عریاں ہو گئے۔ نرس نے جلدی سے وہ چمک دار باریک فولادی نلی کھولی اور اس کے اندر سے ایک چمک دار سوئی کی نوک جھانکنے لگی۔ وہ اب ڈوری کی طرف پلٹی ہی تھی کہ خدا جانے کرنل زپاٹا کو کیا سوجھی جو وہ 'خیاپ' کا نعرہ لگا کر اوپر سے نمبر۴ کے سینے پر کود پڑا۔

"ابے او کرنل کے بچے۔" نمبر۴ نے طیش میں آ کر کمبل الٹ دیا، لیکن سب سے پہلے اس کی نظر اس نرس پر پڑی جو اک دم جھجک کر ڈوری کے بیڈ سے کچھ دور ہٹ گئی تھی۔

"نرس۔" نمبر۴ نے بڑے خوشامدانہ انداز میں اسے پکارا۔

"یس، پلیز۔" اس نے وہیں سے بہت ملائم لہجے میں جواب دیا۔

"کیا میں تم پر عاشق ہو سکتا ہوں؟ تم... تم بہت خوب صورت ہو۔" نمبر۴ نے بڑی پرشوق نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اجازت طلب کی۔

”کیوں نہیں، ضرور۔“ وہ مسکراتی ہوئی اب اس کی طرف آنے لگی۔

”میں ابھی خواب دیکھ رہا تھا کہ ایک سفید پری کوہ فاق، اونہہ۔ کاق۔ لاحول ولاقوۃ۔ کوہ قاف سے نکل کر میرے سرہانے آئی ہے اور بڑے پیار سے کہہ رہی ہے لڈو کھالو۔“

”نرس، کیا تم لڈو لائی ہو؟“ نمبر۴ نے بچوں جیسے انداز میں منہ بنا کر پوچھا۔

”ہاں ہاں۔ کیا تم لڈو کھاؤ گے نا؟“ وہ اپنے دونوں ہاتھ پشت پر رکھے اس کی پلنگ کے پیتیانے تک آ گئی۔ یہ دیکھ کر کرنل زپاٹا نے پہلے تو نمبر۴ کے سینے پر ہی دو چار ڈنڈ پیلے اور چیخ چیخ کرتا ہوا ایک قلابازی کھا کر نمبر۲ کی پلنگ پر جا پڑا۔ نمبر۱۲ اچھلا تو نمبر۱ پر اور پھر وہ دونوں فرش پر اوندھے پڑے چیخنے لگے۔ ”ارے کوئی بچاؤ۔ ہم ڈوب رہے ہیں۔“

”نرس، تمہیں دیکھ کر میرے دل میں کچھ کچھ ہو رہا ہے۔“ نمبر۴ نے بے وقوفانہ ادا کے ساتھ شرماتے ہوئے کہا۔ نرس مسکراتی ہوئی اور قریب آ گئی۔

”او کے، ناؤ ہینڈز اپ، یو فولش گرل۔“ نمبر۴ کا لہجہ اک دم بدل گیا۔ وہ پلنگ سے اٹھ بیٹھا۔ اس کے اس ہاتھ میں جو اب تک کمبل کے اندر تھا، بھرا ہوا پستول تھا۔ نرس کا چہرہ اک دم زرد پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں حیرت وخوف سے پھیل گئیں۔

”تم... تم...؟“ اس نے کہنا چاہا۔

”میں گریٹ پاگل نمبر۴ ہوں۔ کرنل زپاٹا اگر اس وقت مجھے چونکا نہ دیتا تو تم اپنا داؤ کھیل چکی ہوتیں، ڈارلنگ سفید پری۔ اچھا چلو، وہ ہاتھ سامنے لاؤ... یو چ...“ اس نے اسے چمکارا۔ یہ سنتے ہی نرس کانپ اٹھی۔ اس نے بے چارگی سے ایک بار گھوم کر دروازے کی طرف دیکھا، لیکن اس کی رہی سہی امید پر بھی پانی پھر گیا۔ دروازے پر خود سپرنٹنڈنٹ خان موجود تھا۔ لڑکی نے گھبرا کر اپنے ہاتھ پشت سے سامنے کی طرف لاتے ہوئے اس ہاتھ کو جس میں وہ چمک دار نلکی تھی اوپر اٹھایا اور اس سے پہلے کہ وہ اسے اپنے دوسرے ہاتھ کی کلائی میں چبھو دے نمبر۴ کے مضبوط پنجے کی گرفت اس پر سخت ہو گئی۔

"اہاں ہاں، خودکشی... بری بات... چچ چچ..." وہ اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے بولا۔ خان کو دیکھ کر اس نے اپنا ریوالور اسپتال کی گون کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ خان اندر آ گیا تھا۔ بالے نے بڑے احتیاط سے وہ فولادی نلکی نرس کے ہاتھ سے چھین کر خان کی طرف بڑھا دی۔ خان نے بھی اسے سرے سے تھام کر اس کا خول اس پر چڑھاتے ہوئے اسے جیب میں ڈال لیا۔ اسی وقت رؤف اور ابراہیم بھی اندر آ پہنچے۔

"باہر تو کوئی نہیں ملا؟" خان نے رؤف کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"جی نہیں، صاحب۔ ایک ٹیکسی والے پر شک ہوا تھا، لیکن لائسنس دیکھ کر اطمینان کر لیا۔"

"اسے لے چل کر میری گاڑی میں بٹھاؤ۔" خان نے نرس کی طرف اشارہ کر کے رؤف سے کہا۔

"چلیے، محترمہ۔" رؤف اس کے قریب آ کر بولا۔

"مس بورکر، آپ اس لڑکی کی تلاشی لے لیجیے۔" خان نے بیڈ نمبر ۴ پر اٹھ کر بیٹھی ہوئی نقلی ڈوری سے نرس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اور وہ تعمیل کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اور میں؟" نمبر ۴ نے خان سے پوچھا۔

"تم پاگل خانے جاؤ گے۔"

"لعنت ہے اس پر جو اتنی تابعداری کرے۔"

"خیر، وہ تو تمہارے فرشتے بھی کریں گے۔ بہرحال ڈاکٹر کے آفس میں تمہارا سوٹ موجود ہے، لباس تبدیل کر کے سیدھے آفس چلے آؤ۔ میں لونڈیا کو لے کر چل رہا ہوں۔" خان نے دروازے کی طرف چلتے ہوئے کہا۔

"آپ تو اس طرح فرما رہے ہیں جیسے دلہن کا ڈولا لے جا رہے ہیں۔" بالے نے فقرہ چست کیا۔

"حکومت، میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

"آپ نے میرے کرنل زپاٹا کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اس نے اس وقت ایک پولیس سب انسپکٹر سے زیادہ کام انجام دیا ہے۔" بالے نے چپی کو بغل میں دبا کر پیچھے آتے ہوئے کہا۔ رؤف اور ابراہیم نرس کو گھیرے میں لیے باہر نکل گئے۔ اسی وقت ڈاکٹر باسو اپنے چند آدمیوں سمیت آ پہنچے۔

"کیا ہوا؟" انھوں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"سب ٹھیک ہوا ہے۔ آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔"

"مجھے ڈاکٹر بھشیم کا افسوس ہے۔ میں اسے اتنا گھٹیا آدمی نہیں سمجھتا تھا کہ وہ کسی اس قسم کی سازش میں ملوث ہونا پسند کرے گا۔" ڈاکٹر نے خان کے ساتھ ساتھ کاریڈور میں چلتے ہوئے کہا۔

"اس دنیا میں انسان کو اس کی صحیح شکل میں پہچاننا خود ہی ایک مشکل کام ہے۔ اور پھر آپ ایک ایسے ڈاکٹر پر پہلے سے شبہ کر بھی کیسے سکتے تھے، جس نے آپ کے ساتھ کام کیا ہو۔" خان نے کہا۔

"مجھے تو صرف کل ہی اس پر شک گزرا، ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ کوئی باہر سے آنے والا ہے۔" ڈاکٹر نے بتایا۔

"اور یہ نرس؟"

"یہ ہمارے اسٹاف کی نہیں۔ خدا جانے کس طرح یہاں تک پہنچ گئی۔ میں کیا، شاید کوئی بھی اسے یہاں نہیں جانتا۔" ڈاکٹر نے بتایا۔ "مجھے تو ابھی وارڈبوائے نے اس کمرے میں آپ کے داخل ہونے پر آ کر خبر دی۔"

"خیر، ہمارا جو مقصد تھا، وہ تو سردست حل ہو ہی گیا۔ اب ممکن ہے اس لڑکی سے ہمیں کوئی مفید مطلب بات معلوم ہو سکے۔"

”ڈاکٹر صاحب، میرے کپڑے۔“ پیچھے سے بالے کی آواز آئی۔ اس وقت وہ اسپتال کے پاجامے اور دھاریوں والے گون میں خاصا کارٹون معلوم ہو رہا تھا۔

”آپ اس روم میں چلے جایئے۔“ ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔

”رؤف بھائی، اس لونڈیا سے دور ہی رہنا، ہاتھ لگاتے ہی مر جاؤ گے۔“ بالے نے چلتے چلتے رؤف کے کان میں کہا۔ ”جملہ حقوق بحق بالے صاحب محفوظ ہیں۔“

”یہ لکھوا لیا ہوتا۔“ رؤف نے جل کر کہا۔ مگر خان کو گھورتے دیکھ کر بالے کو کھسکنا پڑا۔ پھر بھی اسے اس خوب صورت نرس کے اترے ہوئے زرد چہرے کو دیکھ کر اتنا رحم آ رہا تھا کہ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اس کے اوپر سرخی پوت دیتا۔

☆☆☆☆☆☆

قتلِ عام

اچانک شہر میں طاعون کی وبا اور زوروں پر آ گئی اور روزمرہ تیس چالیس کیسز ہونے لگے۔ شہر تو شہر، مضافات تک کے لوگ اینٹی پلیگ انجکشنوں کے لیے دوا خانوں اور موبائل اسپتالوں پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تیسرے دن ہی ہافکن انسٹیٹیوٹ کو اعلان کرنا پڑا کہ اس کے پاس انجکشنوں کی بہت محدود تعداد رہ گئی ہے اور یہ ناممکن ہے کہ مستقبلِ قریں میں وہ اتنی کافی تعداد تیار کر کے دے سکے جو تمام شہریوں کے لیے کافی ہے۔

معاملہ اگر اتنا ہی رہتا تو بھی صورت نکالی جاتی، لیکن آج جب اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ طاعون کے اثرات ملحقہ اضلاع میں بھی پھیل رہے ہیں تو ایک ملک گیر سنسنی پھیل گئی۔ سارے شہر میں تو پہلے ہی گھر گھر دعائیں مانگی جا رہی تھیں، مسجدوں، مندروں اور گرجاؤں میں دعائیہ جلسے ہو رہے تھے۔ اور آج ہی دوپہر کو دہلی سے پلیگ کی وبا کا ایک جرمن ایکسپرٹ یہاں پہنچ رہا تھا۔ اسے سہ پہر کو صوبہ بھر کے افسرانِ صحت اور چوٹی کے طبی مشیروں کی کانفرنس میں شرکت کرنی تھی۔ اور اس کے باوجود کہ خان نے اپنے ان شبہات کو کہ کوئی بہت طاقتور منظم اور پراسرار گروہ عوامی زندگی کے ساتھ یہ خوف ناک ڈرامہ کھیل رہا ہے، صرف پولیس کے اعلیٰ افسران تک محدود رکھا تھا، لیکن خود پولیس میں ایک طبقہ ایسا تھا جو اسے محض سپرنٹنڈنٹ خان کی شبہات پسندی گردان کر طاعون کے کیسز کو قدرتی وبا سے منسوب کر رہا تھا اور اب تو پریس نے بھی ڈاکٹر بٹلر کی موت کے مشتبہ کیس سے توجہ ہٹا کر صرف محکمۂ صحت کے انتظامات پر تنقید کرنی شروع کر دی تھی۔ خود خان بھی کسی خاص نتیجے پر پہنچے بغیر ان شبہات کو عام کرنا نہ چاہتا تھا، جو ان واقعات کے تسلسل نے اس کے دماغ میں پیدا کر رکھے تھے۔ وہ اس بار اس سلسلے کی اپنی جد و جہد کو دوسروں کے لیے ایک معما بنا کر کام کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ خود

ڈی آئی جی بھی اس کیس میں کچھ بددل سے ہو گئے تھے، بلکہ ایک بار تو انھوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا، 'مجھے طاعون کی وبا وان حادثوں میں کوئی تعلق نہیں معلوم دیتا۔ یہ محض آپ کا شبہ ہے، اور یہ ضروری نہیں کہ ہر شبہ درست ثابت ہو'۔ پھر بھی انھوں نے خان کو یہ اجازت دے دی تھی کہ وہ اپنے طور پر اس سلسلے میں جو جی چاہے کرے۔ ویسے بھی یہ بات دوسروں کی سمجھ میں نہ آئی تھی کہ ایک ایسی وبا کا پھوٹ پڑنا کس طرح کسی سازش یا جرم سے منسلک کیا جا سکتا تھا۔ ایسی بیماریاں تو قدرتی ہی ہو سکتی ہیں۔ اعلیٰ حکام کو ہافکن انسٹیٹیوٹ سے پلیگ کے کیڑوں کی چوری اور انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر کے اظہارِ تشویش سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ اور نہ ہی وہ اسے کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار تھے۔ ایسی صورتِ حال میں بعض اوقات خان کو بعض اقدامات صرف اپنی ہی ذمہ داری پر کرنے پڑتے جن کی ناکامی کی صورت میں اس کی پوزیشن پر بھی حرف آ سکتا تھا۔ گورنمنٹ اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ والے معاملے کی ذمہ داری بھی اسی پر تھی اور اگر کہیں اتفاق سے اس کی یہ کوشش ناکام ہو جاتی تو اسے کافی تنقیدوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ خود پولیس ڈپارٹمنٹ کے اعلیٰ حلقوں میں بھی اس کے ایسے بدخواہ موجود تھے جو اس کی شہرت، اس کی شخصیت اور اس کی صلاحیتوں سے حسد کرتے تھے اور وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتے کہ انھیں کون سا ایسا موقعہ ہاتھ آ جائے جو وہ خان کے خلاف پروپیگنڈہ کر سکیں۔ لیکن یہ خان کا اقبال تھا یا اس کی ایمان دارانہ محنتوں کا صلہ کہ آج تک تو انھیں منہ کی ہی کھانی پڑی تھی۔

ٹھیک تین بجے میڈیکل ایسوسی ایشن کے جنرل میٹنگ ہال میں بند دروازوں کے پیچھے محکمہ صحت کے صوبائی اور مقامی اہل افسران کی کانفرنس شروع ہو گئی۔ مہلک وباؤں کا جرمنی ماہر ہربرٹ مارٹن اس کانفرنس میں مشیر و مہمان خصوصی کی حیثیت میں شامل تھا۔ وہ ایک مضبوط قوی کا گورا چٹا ۴۰-۴۵ سالہ آدمی تھا۔ اس کے بال سرمئی مائل اور چہرہ کتابی تھا۔ ناک نیچے سے کچھ ہونٹوں کی طرف جھکی ہوئی اور آنکھیں روشن اور چمکیلی تھیں۔ وہ جب کچھ سوچنے لگتا تو اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں ٹکرانے لگتیں اور ماتھے پر سلوٹیں پڑ جاتیں۔ اس

کانفرنس میں اخباری نمائندوں کو بھی شرکت کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ باہر سادہ لباس پولیس (سی آئی ڈی) کا پہرہ تھا۔ اندر ہال میں ہربرٹ مارٹن کو ملا کر کل ۳۹ آدمی تھے جن میں پانچ شہر کے اعلیٰ سند یافتہ میڈیکل ایکسپرٹس، ایک محکمۂ صحت کا ڈائرکٹر، تین اسپتالوں کے سرجن اور ڈین، چھ افسرانِ صحتِ عامہ اور چار موبائل اسپتالوں کے سپرنٹنڈنٹس۔ اور باقی محکمۂ حفظانِ صحت کے ذمہ داروں میں سے تھے۔ ابھی کانفرنس شروع ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے اور محکمۂ صحت کا ڈائرکٹر اپنی شہری صورتِ حال کی رپورٹ کھڑا سنا رہا تھا کہ باہر دروازے پر ایک مٹیالے رنگ کی کار آ کر رکی۔ دروازے پر موجود سیکیوریٹی آفیسر اور ایک محکمۂ صحت کے انسپکٹر نے آگے بڑھ کر گاڑی اترنے والے کو دیکھا۔

وہ ایک سفید فام نوجوان آدمی تھا۔ اس نے بدن پر ہلکا سا زرد سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں لکڑی کا ایک چوکور سا تقریباً ۱۲ انچ اونچا اور ڈیڑھ فٹ لمبا بکس تھا، جس کے اوپر ایک سلپ لگی ہوئی تھی، جس پر لکھا تھا، ’احتیاط سے کھولا جائے‘۔

”اسے ڈاکٹر مارٹن تک پہنچا دیجیے، وہ گھر پر بھول آئے تھے۔“ اس آدمی نے دروازے پر کھڑے سیکیوریٹی آفیسر سے کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔“ سیکیوریٹی آفیسر نے بکس ہاتھوں میں لے لیا اور کانفرنس ہال کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ آنے والا نوجوان آدمی تیزی سے پلٹا اور اپنی کار میں بیٹھ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ سادا لباس میں موجود محکمۂ خفیہ کے آدمیوں نے اس کی طرف کوئی توجہ بھی نہیں دی کیون کہ وہ صرف ایک امانت سیکیوریٹی آفیسر کو دے کر چلا گیا تھا۔ لیکن عمارت کے صدر دروازے کے باہر موجود ایک چھوٹی سی کالے رنگ کی کار اس نامعلوم آدمی کی کار کے پیچھے چل پڑی۔ وہ اس انداز سے اس کے تعاقب میں روانہ ہوئی تھی کہ آس پاس موجود لوگوں میں سے کسی کو اس کا خیال تک نہ آیا۔

سیکیوریٹی آفیسر نے وہ باکس لا کر کانفرنس کے سکریٹری کی میز پر رکھ دیا۔

"ڈاکٹر مارٹن، پلیز۔" یہ کہہ کر وہ لوٹ گیا۔ محکمۂ صحت کا ڈائرکٹر اب تک اپنی رپورٹ سنا رہا تھا۔ ڈاکٹر مارٹن کو جب خبر کی گئی، تو وہ حیران سا رہ گیا۔

"کس نے بھیجا ہے؟ کیا ہے اس میں؟" وہ قریب آ کر بولا۔

"کیا آپ کو معلوم نہیں؟"

"میں کچھ نہیں جانتا۔"

"تو کھول کر دیکھ لیجیے۔ ممکن ہے کچھ میڈیکل ڈپارٹمنٹ کی طرف سے آیا ہو۔" سکریٹری نے اسے مشورہ دیا۔

"اوہ... اور یہ تالہ بھی تو کھلا ہوا ہے۔" یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر نے اس کا ڈھکن کھول دیا۔

مگر کسے معلوم تھا کہ لکڑی کے اس مختصر سے صندوق میں کتنی موتیں چھپی ہوئی ہیں۔ ننھی سی حقی سی موتیں، جو ملک الموت کے تصور سے زیادہ بھیانک ہو سکتی تھیں۔

باکس کا ڈھکن کھلتے ہی ایک عجیب سی بھنبھناہٹ سارے کمرے میں گونج گئی۔ ساتھ ہی زرد سروں والی مکھیوں کا ایک جتھا بھرا مار کر صندوق سے نکل پڑا۔ خدا جانے کتنا خوفناک پن تھا اس ننھی سی مخلوق میں کہ ڈاکٹر اسے دیکھتے ہی پیچھے کی طرف پلٹتے ہوئے گلا پھاڑ کر چیخا اور ہال میں موجود تمام لوگ بغیر حقیقت حال کو سمجھے ہوئے دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔

"دور رہو... بھاگو... جلدی... فوراً۔ یہ ہم سب کی موت ہے۔" ڈاکٹر خوف زدہ اور بھرائی ہوئی آواز میں چلایا۔ کانفرنس کے ممبروں کے چہرے یہ سنتے ہی زرد ہو گئے۔ ان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ بعض تو گھبراہٹ میں ہال کے پیچھے بند دروازوں سے جا ٹکرائے۔ محکمۂ حفظانِ صحت کے ڈائرکٹر کی تقریر وہیں کی وہیں رہ گئی۔

"کیا ہوا...؟ کیا ہوا...؟" چیختا ہوا وہ ڈاکٹر مارٹن کی طرف دوڑا۔

"خدا کے لیے، ڈاکٹر، بھاگ جاؤ۔" مارٹن چیخا۔ "یہ پلیگ کی مکھیاں ہیں۔"

"پلیگ کی...؟" کئی زبانوں سے بیک وقت نکلا۔

لیکن ان کے باہر نکلتے نکلتے بہت سی مکھیاں بہت سے آدمیوں کو لپٹ چکی تھیں۔ اور ان پڑھے لکھے سمجھ دار آدمیوں کے حواس، آنے والی موت کے احساس نے اس بری طرح کراب کر دیے کہ وہ دہشت زدہ آواز میں عجیب عجیب سی چیخیں منہ سے نکالتے باہر برآمدے کی طرف بے تحاشا دوڑنے لگے۔ وہ اس قدر گھبرا گئے تھے کہ ان کی یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کدھر جائیں، کیا کریں۔ بعض کے حلق سے پھٹی پھٹی چیخیں نکل رہی تھیں جیسے انھیں ذبح کیا جا رہا ہو۔

اس بھگدڑ کی وجہ نہ سمجھتے ہوئے بھی باہر برآمدے کے لوگ ان سے کچھ زیادہ خوف زدہ ہو کر سر پر پیر رکھ کر بھاگ اٹھے۔ بے چارہ سیکیوریٹی آفیسر بھی ان مکھیوں سے محفوظ نہ رہ سکا، کیوں کہ وہ ٹھوکر کھا کر گرنے والے ایک ہیلتھ آفیسر کے اوپر جھک گیا تھا۔ یہ عجیب سا عالم تھا۔ ہر ایک جدھر سر اٹھا بھاگ رہا تھا۔ اور دوسرے لوگ دور سڑک کو عبور کر کے حیرت و خوف سے سمٹے ہوئے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔

"مُم...؟ مکھیاں ... پلیگ کی ...؟" کانفرنس کا سکریٹری حلق پھاڑ کر دوسروں کی آگاہی کے چلایا، لیکن اس کے الفاظ کا ردِعمل اور زیادہ خطرناک تھا۔ دور سے یہ سنتے ہی لوگوں کا برا حال ہو گیا۔ وہ منتشر ہو کر اس بری طرح بھاگے کہ انھیں یہ بھی ہوش نہ رہا کہ ان کے پیروں تلے کون کچل رہا ہے اور پھر ذرا سی دیر میں اس نامعلوم دہشت کا اثر دور دور تک پھیل گیا۔ لوگ اپنے مکانوں کی کھڑکیاں اور دروازے دھڑا دھڑ بند کرنے لگے۔ اور سڑکیں سونی ہونے لگیں۔ چند حقیر مکھیوں مے ذرا سی دیر میں ایک ایسی لرزہ خیز سنسنی پھیلا دی جو کسی فضائی حملے کے وقت بھی شہر میں پیدا ہوتی۔ کارپوریشن کی پوری عمارت اک دم ویران ہو گئی تھی۔ لوگ کام کرتے کرتے اٹھ کر بھاگ گئے تھے۔ مگر اس سراسیمگی کے عالم میں بھی ڈاکٹر مارٹن کانفرنس ہال میں ہی رہ گیا تھا۔ وہ پولیس اور گورنمنٹ اسپتال کو فون کرنے کے لیے بار بار ڈائل گھما رہا

تھا اور بد قسمتی سے دونوں لائنیں ابھی تک خالی نہ ملی تھیں۔ اس تمام بھگدڑ کو شروع ہوئے ابھی با مشکل پانچ سات منٹ ہی ہوئے تھے، لیکن اتنی دیر میں یہ خبریں شہر کے وسطی علاقے تک جا پہنچی تھیں اور بازار سونے ہوئے جا رہے تھے۔

بالآخر ڈاکٹر مارٹن کو گورنمنٹ اسپتال کا نمبر مل گیا۔ دوسری طرف فون پر ڈاکٹر باسو تھا۔

”میں ان خوں خوار مکھیوں کے مہلک حملے کا شکار ہو چکا ہوں، ڈاکٹر۔ مگر خدا کے لیے دوسروں کو فوراً امداد بھیج کر بچاؤ۔ یہ مکھیاں پلیگ کی عام طور پر پائی جانے والی مکھیوں سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ شاید وہ بہت زیادہ غضب ناک ہو سکتی ہیں۔ انھیں ستا کر رکھا گیا ہوگا“ ڈاکٹر بولتا گیا۔

”میں خود ہی ایمبولینس گاڑیاں اور فوری روک تھام کے انجکشن لے کر آ رہا ہوں۔“ ڈاکٹر باسو نے دوسری طرف سے کہا۔

”کانفرنس میں موجود لوگوں میں سے شاید ہی کوئی ان کے حملے سے بچا ہو۔ پروٹیکٹیو یونیفارم کی یونٹ بھی فوراً بھیج دو تا کہ وہ ان دہشت زدہ آدمیوں کو بھاگنے سے روک سکیں۔“

”میں سب انتظام کیے دیتا ہوں۔“ ڈاکٹر باسو نے فون کا سلسلہ منقطع کرتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر نے فوراً ہی پولیس ہیڈ کوارٹر کا نمبر ملا لیا۔ اتفاق سے اس وقت خود سپرنٹنڈنٹ خان ہی فون پر موجود تھا۔

”سپرنٹنڈنٹ، ہمارے ساتھ بہت خوف ناک فریب کیا گیا ہے۔ پلیگ کی مکھیاں ہمارے پیچھے چھوڑ دی گئی ہیں۔ آپ اپنا آدمی بھیج کر فوراً اس مقام کی ناکہ بندی کرا دیجیے، ورنہ نا دانستگی میں دوسرے لوگ بھی ان کے حملوں کا شکار ہونے لگیں گے۔“ ڈاکٹر بولا۔

”یہ تو بڑا غضب ہو گیا۔ خیر میں خود موقع پر آ رہا ہوں۔“ سپرنٹنڈنٹ نے تشویش

ناک لہجے میں جواب دیا۔

”پروٹیکٹیو یونیفارم پہن کر آیے، ورنہ کہیں آپ لوگ بھی لپیٹ میں نہ آجائیں۔“
ڈاکٹر نے مرض کے بڑھتے ہوئے اثر سے متاثر ہو کر ڈوبتے لہجے میں اسے مشورہ دیا۔

”او کے۔“ خان کا جواب ملا اور ڈاکٹر تھکے ہوئے انداز میں ریسور فون پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکھڑاتا ہوا وہ چند قدم چلا اور دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک بار آگے کی طرف جھونک میں آ کر فرش پر گر پڑا۔ سات آٹھ مکھیاں اس سے آلپٹیں اور وہ کسی دریا میں ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح کانپتے ہاتھوں سے انھیں بھگانے کی کوشش کرتا ہوا بے ہوش ہو گیا۔

پندرہ بیس منٹ کے اندر اندر ہی پولیس نے میڈیکل ایسوسی ایشن کی عمارت کے گرد تقریباً ایک ایک فرلانگ کے علاقے میں محاصرہ قایم کر لیا۔ گزرگاہیں اور ٹریفک قطعی بند کر دیا گیا۔ پولیس کے آدمی سینے سے نیچے کے بدن کو تمام تر ڈھک کر پورے پروٹیکٹیو یونیفارم پہن کر آئے تھے۔ خود خان بھی اس وقت اسی یونیفارم میں تھا۔ ڈیسوزا اس کے ساتھ تھا، البتہ رؤف وغیرہ کا پتا نہ تھا۔ شاید وہ کسی اور طرف مصرف تھے۔

اسی وقت گورنمنٹ اسپتال سے طبی امداد آ پہنچی، جراثیم کش آلات اور ادویات سے لیس۔ اینٹی پلیگ فائٹنگ اسکواڈ آ پہنچا اور اس کے آدمی اسپرے پمپس اور جراثیم کش گیس ٹیوبس لے کر کانفرنس ہال کی طرف دوڑ پڑے۔ انھیں چند آدمی باہر سیڑھیوں کے نیچے بے ہوش پڑے نظر آئے۔ آئندہ موت کی دہشت سے یہ لوگ بھاگتے بھاگتے بے ہوش گر پڑے تھے۔ کچھ ہوش کے عالم میں اٹھائے گئے۔ اور کان نے بے ہوش ڈاکٹر مارٹن کو اسٹریچر پر باہر بھیجتے ہوئے اس ہلاکت خیز چھوٹے صندوق کو اپنے قبضے میں کر لیا جو بے گناہوں کی ان گنت موتیں اپنے اندر سمیٹ کر یہاں تک لایا گیا تھا۔ اور جس وقت پولیس اور طبی یونٹیں یہاں اس کاروائی میں مصروف تھیں، شہر بھر میں اس واقعے نے ایک کھلبلی مچا دی تھی۔ اور ریلوے اسٹیشن کی طرف

جانے والے تمام راستوں پر حیران و پریشان لوگ گاڑیوں میں اور پیدل دوڑتے نظر آرہے تھے۔ شاید وہ اس بلا کے ان تک پہنچنے سے پہلے اس شہر سے ہی نکل جانا چاہتے ہوں۔ ایک عجیب بے بسی کا عالم تھا، جس میں ہراساں ہو کر بھاگ نکلنے والوں میں سے بعض نے تو اپنے ساتھ کسی قسم کا سامان تک نہیں لیا تھا۔ ان میں بوڑھے بھی تھے، جوان بھی، بچے بھی تھے، عورتیں بھی۔ جان کسے عزیز نہیں ہوتی۔

شام تک شہر میں بھگدڑ کا وہی عالم تھا۔ طاعون جیسی وبا کے نام سے ہی لوگ کانپ اٹھتے تھے۔ آج کے اس لرزہ خیز واقعے نے تو ان کے حوصلے ہی پست کر دیے تھے۔ موٹروں پر، بسوں اور لاریوں میں اور ٹرینوں سے شہریوں کی ایک خاصی تعداد مضافات کی طرف ہجرت کر رہی تھی۔ شہر کے مختلف علاقوں میں اگرچہ محکمہ صحت عامہ، محکمۂ اطلاعات اور رابطہ عامہ اور پولیس کی گاڑیاں لوگوں کو صبر و ہمت سے کام لینے کی تلقین کرتی پھر رہی تھیں۔ سرکاری احتیاطی اقدامات کا انھیں یقین دلا رہی تھیں، لیکن جان جیسی پیاری چیز کوئی اس طرح خطرے میں ڈالنے کو تیار نہ نظر آتا تھا۔ اس ہیجان سے صرف شہر کے بعض دور پھیلے ہوئے علاقے ہی اب تک محفوظ تھے۔ اور زیادہ وہ لوگ راہِ فرار اختیار نہیں کر رہے تھے جن کے محلوں میں پہلے سے محکمۂ صحت نے مخالف پلیگ تدابیر اختیار کر لی تھیں۔ لوگ اینٹی پلیگ ویکسینیشن لے چکے تھے اور اینٹی پلیگ انجیکشن تو اب مضافات تک دیے جا رہے تھے۔

مگر سہ پہر کو جب اخباروں میں ان پلیگ کی مکھیوں کے حملے کے علاوہ یہ خبر بھی شائع ہوئی کہ پلیغ کے انجیکشنوں کا سرکاری اسٹاک قریب الختم ہے اور عام طور پر خیال کیا جا رہا ہے کہ انجیکشنوں کی کافی تعداد نامعلوم طریقے سے چور بازار میں چلی گئی ہے تو پبلک اور پریشان ہو گئی۔

ان تمام ہنگاموں میں سہ پہر سے اب تک سپرنٹنڈنٹ خان کا پتا نہ تھا۔ بالے کو بھی اس وقت یہ خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہے۔ خان کی ہدایت کے مطابق وہ اس وقت گورنمنٹ اسپتال

میں موجود تھا اور رؤف بھی اس کے ساتھ ان وارڈوں کی نگرانی کر رہا تھا جن میں آج کے اس عجیب وغریب اور سنسنی خیز واقعے کے مریض محکمۂ صحت کے افسران، طبی مشیر اور ڈاکٹر مارٹن تھے۔ ڈاکٹر مارٹن کو ایک علاحدہ کمرے میں رکھا گیا تھا، کیوں کہ ایک غیر ملکی مہمان ہونے کے علاوہ وہ اس سلسلے میں رضا کارانہ مدد کے لیے آ کر اس آفت کا شکار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر باسو اور ڈاکٹر سریواستوا جو اس وقت یہاں بلوا لیے گئے تھے، خود ڈاکٹر مارٹن کا علاج کر رہے تھے اور انھیں حیرت انگیز طور پر یہ خوشی تھی کہ اب تک ڈاکٹر مارٹن کے طاعون کی گلٹیاں نہیں ابھری تھیں۔ ڈاکٹر سریواستوا ابھی بالے کو بتا چکے تھے کہ شاید ڈاکٹر مارٹن بچ جائیں گے۔ ڈائرکٹر محکمۂ صحت عامہ کے لیے بھی یہی رائے تھی۔ البتہ محکمۂ صحت عامہ کے تینوں افسران کی حالت بالکل نازک تھی۔ ایک ختم ہو چکا تھا اور مہمان ماہرین میں سے بھی کسی کی حالت قابلِ اطمینان نہ تھی۔

سپرنٹنڈنٹ خان اس وقت اپنے اسٹڈی روم میں دروازے اندر سے بند کیے ایک ٹیبل پر بیٹھا تھا۔ باہر نوکر حیران حیران ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔ اسے اسی طرح کمرے میں بند دو تین گھنٹے ہو چکے تھے اور ان میں سے کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ دروازہ کھٹکھٹائے۔ اس کی میز پر دو بہت تیز روشنی کے نصف دائرے کی شکل کے ٹیوب اس صندوق کے دونوں طرف لگے ہوئے تھے جو وہ کانفرنس ہال سے اٹھا کر لایا تھا۔ ان ٹیوبوں کی تیز روشنی کی گرمی سے اس کے ماتھے سے بار بار پسینے کے قطرات ڈھلکنے لگتے جنھیں وہ رول سے پونچھتا جاتا۔ باکس کے اندرونی خالی حصے میں بھی ویسے ہی ٹیوب لگے تھے جو اوپر والے ٹیوبس سے زیادہ روشن تھے۔ اور اس عجیب روشنی کی کرنیں اس باکس کی لکڑی سے اس طرح پار ہو رہی تھیں جیسے وہ کوئی ریشوں والا شیشہ ہو۔ باکس سے کچھ اوپر انلارجمنٹ لینس والا ایک خاص کمرہ جو خان کی ذاتی ملکیت تھا، فٹ کیا ہوا تھا اور وہ اسے بار بار اوپر نیچے کر رہا تھا۔ بالآخر اس روشنی کے اثرات سے باکس کی لکڑی پر کئی خفیف سے نشانات ابھر آئے۔ یہ کئی انگلیوں اور انگوٹھیوں

کے نشانات تھے۔ اس وقت خان نے ٹیبل میں لگا ہوا ایک چھوٹا سا سوئچ دبا دیا اور روشنی کی رنگت تبدیل ہو کر ڈم ہونے لگی۔ جس کے ساتھ ہی اس کا کیمرہ بھی اپنا کام کرنے لگا۔ پھر چند سیکنڈ بعد اس نے روشنیاں بجھا دیں اور کمرے کی چھت گیر لائٹ کا سوئچ آن کر دیا۔ اس عمل سے فارغ ہو کر وہ اٹھا اور اپنی بک ریک میں رکھی ہوئی کتابیں ٹٹولنے لگا۔ چند منٹ بعد جو کتاب اس کے ہاتھ لگی، وہ ایک موٹی سی ڈائرکٹری تھی۔ وہ اسے لے کر پھر میز پر آ بیٹھا۔ اس ڈائرکٹر میں تمام دنیا کی ہر شعبۂ تجارت کی بڑی بڑی فرموں کے نام، پتے اور خصوصیات درج تھیں۔ ایک سادے کاغذ پر اس نے ان میں سے ان تمام فرموں کے نام اور پتے اتار لیے جو ادویات کی تجارت سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ فہرست جیب میں ڈال کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جیسے ہی وہ باہر نکلا، غلام رسول نے اسے خبر دی کہ انسپکٹر شاہ باہر دیر سے انتظار کر رہا ہے۔ خان نے صرف، ہُم، کہہ کر اپنا کھونٹی پر ٹنگا ہوا کوٹ اتار کر کندھے پر لادا اور ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ شاہ اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔

"یس، مسٹر شاہ۔" خان نے اس کے سلیوٹ کا جواب سر کے اشارے سے دیا۔

"سر، میں نے اس آدمی کا پیچھا کیا تھا، جو وہا کس کانفرنس ہال میں بھیج کر لوٹا تھا۔" شاہ نے بتایا۔

"پھر...؟" خان بولا۔

"وہ ایکسیڈنٹ کا شکار ہو گیا۔" شاہ نے بتایا۔

"کیسے؟"

"شاید اس کی گاڑی کے بریک کسی نے بور کر دیے تھے۔"

"تو اس کا مطلب یہ کہ اس وقت کانفرنس ہال کے باہر کوئی موجود تھا، جب وہ گاڑی سے اترا ہوگا؟"

"میرا بھی یہی خیال ہے، سر۔"

"تو..." خان سوچنے لگا۔ "مگر خیر، اس طریق کار سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کار آمد تو صرف وہی ہو سکتا تھا۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"خیر، تم نے کیا نتیجہ نکالا؟" خان نے پھر کہا۔

"مجھے اس آدمی پر شبہ ہو گیا تھا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ حادثے کے بعد اس کی لاش دیکھنے پر مجھے یاد آ گیا، وہ سالوس تھا۔"

"سالوس، کے سی کا آدمی؟"

"یس، سر۔"

"کے سی..." خان بڑبڑایا۔ "میں اس کو قطعی بھول گیا تھا۔ خیر، میں نپٹ لوں گا۔ تم یہ فہرست لے کر سول سپلائز اینڈ انڈسٹریز کے آفس چلے جاؤ۔ وہاں یہ معلوم کرو کہ ان میں سے کس کس سے ہمارے کون کون سے تاجران کے کاروباری تعلقات ہیں۔" خان نے جیب سے فہرست نکال کر اس کے حوالے کر دی۔

"بہتر ہے۔" انسپکٹر شاہ نے سلیوٹ کیا اور باہر نکل گیا اور خان کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا اپنی جیبیں ٹٹولتا برآمدے میں آ گیا۔

☆☆☆☆☆☆

کچھ دیر بعد اس کی کار پولیس ہیڈ کوارٹرز کی طرف دوڑ رہی تھی۔ اور جس وقت اس کی گاڑی آفس کے باہر پہنچ کر رکی تو دروازے کے باہر کھڑا ہوا انسپکٹر ڈیسوزا سلام کرتا ہوا قریب آ گیا۔

"سر، اس لڑکی نے اودھم مچا رکھا ہے۔" وہ بولا۔

"کیوں؟"

"کچھ کھاتی ہے نہ پیتی ہے۔ کوئی پوچھنے جائے تو کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ وو

حوالداروں کے منہ پر تھوک چکی ہے۔" ڈیسوزا نے سادگی سے بتایا۔

"اتنی سی لڑکی نہیں سنبھل رہی تم لوگوں سے۔" خان مسکرایا اور پھر اس کا رخ حوالات کے اس علاحدہ کمرے کی طرف ہو گیا، جس میں سب سے الگ وہ لڑکی بند تھی، جسے نرس کے لباس میں اسپتال سے گرفتار کیا گیا تھا۔ حوالات پر موجود سنتری اسے دیکھتے ہی سلام کرتا ہوا ایک طرف ہٹ گیا۔ ایک حوالدار نے آگے بڑھ کر جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ وہ خان کو دیکھتے ہی کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی، لیکن خان نے اس سے پہلے کہ لڑکی کا ہاتھ اس کے گریبان تک پہنچتا اپنے مضبوط ہاتھ سے اس کی کلائی تھام لی اور وہ بے بس سی ہو گئی۔

"لڑکی، میں تمہیں صرف صبح تک کا وقت اور دیتا ہوں۔ ورنہ میرے پاس بھی ایسے ایسے انجکشن ہیں جو پاگلوں کا دماغ درست کر کے ان سے سب قبلوا لیتے ہیں۔" خان نے یہ کہہ کر اس کا ہاتھ ایک طرف جھٹک دیا اور دروازے کی طرف لوٹنے لگا۔

"پاجی، سور، حرامی، خرگوش کی دم، بلو کے اٹھے۔" وہ اسے ٹھیٹ ہندوستانی میں پیر پٹک پٹک کر گالیاں دیتی رہی، لیکن خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ دروازے تک آنے کے بعد وہ ایک بار پھر پلٹا۔

"یہ اداکاری تمہیں پھانسی کے تختے سے اور قریب کر دے گی۔ کے سی نے اقبالِ جرم کر لیا ہے۔" خان نے یہ کہہ کر دروازہ باہر سے بند کر دیا اور چلا گیا۔ لیکن خدا جانے اس کے الفاظ میں کون سی تاثیر تھی جس نے ایک لمحے کے لیے اس لڑکی کے چہرے کا رنگ بدل دیا۔ وہ گم سم سی ہو گئی۔ مگر اس کی یہ کیفیت زیادہ دیر نہ رہ سکی۔ رفتہ رفتہ وہ اعتدال پر آ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف سمٹ گئے اور وہ کسی فوجی آفیسر کے انداز میں حوالات میں چہل قدمی کرنے لگی۔

☆☆☆☆☆☆

اندھیرے میں

بالے اس وقت شدت سے بور ہو رہا تھا۔ نہ تو اب تک ہسپتال کی کسی خوب صورت نرس نے ہی اس کی طرف توجہ کی تھی، نہ ہی مریضوں کو دیکھنے آنے والے ان کے رشتے داروں میں کوئی چہرہ ایسا نظر آیا تھا جسے دیکھ کر اسے کسی رومان زدہ شاعر کا ایک آدھ شعر یاد آ جائے۔ خان نے اسے خاص طور پر ڈاکٹر مارٹن کے وارڈ کی نگرانی کے لیے مقرر کیا تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس معمولی سے کام کے لیے اسے کیوں خان نے یہاں بھیجا ہے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ڈاکٹر کے مرنے سے قبل ہی وہ اس کا فاتحہ پڑھ کر یہاں سے چلا جائے۔ مگر پھر اسے خان کی غضب ناک نگاہیں یاد آ جاتیں اور وہ منہ ہی منہ میں اس بے بسی پر ہزار بار لعنت بھیجتے ہوئے پھر وارڈ کے باہر لفٹ رائٹ کرنے لگتا۔ وہ اس وقت اپنے سادہ لباس اور صحیح شکل میں تھا۔ لیکن اسپتال کی نرسوں کو کیا خبر تھی کہ وہ وہی زندہ دل و رومان پسند پولیس سارجنٹ ہے جس کی شہرت وہ کبھی نہ کبھی اپنی کسی سہیلی سے ضرور سن چکی ہوں گی۔

”نرس۔“ وہ ایک گورے رنگ کی جوان سی لڑکی کو ٹوک بیٹھا۔

”یس، پلیز؟“ وہ چلتے چلتے ٹھہر کر پوچھنے لگی۔

”یہاں دل کے مریضوں کا وارڈ کون سا ہے؟“

”وہاٹ...؟ ہرٹ ٹربل...؟“ نرس نے معصومیت سے انگریزی میں کہا۔

”بالکل بالکل۔“

”ان کا ادھر الگ وارڈ نہیں ہائے۔ جنرل وارڈ میں دیکھو۔“ وہ یہ بتاتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ مگر پھر دو قدم چل کر پلٹ کر بالے کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ عجیب سی نظروں سے نیلے پٹے سے کسی ہوئی اس کی باریک کمر اور اس کے انداز خرام کو دیکھ رہا تھا۔

"آپ کو کس کو ملنے کا ہائے؟" نرس نے پوچھا۔

"ہائے کیا جانیے اس بت کی کمر ہے کہ نہیں۔" بالے ٹھنڈی سانس بھر کر شاعری کرنے لگا۔

"کس کا کمرہ؟" نرس نے کچھ نہ سمجھ کر اس سے استفسار کیا۔

"میرے سرکا۔" بالے اس غیر شاعرانہ کج فہمی پر جھنجلا گیا۔

اور وہ اسے چونک کر حیرت سے سر سے پیر تک دیکھتی ہوئی منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی چلی گئی۔

"ہیلو، سارجنٹ۔" ڈاکٹر باسو کی آواز نے بالے کو چونکا دیا۔ لیکن ڈاکٹر کی آواز سنتے ہی وہ نرس اس کمرے سے جس میں وہ داخل ہوئی تھی، پھر باہر نکل آئی۔

"سر۔" اس نے ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔ ڈاکٹر چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ آدمی ہم سے بھوت کا کمرہ پوچھتا تھا۔" اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"وہاٹ؟" ڈاکٹر نے عجیب سی نظروں سے نرس کی طرف دیکھ کر بالے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"بت کی کمر۔" بالے مسکرا کر بولا۔

"اوہ۔" ڈاکٹر بے اختیار ہنس پڑا۔ "تم اپنا کام کرو۔" اس نے نرس کی طرف دیکھ کر کہا اور وہ بالے کو گھورتی ہوئی وہاں سے کھسک گئی۔

"ڈاکٹر مارٹن کی حالت اس وقت خطرے سے باہر ہے۔"

"باقی لوگ؟"

محکمۂ صحت کا ڈائرکٹر بھی شاید بچ جائے گا۔ دو دوسرے آفیسرز بھی قابلِ اطمینان حالت میں ہیں، لیکن دو مریض دم توڑ رہے ہیں۔"

"اور اپنا بھی دم گھٹ رہا ہے یہاں، ڈاکٹر صاحب۔"

"تو ہوا میں چلے جاؤ۔" ڈاکٹری کہتا ہوا مسکرا کر آگے چل دیا اور بالے اپنی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتا رہ گیا۔ آج نہ جانے کس سنک میں وہ ٹائی باندھ کر آیا تھا۔ حالاں کہ وہ خود اس پھانسی سے گھبراتا تھا اور کبھی کبھی تو خطرناک مجرموں سے مقابلے کے وقت یہ ٹائی خود اس کے لیے ایک مصیبت ثابت ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ نرس پھر اس کمرے سے نکلی۔ اب کی بار اس کے ہاتھ میں ایک ایکسرے شیٹ تھی۔ لیکن خلافِ توقع وہ بالے کو دیکھ کر مسکرا دی۔

"ایوننگ۔" بالے نے اسے چھیڑ دیا۔

"ایوننگ۔" وہ کہتی ہوئی قریب آ گئی۔

"آپ ڈاکٹر صاحب کا دوست ہائے، ہم سمجھا تھا کوئی مریض کا آدمی ہائے۔" نرس نے معذرت کرنے والے انداز میں کہا۔ اس کے گلگوں رخساروں پر اس وقت ایک تمتماہٹ سی نمایاں تھی۔

"ہم مریض کا آدمی نہیں، مریض ہے نرس۔"

"آپ کو کیا ہوا ہائے؟"

"ہائے، یہ پوچھو کیا نہیں ہوا ہے۔ ہم کو جولیو رومیٹ۔ آئی ایم ساری رومیو جولیٹ ہو گیا ہائے۔" بالے نے عجیب طرح لہجہ بنا کر کہا۔ اور وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ اس کے موتی جیسے دانت چمکنے لگے اور بالے نے دیکھا ایسی بے اختیار اور کھلی ہنسی کے وقت اس کے رخساروں میں دونوں طرف خفیف سے گڑھے پڑ جاتے تھے۔ جن سے اس کا حسن دوبالا ہو جاتا۔ قریب سے دیکھنے پر وہ اور زیادہ پرکشش اور خوب رو معلوم ہوتی تھی اور اس سے شناسائی ہو جانے پر بالے کی بوریت کسی حد تک ختم ہو چلی تھی۔

"وری انٹرسٹنگ۔" اس نے اپنی شربتی آنکھیں ایک ادائے محبوبانہ سے سکوڑتے ہوئے کہا۔

"ایم آئی؟" بالے خود کو ٹٹولنے لگا۔

"آف کورس۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"جی چاہتا ہے تمہارے اسپتال میں بھرتی ہو جاؤں۔"

"کیوں؟"

"تم سے باتیں کرنے کو۔"

"شریر لڑکے۔" وہ قیامت خیز انداز میں کھڑے بل کھا کر بولی۔

"سچ۔"

"اس اسپتال میں آنے والا ہر نوجوان مریض یہی مکالمے دہرایا کرتا ہے۔"

"وہ سب الو کے پٹھے ہوں گے۔ میں ان میں سے نہیں ہوں۔"

"ڈاکٹر سریواستوا۔" نرس کاریڈور کے دوسرے سرے پر ڈاکٹر سریواستوا کو آتے دیکھ کر چونک پڑی۔

"مونجبی میں ملو گی؟"

"کب؟"

"۹ بجے۔"

"میری ڈیوٹی ساڑھے نو بجے ختم ہو گی۔"

"میں انتظار کروں گا۔"

اتنے میں ڈاکٹر سریواستوا قریب آ گیا۔

"نرس، وارڈ نمبر ۷ کا تیرھواں مریض میری اکلوتی اولاد ہے، اس کا ذرا خیال رکھنا۔" بالے نے فوراً گفتگو کا رخ بدل دیا۔

"کیا نام ہے اس کا؟" اجنبیت کے انداز میں نرس اس سے پوچھنے لگی۔

"ابراہیم۔" بالے ایک آنکھ دبا کر بولا۔ اور نرس، او کے، کہتی ہوئی چلی گئی۔ ڈاکٹر

سریواستوا نے دزدیدہ نظروں سے پہلے اسے پھر آگے بڑھ کر بالے کو دیکھا۔ بالے مسکرایا۔

”یہ اسپتال ہے، اچھے لڑکے۔“ ڈاکٹر نے قریب سے گزرتے ہوئے تبصرہ کیا۔

”ہارٹ ٹرمل، ڈاکٹر، ہارٹ ٹرمل۔“ بالے نے وہیں کھڑے کھڑے جواب دیا اور ڈاکٹر اسے ایسی تنبیہی نظروں سے جیسے بزرگ اپنے شریر بچوں کو دیکھا کرتے ہیں، دیکھتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ مگر اسی وقت خان کی کار کے ہارن نے اسے چونکا دیا۔

”لو، آئی مصیبت۔“ وہ بڑبڑا کر کھڑکی کی طرف پلٹا۔ خان کی کار نیچے رک رہی تھی۔ بالے لفٹ سے نیچے اتر آیا۔

”کیا رنگ ہے؟“ خان نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

”سفید۔“

”کیا مطلب؟“

”اسپتال میں ڈاکٹروں سے لے کر نرسوں، مریضوں اور نوکروں تک سب سفید ہی نظر آتے ہیں۔“

”یہاں کیا جھک مار رہے تھے اتنی دیر سے؟“

”ہائے، کیا خوب صورت نرس ہے۔“

”بھیجا پلپلا کر دوں گا تمہارا۔“ خان نے اسے گھور کر کہا۔

”کارآمد عشق ہے۔ ویسے آپ کی مرضی۔“

”بکو۔“

”میں نے اسے کئی بار ڈاکٹر مارٹن کے بیڈ تک جاتے دیکھا تھا۔“

”تو کہیں ڈاکٹر پر دوبارہ حملہ نہ کیا جائے۔“

”اسی لیے تو میں آپ کو فون کرنے کے لیے بھی یہاں سے نہیں کھسکا۔“

”اور اس وقت؟“

"اس وقت ڈاکٹر باسو ہیں گئے ہیں۔"

"کون ہے وہ نرس؟"

"اسی اسپتال کی ہے۔"

پھر وہ باتیں کرتے کرتے لفٹ کے ذریعے اوپر آگئے۔ اور کاریڈور میں ٹہلتے ہوئے ایک کھلی کھڑکی کے نزدیک جا کھڑے ہوئے۔

"آپ نے یقیناً اس غریب لڑکی پر کافی ظلم کیا ہوگا؟" بالے نے پھر سلسلۂ گفتگو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اس سلسلے کی ایک کڑی مل گئی ہے۔"

"وہ لڑکی؟"

"نہیں، کے سی۔"

"کے سی.. تو وہ تو کڑا ہوا، آپ کڑی فرما رہے ہیں؟"

"یہ بکواس کا وقت ہے؟"

"میں دواؤں کی بو سونگھتے سونگھتے شدت سے بور ہو چکا ہوں۔ میں نے موجنی کا پروگرام بنالیا ہے۔"

"تمہیں تو یہیں رہنا ہوگا۔"

"میں اس کھڑکی سے کود کر خودکشی کرلوں گا۔"

"کر دیکھو۔"

"ہائے، مگر آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ اس نرس نے مجھے موجنی میں ملنے کا وعدہ کیا ہے۔"

"اچھا...؟ تو پھر جاؤ۔"

"ارے، کیا واقعی؟"

"ہاں۔ میں تب تک تمہارے کریا کرم کی تیاری کرائے دیتا ہوں۔"

"شہیدانِ محبت کو نہیں حاجت ہے تربت کی۔ وہ بغیر تربت کے رفع حاجت کر لیتے ہیں۔" بالے نے شاعری شروع کر دی۔

"تم جیسے بے غیرت ہوں گے۔"

"نام عبدالرفو، تخلص تم۔ ڈیل ڈول میں ہاتھی سے کچھ کم۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے اس پروگرام سے پہلے اس لڑکی سے حوالات میں مل لو۔"

"کون سے حالات میں؟"

"بکومت۔ تم اس سے کس طرح ملو گے، آؤ میں تمہیں بتاؤں۔" کہہ کر خان اسے کونے کی طرف لے گیا۔ کچھ دیر تک دونوں کچھ سرگوشی کرتے رہے۔ اس کے بعد بالے کا منہ بن گیا۔

"اور اگر جوتے پڑ گئے تو...؟"

"صبر کر لینا۔"

"وہ جو کہا ہے کسی نے کہ..."

"کسی نے کچھ نہیں کہا ہے۔ تم دفع ہوتے ہو یا نہیں۔" خان نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اس وغیرہ وغیرہ کو بس ایک نظر اور دیکھ لینے دیجیے۔" بالے نے بچوں کی طرح ضد کی۔ مگر ڈاکٹر سریواستوا کی آمد نے سلسلۂ کلام منقطع کر دیا۔

"یہ بڈھا بڑا اخرانٹ ہے۔ میں چلا۔" بالے نے لفٹ کی طرف کھسکتے ہوئے کہا اور خان ڈاکٹر سریواستوا کی طرف بڑھ گیا۔

ڈاکٹر سریواستوا اور وہ ایک دوسرے کے پرانے واقف کار تھے، اس کے باوجود

خان کے نزدیک ڈاکٹر باسو زیادہ محتاط قسم کی شخصیت رکھتا تھا۔ وہ پہلے بھی بعض کیسوں کی تفتیش کے سلسلے میں اسپتالوں وغیرہ یا طبی مشورہ سے متعلق معاملات میں خان کا ہاتھ بٹا چکا تھا۔ خان نے اس معاملے میں صرف اسے اپنا رازدار بنایا تھا، لیکن ساتھ ہی خان کو ڈاکٹر مارٹن کا حشر دیکھ ڈاکٹر باسو کے لیے بھی یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں وہ نامعلوم اور بے رحم لوگ اسے اپنے غضب کا شکار نہ بنا ڈالیں۔ ویسے ڈاکٹر باسو خود ان معاملات کی خطرناک نوعیت سے واقف ہونے کے باوجود نڈر ہو کر خان کی مدد کر رہا تھا۔ نہ جانے کیوں یہ خیال ابھی ابھی اسپتال آتے ہوئے خان کے دماغ میں کھٹکا تھا اور اسی لیے وہ بالے کو بھیج کر خود یہاں ٹھہر گیا تھا۔ لاتعداد انسانوں کی زندگیوں کو کھلونا بنا کر کھیلنے والے وہ خوف ناک لوگ اب تک نامعلوم تھے۔ اور ان کا طریقِ کار بھی اب تک اس درجہ سے پراسرار رہا تھا کہ خان جیسے سراغ رساں کے لیے بھی ان کے بارے میں کوئی اندازہ تک قائم کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اب تک جو چند چیزیں اس کے ہاتھ لگی تھیں۔ وہ ہافکن انسٹیٹیوٹ کے جراثیم کے ذخیرے والے کمرے کی الماری کے کی ہول میں پایا جانے والا پن کا ٹوٹا ٹکڑا، ایک سنہری بال، اسی کمرے کے روشن دان کے نیچے ایک چھوٹے سے زنانہ پیر کا نشان اور ڈاکٹر بٹلر کی کار کے ڈیش بورڈ میں آٹو میٹک فائرنگ سسٹم والے تھری اے سنگل مخصوص ساخت کے ریوالور کے علاوہ سالوں کی شناخت کے ساتھ کے سی کے ملوث ہونے کا شبہ اور گرفتار شدہ نرس۔ بس یہی نامکمل اور غیر منسلک چیزیں تھیں جنہیں وہ اب تک کسی سراغ کے سلسلے میں نہیں جوڑ سکا تھا۔

اب کم از کم اس کے لیے یہ بات تو واضح ہو گئی تھی کہ انسٹیٹیوٹ سے پلیگ کے کیڑوں کی چوری پہلے سے منظم کردہ کسی بہت بڑی سازش کا نتیجہ تھی اور یہ سارے واقعات کسی نہ کسی طرح اس سے مربوط ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر بٹلر کی موت، کیوں کہ وہ ضرور اس سازش یا اس سے متعلق کسی شخصیت کے بارے میں کچھ جانتا ہو گا۔ پھر ڈوری کو کسی بھی فوری دوا یا انجیکشن یا کسی نامعلوم اثر سے شاید اس لیے پاگل بنا دیا گیا ہو کہ وہ بھی اس شخصیت یا اس سلسلے کی کسی چیز سے

واقف ہو۔ ڈاکٹر ھشیم کی موت زیادہ غور طلب نہ تھی، کیوں کہ وہ اس نامعلوم خوف ناک طاقت سے کسی نہ کسی طرح کوئی تعلق رکھتا تھا اور گورنمنٹ اسپتال میں ڈوری جیسی نئی مریضہ کی کیفیت سے اس کی دل چسپی ایک خطرناک ارادے کا مظہر تھی۔ وہ ضرور اسے اسی طریقے پر ختم کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوگا، جس طریقے پر گرفتار شدہ لڑکی نے نرس کے لباس میں کوشش کی تھی۔ خان کے خیال کے مطابق ڈاکٹر ھشیم کو اس لیے ختم کیا گیا تھا کہ وہ اس کام کی تکمیل میں جھجک گیا تھا۔ اس نے پہلا موقع گنوا دیا تھا۔ اور ان تہلکہ خیزیوں کے پس پشت جس نامعلوم طاقت کا ہاتھ تھا وہ اتنی بے وقوف نہیں ہو سکتی تھی کہ ایک ایسے بزدل آدمی پر اور بھروسا کر کے دوسروں کو شبے کا موقع دے۔

نقلی ڈوری کو ختم کرنے کی کوشش میں گرفتار کی جانے والی اس لڑکی کے پاس سے جو چھوٹا سا سوئی نما سرنج برآمد ہوا تھا، اس میں کون سا مادہ بھرا موجود تھا، یہ جاننے کے لیے خان نے اسے سرکاری کیمیکل اینالائیزر کے پاس بھیج دیا تھا۔ باہر کے لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس لڑکی کے پاس سے اور کچھ برآمد ہوا تھا یا نہیں۔ خان نے اس سلسلے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔

وہ گاڑی بھی پہچانی جا چکی تھی، جس پر کانفرنس ہال میں پلیگ کی مکھیوں کا بکس پہنچا کر لوٹنے والا سالوس ختم کیا گیا تھا۔ وہ ایک پرانی پرئیوٹ ٹیکسی تھی جو اکثر ونسنٹ اسکوائر پر کھڑی دیکھی جا چکی تھی۔ خان کے تمام خاص اسسٹنٹ جن میں انسپکٹر ڈیسوزا، انسپکٹر شاہ، سب انسپکٹر سانے، انسپکٹر رازداں، سب انسپکٹر راج، انسپکٹر چوپڑا، رؤف اور ابراہیم واسرا سب ہی بڑی جانفشانی سے اس کی ہدایتوں کے مطابق سرگرم کار تھے۔ لیکن خفیہ پولیس کے شہر کے چپے چپے تک پھیلے ہوئے اس مضبوط جال کی خود پولیس کے اعلیٰ حکام تک کو پوری طرح خبر نہ تھی۔ یہ جان کر کہ اس بار سامنا ایک بہت منظم اور بہت وسیع اثرات و ذرائع رکھنے والی ایسی طاقت سے ہے جو جدید ترین سائنٹفک طریقِ کار کی حامل ہے، خان نے بھی اپنی اور اپنے محکمے کی تمام جدوجہد کو صیغۂ راز میں رکھا تھا۔ حتیٰ کہ پریس اور پبلک کو بھی جو اطلاعات ملتیں، وہ اصل

حالات سے قطعی مختلف اور مصلحت کے پہلو لیے ہوئے ہوتیں۔

اس بار خان کا رویہ کچھ اتنا عجیب تھا کہ حکام اعلیٰ اسے اس کی پریشان خیالی سے تعبیر کر رہے تھے۔ وہ اپنے محکمے کے ایسے نکمے افسروں کی پھبتیاں بھی سن رہا تھا کو خود کام کے معاملے میں اس کے اسسٹنٹس کے پاسنگ بھی نہ تھے اور جنہیں کوئی بڑا کیس سر پر آتے ہی بخار سا آنے لگتا تھا۔ مگر وہ بڑی خموشی اور سکون کے ساتھ تمام تنقیدیں برداشت کر رہا تھا۔ اس کی ان سرگرمیوں کو 'منگ' اور اس کے پلیگ کے کیڑوں کی چوری سے متعلق اعلیٰ افسران کو پیش کردہ اس کی ابتدائی رپورٹس کو 'تضیع اوقات' کہا جا رہا تھا، لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا تھا اور اگر صرف انسپکٹر جنرل پولیس کو خان کی صلاحیتوں اور اس کے طریقِ کار پر پورا بھروسا نہ ہوتا اور وہ اسے براہِ راست اور ضروری اقدامات کے اختیارات نہ دے دیتا تو واقعات کو قدرتی طور پر پھوٹ پڑنے والی طاعون کی وبا کا نام دے کر کبھی کا پولیس ڈپارٹمنٹ سے غیر متعلق قرار دے دیا گیا ہوتا۔

مگر محکمہ صحت کی کانفرنس میں جو لرزہ خیز واقعہ ہوا اس نے آئی جی اور ڈی آئی جی کے تمام افسران۔ پریس اور ان لوگوں کو بھی چونکا دیا جو اب تک ان حالات کو کوئی اہمیت دینے کو تیار نہ تھے۔ پھبتیاں کسنے والوں کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی اور وہ جو اب تک زبردستی ان اقدامات کی مخالفت کرتے آ رہے تھے، اس طرح گم سم ہو گئے، جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

خان اب بھی ایک مضبوط چٹان کی طرح اپنی جگہ جما ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے خوف ناک اور پراسرار لوگ جو علی الاعلان کانفرنس ہال میں صرف چند حقیر مکھیوں کے ذریعے موت کا اس قدر خوف ناک ڈراما کھیل سکتے ہیں، جو ڈاکٹر بٹلر، ڈاکٹر ہشیم اور دوسروں کی جانوں سے اس قدر دیدہ دلیری سے کھیل سکتے ہیں اور پھر بھی قانون اور انصاف کی دسترس سے محفوظ ہیں۔ وہ کسی وقت خود اس کی جان کے بھی درپے ہو سکتے ہیں۔ ایسے نامعلوم اور وسیع ذرائع رکھنے والی ایک پراسرار طاقت سے ٹکر لینا، خود کو جیتے جی موت کے منہ میں دھکیلنا تھا۔ لیکن خان اور اس کے اسسٹنٹ شاید اس مادے کے بنے ہوئے تھے جس میں خوف و مایوسی

کے جراثیم نہ کلبلائے ہوں۔ ہزاروں بے گناہ انسانوں کی جانیں اس خوف ناک عفریت کے پنجے سے بچانے کے لیے جو خدا جانے اپنے کس مقصد کی خاطر موت کا بازار گرم کیے ہوئے تھا، وہ اپنی جانیں داؤ پر لگا کر مصروف کار تھے۔ بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے قدم قدم پر وہ خوف ناک طاقت پولیس اور اس کے مانے ہوئے سراغ رسانوں کو شطرنج کے مہروں کی طرح نچاتا ہو، اور جیسے اس کے کسی اشارے پر بھی ان کی جانیں لی جا سکتی ہوں۔ لیکن کون کتنی گہرائی میں تھا، یہ کوئی نہ جانتا تھا۔ یہ ضرور تھا کہ اس نامعلوم طاقت کے مقابلے میں اس بار خان جس قدر سنجیدہ جس قدر پرجوش اور بعض اوقات جس قدر غضب ناک ہو جاتا اس سے پہلے وہ ایسا کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ اس بار اس کے آہنی عزائم کو ایک کھلا چیلنج ملا تھا۔ اس طاقت کی طرف سے جو چاہے تو ان گنت جانوں کی طرح اسے اور اس کے ساتھیوں کو بھی اپنی چٹکیوں میں مسل سکتی تھی۔ لیکن وہ ایسا اب تک کیوں نہیں کر سکی تھی۔ یہ جن کی سمجھ میں نہ آتا وہ سوچنا چھوڑ دیتے اور جن کی سمجھ میں آ جاتا وہ خان کی ان ناقابل تسخیر صلاحیتوں کے خود ہی قائل ہوتے جاتے جن کے بوتے پر وہ مٹھی بھر قانون کے سپاہیوں کو لے کر امن و سلامتی اور عوامی جانوں کے اتنے بڑے اور خوف ناک دشمن کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے سرگرم کار تھا۔ بظاہر احساسات موت کے ان ننھے ننھے سایوں کے تصور سے بھی لرز رہے تھے جو طاعون کے جراثیم کی شکل میں ایک قتلِ عام کا ڈرامہ کھیلنے نکل پڑے تھے۔

"ڈاکٹر۔" خان نے ڈاکٹر باسو کو وارڈ نمبر ۲ سے باہر آتے دیکھ کر پکارا۔

"اوہ، آپ۔" وہ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہوا قریب آ گیا۔ لیکن ابھی وہ گفتگو نہیں کر پائے تھے کہ وہ نرس بھی اس وارڈ سے نکل آئی۔

"اب آپ جا سکتی ہیں، مس بورکر۔" خان اس کی صورت دیکھتے ہی بولا۔

"بالے صاحب مجھ سے موبجنی میں ملنے کا وعدہ لے کر گئے ہیں۔" نرس نے مسکرا کر کہا۔

"بس یہی تو ایک کمزوری ہے اس کمبخت میں۔" خان نے ہنس کر کہا۔ "اس نے بہر صورت آپ کو پہچانا نہیں ہے۔ آپ موتجنی جا سکتی ہیں، ممکن ہے آپ کی مدد کی ہی ضرورت پڑ جائے۔" خان آہستہ سے بولا۔

"تو کیا موتجنی...؟"

"یہ پھر بتاؤں گا۔ ویسے اچھا ہی ہے کہ آپ وہاں پہنچ ہی جائیں۔"

"ضرور جاؤں گی جب آپ کا حکم ہے۔" وہ مودب لہجے میں بولی۔

"جہاں تک ممکن ہے بالے کو اپنے بارے میں مغالطے میں ہی رکھیے گا تا کہ آپ میں سے ایک مدد کے لیے محفوظ رہ سکے۔"

"لیکن کیا ایسی جگہ ایک عورت کوئی خاص مدد کر سکے گی؟" ڈاکٹر باسو نے پوچھا۔

"یہ بات نہیں، بلکہ اس طرح ایک تو وہ وہاں زیادہ دیر بیٹھ سکے گا، اس کے علاوہ ممکن ہے وہاں ایک لڑکی اور آئے۔"

"خیر، آپ کے کام آپ بہتر جان سکتے ہیں۔ میں نے تو یوں ہی کہہ دیا ہے۔"

"آپ جا سکتی ہیں، مس بورکر۔" خان نے لڑکی کی طرف پلٹ کر کہا۔ اور وہ ہاتھ کے اشارے سے سلام کر کے لفٹ کی طرف چلی گئی۔

"ڈاکٹر، کیا ایک موم بتی ملے گی؟" خان نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"موم بتی...؟ ہاں، مگر کیوں؟"

"کچھ ضروری کام ہے۔"

"میرے آفس میں میز کی دراز میں ہوگی۔ یہ لیجیے چابی۔ میں وارڈز کا ایک چکر لگا کر آتا ہوں، یہ میرے معائنے کا وقت ہے۔"

"لیکن ذرا احتیاط سے۔"

"کیا مطلب؟"

”مس بورکر اب تک آپ کی ور ڈاکٹر مارٹن کی ہی حفاظت کر رہی تھی۔ اور بالے آنے جانے والاں کی نگرانی پر تھا، لیکن اب دونوں نہیں ہیں۔“

”اوہ، لیکن آپ تو ہیں۔ کیا آپ کی موجودگی میں بھی مجھے خطرہ ہے۔ پھر آپ کی جان سے تو زیادہ میری زندگی قیمتی نہیں۔“

”لیکن آپ کی جان عوام اور خود ہمارے لیے تو بہت قیمتی ہے۔“

”بہتر ہے، میں لحاظ رکھوں گا۔“ ڈاکٹر یہ کہتا ہوا مسکرا کر چلا گیا اور خان ڈاکٹر کے آفس میں داخل ہوگیا۔ اس نے اس کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ چند منٹ بعد ہی آفس سے پھر باہر نکلا۔ اس نے اندر کی لائٹ آف کر دی تھی۔ دروازے میں تالا لگا کر وہ چاروں طرف نظر دوڑاتا ہوا کچھ دور چل کر اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ اب وہ دوسرے کاریڈور سے گھوم کر اس کمرے کی پشت پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے پچھلی کھڑکی کھولی اور اندر داخل ہوگیا۔ آفس میں اتنی تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا تھا۔ راستہ ٹٹولتا ہوا پشت پر دیوار سے ملی کھڑی ہوئی الماری کی آڑ میں چلا گیا اور یہاں دم سادھ کر دیوار سے ٹک کر کھڑا ہوگیا۔ اس وقت اس کی کلائی پر بندھی ہوئی زینتھ کے ریڈیم ڈائل میں ساڑھے آٹھ بج رہے تھے اور یہ وہ وقت تھا جب روزانہ ڈاکٹر باسو تمام وارڈوں کا چکر لگا کر مریضوں کا معائنہ کرتا تھا۔ وہ اسپتال کی رات کی شفٹ کا انچارج بھی تھا۔

ابھی اسے اس کیفیت میں بمشکل دس بارہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ کسی کھٹکے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ اور کونے میں سمٹ گیا۔ پھر دروازے کی خفیف سی چرچراہٹ کے ساتھ کاریڈور کی ٹھنڈی روشنی کی باریک سی کرن دروازے سے چھن کر اندر پڑی اور خان نے دیکھا ایک سایہ اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے دروازہ پھر اندر سے بند کر دیا، لیکن اس احتیاط سے کہ اس کی آواز بھی نہ ہو سکی۔ اب اس نے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی اور محدود دائرۂ انعکاس والی ٹارچ سے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ خان روشنی کے اس دائرے کی زد میں

آنے سے بال بال بچ گیا۔ پھر وہ سایہ جلدی سے ڈاکٹر کی ٹیبل پر بیٹھ کر ٹارچ کی روشنی سے اس پر موجود چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔ پھر وہ ڈاکٹر کی کرسی کو ٹٹولنے لگا۔ اسی وقت اتفاق سے باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور سایہ دوڑ کر اس الماری کی طرف آنے لگا جہاں خان کونے میں چھپا ہوا تھا۔ خان نے جیب میں ہاتھ ڈال کر فوراً پستول نکال لیا۔ لیکن وہ بجائے الماری کی آڑ لینے کے پچھلی کھڑکی تک پہنچ کر رک گیا۔ اس نے کھڑکی کی چٹخنی کھول لی اور ایک منٹ تک کھڑکی سے لگا کھڑا رہا۔ وہ آہٹ کاریڈور سے گزرنے والے کسی آدمی کی تھی۔ دوبارہ یہ اطمینان کر لینے کے بعد آنے والا اس کمرے سے تعلق نہیں رکھتا، وہ سایہ پھر آگے بڑھا۔

اس نے اپنی چھوٹی سی ٹارچ اس میز پر اس طرح رکھ دی کہ اس کی روشنی ڈاکٹر کی خالی کرسی کے تکیے پر پڑنے لگی۔ پھر اس نے جیب سے کوئی سیاہ سی چھوٹی سی چیز نکالی اور اسے کسی اوزار سے کرسی کے تکیے میں فٹ کرنے لگا۔

لیکن اسی وقت کمرے کی لائٹ اچانک آن ہو گئی۔ وہ سایہ حیرت سے چونک کر پلٹ پڑا۔ سپرنٹنڈنٹ خان اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بھرا ہوا پستول تھا۔ اور اس کے مقابل تاریکی میں سائے کی طرح حرکت کرنے والی ایک کھلے ہوئے رنگ کی خوب صورت سی لڑکی تھی۔ وہ سرمئی رنگ کا سیاہی مائل سایہ پہنے ہوئے تھی۔ اس کا چہرہ، اس کے گورے ہاتھ، سفید سفید پنڈلیاں اور ران کا تناسب کافی پرکشش تھا۔ وہ پہلے خوف زدہ سی ہو گئی، لیکن خان کو دیکھنے کے بعد اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت بدل دی۔ وہ اس طرح مسکرانے لگی جیسے یہ کوئی بات نہ ہوئی ہو۔ لیکن جس چیز نے خان کو دوبارہ چونکایا وہ اس کے سنہری ملائم بال تھے۔ پیروں میں وہ کریپ کے سول والا جوتا پہنے تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ایک چھوٹا سا زمبور تھا۔

”تو تم ہو۔“ خان اپنا پستول جیب میں ڈالتے ہوئے مسکرا کر آگے بڑھا۔

”جی۔“ وہ بڑے مطمئن لہجے میں بولی۔

”لیکن یہ ہافکین انسٹیٹیوٹ کا جراثیم خانہ نہیں ہے۔“ خان اور قریب آتے ہوئے

بولا۔

اس جملے کا ردِعمل خاطر خواہ ہوا۔ وہ لڑکی ایک سیکنڈ کے لیے چونکی مگر پھر مسکرا دی۔ وہ کافی چالاک اور پھرتیلی معلوم ہوتی تھی۔

”آپ کچھ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں یہاں ڈاکٹر کی عینک ڈھونڈنے آئی تھی۔“ اس نے بھونڈا سا بہانہ تراشا۔

”اور وہ بھی اندھیرے میں؟“ خان بول اٹھا۔

”جی وہ مجھے سوئچ کہاں ہے لائٹ کا، معلوم نہیں تھا۔“ اس نے مصنوعی گھبراہٹ کے ساتھ کہا۔

”خیر، مجھے بہت دنوں سے تمہاری تلاش تھی، اچھا ہوا جو یہیں مل گئیں۔“ خان اب ڈاکٹر کی میز کے ایک سرے پر آ گیا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”مم میں... مگر...“ لڑکی نے کہنا چاہا۔

”میں کہتا ہوں بیٹھ جاؤ۔“ خان نے ڈاکٹر کی کرسی کی طرف ہی اشارہ کیا۔ اور لڑکی کو نہ جانے کیوں اس خیال سے جھرجھری سی آ گئی۔

”میں جانتا ہوں تم کیوں نہیں بیٹھو گی۔“ یہ کہتے ہوئے خان نے کرسی پر لگائی گئی وہ سیاہ سی چیز اٹھا کر جیب میں ڈال لی۔ اسی وقت ڈاکٹر باسو اندر آ پہنچا۔ وہ اس لڑکی کو خان کے ساتھ دیکھ کر چونک پڑا۔

”یہ کون ہے؟“ ڈاکٹر نے خان سے ہی لڑکی کے بارے میں پوچھا۔

”اسی سے پوچھ لیجیے۔“ خان نے جواب دیا۔

”صاحب، خان صاحب کا فون آیا ہے۔“ اسی وقت ایک اردلی اندر داخل ہو کر بولا۔ وہ شاید خود خان کو نہ پہچانتا تھا۔

"ڈاکٹر، اسے اس کی جگہ سے ذرا سی بھی حرکت نہ کرنے دیجیے گا۔" خان نے جیب سے پستول نکال کر ڈاکٹر باسو کو تھماتے ہوئے کہا۔ "بڑی خطرناک مجرمہ ہے۔" وہ چلتے چلتے بولا۔

"اچھا۔" ڈاکٹر نے کہا اور پستول تھام لیا۔

خان جب ڈاکٹر کے اس کمرے سے نکل کر فون والے آفس میں پہنچا تو دوسری طرف سے فون پر بولنے والا کوئی اجنبی آدمی تھا۔

"کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟" خان نے جھنجلا کر پوچھا۔

"میں بڑی سخت مصیبت میں مبتلا ہوں، خان صاحب۔ آپ فوراً آیے ورنہ میرے ساتھ دو چار اور جان سے جائیں گے۔"

"آخر آپ ہیں کون؟"

"میں ہاکنس انسٹیٹیوٹ کا ڈائرکٹر ہو۔"

"اوہ، مگر بات کیا ہے؟"

"یہ میں فون پر نہیں بتا سکتا۔"

"اچھا، میں ابھی آتا ہوں۔" خان نے ریسیور رکھ دیا اور سوچ میں پڑ گیا۔ لیکن ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر باسو کے آفس کی طرف سے فائرنگ کی ایک آواز سنائی دی جس کے بعد ہی کئی قدموں کے دوڑنے کی چاپ سنائی دینے لگی۔ وہ آفس سے نکل کر سیدھا ڈاکٹر باسو کے کمرے کی طرف دوڑا۔

ڈاکٹر اسے دروازے کے قریب ہی مل گیا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ پستول اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

"خان صاحب، وہ... وہ نکل گئی... اس کھڑکی سے... میں نے فائر بھی کیا، مگر بے سود۔"

"اوہ۔" خان یہ کہہ کر کھڑکی کی طرف جھپٹا۔ لیکن وہاں نیچے کوئی بھی نہ تھا۔

"ڈاکٹر، میں جا رہا ہوں۔ آپ اپنے بارے میں ذرا محتاط رہیے گا۔ یہ حملہ آپ کی جان پر پہ کیا گیا تھا، لیکن شکر ہے کہ میں یہاں موجود تھا۔" خان نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"میری جان پر؟" ڈاکٹر باسو بڑبڑایا۔ "اوہ، تو میرا حشر بھی ڈاکٹر ہشیم کی طرح ہونے والا تھا۔" یہ کہتے ہوئے اسے جھرجھری سی آ گئی۔

"آپ فکر نہ کریں، ڈاکٹر۔ میں فوراً ہی کسی کو آپ کی حفاظت کے لیے لگا دیتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے خان باہر نکل گیا۔

لیکن جب وہ اپنی کار کی اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھا تو پاس ہی ایک سفید سی چیز پڑی دیکھ کر چونک پڑا۔ یہ ایک مستطیل لفافہ تھا جس کے اوپر صاف حروف میں خان کا نام لکھا ہوا تھا۔ یہ لفافہ یقیناً اسی مقام پر کسی نے اس کی گاڑی میں ڈالا تھا۔ خان نے گاڑی کے اندر اور باہر محتاط نگاہیں دوڑا کر لفافے کو کھولا۔ لیکن چہرے سے کافی دور رکھ کر یہ اندازہ وہ پہلے ہی لگا چکا تھا کہ اس میں کاغذ کے سوا کچھ نہیں۔ اندر سے نکلنے والا کاغذ کے ایک پرزے پر انگریزی میں صرف تین الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

"آخری تنبیہہ۔"

خان نے مسکرا کر اسے جیب میں ڈال لیا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

☆☆☆☆☆☆

"ونڈرفول۔" بالے حوالات میں بند لڑکی کو سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے منہ سے سیٹی بجا کر بولا۔ وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ بالے اس وقت اپنی اصلی شکل اور لباس میں تھا۔ اور اس کی یہ شکل اس لڑکی کے لیے اجنبی تھی۔ اس کا اندازِ گفتگو بھی دوسرے پولیس

آفیسروں سے مختلف تھا۔

"کس الو کے پٹھے نے تم جیسی حسینۂ نازک ازام... اونہہ... نازک انجام۔ دھت تری سلیٹ زبان کی۔ میرا مطلب تھا کہ نازک اندام کو اس حوالات میں بند کیا ہے؟" اس نے پرشوق نگاہوں سے تکتے ہوئے پوچھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے رال اب اس کی آنکھوں سے ٹپک چلے گی۔ لڑکی معنی خیز انداز میں مسکرا دی۔

"تم کون ہو؟" اس نے بے باکانہ لہجے میں پوچھا۔

"میں کون...؟ ارے، تم نہیں جانتیں مجھے، بدنصیب لڑکی۔ لیلیٰ نے مجنوں سے محبت کرتے وقت میری قسم کھائی تھی۔ بیٹے فرہاد نے چالیس برس میری شاگردی فرمائی تھی رانجھا کی ہیر ہرجائی تھی ورنہ وہ بھی میرے گھر آئی تھی۔ میرا نام سارجنٹ بالے ہے۔" بالے نے بڑے اختصار کے ساتھ اپنا تعارف کرایا۔

"اوہ۔" لڑکی نے بڑے محبوبانہ انداز میں اپنے ہونٹ سکوڑے۔ "تمہارا نام میں سن چکی ہوں، سارجنٹ۔"

"مگر تم یہاں آئیں کیسے؟"

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں ایک خطرناک مجرمہ ہوں؟"

"مہ... مجرمہ...؟ اور تم...؟ کسی اور کو بنانا، لڑکی۔ میرا نام سارجنٹ بوالے ہے۔ میں پر دیکھ کر الٹی چڑیا، اونہوں، پھر الٹا بول گیا، یعنی کہ اڑتی چڑیا دیکھ کر پر گن لیتا ہوں۔" بالے نے بڑی شان سے سینہ پھلا کر کہا۔ "کچھ پی لی تھی کیا؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"اوں...؟" لڑکی چونکی۔ "ہاں۔ کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔"

"میرا باس پورا صوفی منش ہے اور خاص کر ایسی لڑکی یا عورت کو تو معاف ہی نہیں کرتا جس نے ذرا سی بھی پی ہو۔" بالے رازدارانہ لہجے میں کہنے لگا۔

"مگر میں نے تو پہلی بار پی تھی۔"

”گناہ اول گناہ آخر۔ مگر تم نے کسی کو ضمانت کے لیے کیوں نہیں بلوا لیا۔؟“

”میرا یہاں کوئی نہیں ہے۔“ لڑکی کے لہجے میں بے چارگی پیدا ہو گئی۔

”چچ چچ... بس کرو، ورنہ مجھے رونا آ جائے گا۔“

”کیوں؟“

”تم نے مجھے بھی مردہ سمجھ لیا تھا کیا؟“

”تم بھی تو پولیس والے ہو۔“

”لعنت ہے پولیس والوں پر۔ میں تو پیٹ بھرنے کے لیے نوکری کرتا ہوں۔“

”تو کیا اور کوئی نوکری نہیں ملتی؟“

”ملتی تو ہے، مگر اس میں دستِ غیب نہیں ہوتا۔“

”دستِ غیب؟“

”یہی رشوت وشوت وغیرہ۔“

”تو تم رشوت بھی لیتے ہو؟“

”کیوں نہ لوں؟ اتنی سی تنخواہ میں کس کا پیٹ بھرتا ہے بھلا۔ اور پھر میں تو اپنے باپ دادا پر دادا تک کی پرورش کرتا ہوں۔“

”اچھا تم مجھے آزاد کرا سکتے ہو؟“

”ایک شرط پر۔“

”وہ کیا؟“ لڑکی نے امید سے چمکتی نظریں اس کے چہرے پر گاڑ کر پوچھا۔

”تم مجھ سے شادی کرنے کا وعدہ کرو۔“

”کیا یہ ضروری ہے؟“

”ضروری؟ ہائے، یہ تو اشد ضروری ہے۔ تم جیسی حسین لڑکی پھر ملتی ہی کہاں ہے۔“

”کیا تم سچ مچ ایسا چاہتے ہو؟“

“قلوپطرہ سے لے کر گریس کیلی تک کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔”

“کیا تم یہ جانے بغیر مجھ سے شادی کرو گے کہ میں کون ہوں؟”

“کون سور پوچھتا ہے کہ تم کون ہو۔ کاش، تم جان سکتیں کہ عشق کے سی ڈے کی طرح اندھا ہوا کرتا ہے۔”

“تو تمہیں مجھ سے عشق بھی ہو گیا؟”

“میں تو تمہیں باہر سے ہی دیکھ کر عاشق ہو گیا تھا۔”

“مگر سپرنٹنڈنٹ کہتا ہے میں کوئی خطرناک مجرمہ ہوں؟” لڑکی نے کہا۔

“اس کی سمجھ بہت تیز ہے۔ چوہا کود جائے تو پستول چلا دیتا ہے۔”

“تو مجھے اس مصیبت سے نکالو نا، میرا یہاں دم گھٹ رہا ہے۔”

“تم نے وعدہ تو کیا نہیں؟”

“لیکن اگر پولیس تمہارے پیچھے بھی پڑ گئی تو؟”

“میں اسے انگلیوں پر نچا سکتا ہوں۔”

“تو پھر میں وعدہ کرتی ہوں۔”

“اور اگر تم باہر نکل کر وعدے سے مکر گئیں تو؟”

“تم اتنے مایوس کیوں ہو؟”

“تجربہ۔ میری ہونے والی ڈارلنگ، تجربہ۔ نہ جانے کتنی لونڈیاں اسی طرح بالے صاحب سے محبت کے وعدے کر کے پتھر ہو چکی ہیں۔ بس مطلب نکلا اور کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہو۔ یعنی ایک ہو کہ ڈیڑھ ہو کہ پون ہو۔”

“میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔”

“وہ تو میرا دل بھی کہہ رہا ہے۔ اسی لیے تو اوکھلی میں سر ڈال رہا ہوں تمہاری خاطر۔”

”تو پھر کیا کرو گے تم؟“

”میں آدھی رات کو آؤں گا، اس وقت یہاں سناٹا رہتا ہے۔“

”میں انتظار کروں گی۔“ لڑکی نے بالے کی گردن میں اپنی باہیں ڈال دیں۔

”ارے ارے، میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔“ وہ لڑکھڑانے لگا۔ لیکن لڑکی اسے جذباتی طور پر متاثر کرنے کے لیے اور قریب ہو گئی۔

”اب تو میں تم سے ایک ہزار شادی کروں گا۔“

”مگر اسی وقت باہر شاید سنتری کے قدموں کی آہٹ نے انھیں چونکا دیا۔ وہ ایک دوسرے سے علاحدہ ہو گئے۔

”لڑکی تم سچ سچ نہ بتاؤ گی کہ تم کون ہو، تو میں تمھیں اینٹ کی ڈکی بنا دوں گا۔ تم مجھے ایسا ویسا مت سمجھو۔ میں سارجنٹ بالے ہوں، جس کا نام سن کر مجرم لوگ اینٹی ملیریا انجیکشن لیتے ہیں۔“

”کیا بک رہے ہو؟“ لڑکی نے کھسیانی ہو کر آہستہ سے پوچھا۔

”مصلحت، مائی سوئٹ میٹ، مصلحت۔ باہر کوئی آ گیا ہے۔ یہ سارے مکالمے فرضی ہیں۔“ ”اوہ۔“ وہ مسکرا دی۔

”اور ہاں دیکھو، میں تمھیں صرف رات بھر کا وقت دیتا ہوں۔ اچھی طرح سوچ لو، ورنہ صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ میں تمھیں شوٹ کر دوں گا۔ مگر شوٹ، او نہیں، سزائے موت تو عدالت دے گی۔“

وہ بکتا بڑبڑاتا پیچھے ہٹ کر دروازے تک پہنچا اور پھر باہر نکل گیا۔ اس پراسرار لڑکی کے پتلے گلابی ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی جو زہریلی بھی ہو سکتی تھی، میٹھی بھی۔

☆☆☆☆☆☆

پراسرار لڑکی

”کاں جا رہے ہو یار ائے فروٹ؟“

یہ شوکت کی آواز تھی۔ اس نے ٹھیٹ بھوپالی لہجے میں بالے کو ٹوکا تھا۔

”یار، بڑے منحوس ہو۔ کام کے وقت ٹوک دیتے ہو۔“ بالے نے اپنی موٹر سائیکل دھیمی کر دی۔ شوکت کا سینہ اس وقت ضرورت سے کچھ زیادہ پھولا ہوا تھا۔ اس کی آواز بھی کچھ بدلی ہوئی تھی۔ اور یہ راز اس وقت بالے کی سمجھ میں آیا، جب شوکت نے اپنی کار برابر سے لگا دی۔ وہ بڑے فخریہ انداز میں ابلے کو آنکھ مار کر اپنے پاس بیٹھی ہوئی ایک خوب صورت سی لڑکی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ بالے نے آنکھیں پھاڑ کر دونوں کو دیکھا۔ وہ لڑکی اسے خدوخال سے اور زیادہ خوب صورت نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے اپنا حلیہ خود ہی بگاڑ رکھا ہے۔

”ابے واہ بے۔“ بالے نے ہولے سے سیٹی بجا کر اظہار حیرت کیا۔ اور اپنی موٹر سائیکل اور قریب لے آیا۔

”ڈال سے ٹپکی تھی کیا؟“

”بڑے وہ ہو، یار، خدا قسم۔ لونڈیا سن لے گو کیا کہے گی۔“ شوکت نے آہستہ سے شکایتی لہجے میں کہا۔

”میں تمہیں ناجائز حرکتوں کے الزام میں یہیں سے تھانے بھجوا دوں گا۔“

”بالے بھائی، اللہ جانتا ہے تم بڑے اچھے آدمی ہو۔“ شوکت نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے التجا کی۔

وہ لڑکی شاید شرم یا اجنبیت کے احساس سے منہ دوسری طرف پھیرے بیٹھی ہوئی

تھی، لیکن اس کا پروفائل بھی بالے کو بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔

”چلو، میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔“

”یار، کیوں بیڑہ غرق کرتے ہو؟ اتنے دنوں میں تو ایک ملی ہے سالی۔ ابھی تو میں نے محبت بھی نہیں کی ہے اس سے۔“ شوکت نے بے چارگی کے لہجے میں کہا۔

”اچھا بیٹے، جاؤ۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔“ بالے نے بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا اور شوکت نے اسے ۵۵۵ کی ایک سگریٹ پیش کر کے گاڑی بڑھا دی۔

”کون تھا یہ؟“ لڑکی نے سریلے لہجے میں شوکت سے پوچھا۔

”سالا ایک یتیم خانے کا منشی ہے۔ جب دیکھو جب چندہ مانگنے لگتا ہے راستہ روک کے۔“ شوکت نے بھونڈا سا جواب دیا۔

”یتیم خانے کا منشی اور موٹر سائیکل پر؟“ لڑکی نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ نہیں جانتیں، یہ سب چار سو بیس کے دھندے ہیں بیٹوں کے۔“ شوکت نے بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ کہا۔

”آپ کہاں تک جائیں گے؟“

”آپ کے ساتھ تو میں خدا گنج تک جانے کو تیار ہوں۔“

”مجھے آتما رام اسکوائر پر چھوڑ دیجیے۔“

”ایک شرط پر۔“

”یعنی؟“

”اس سے پہلے آپ میرے ساتھ مونجنی میں چائے پئیں گی۔“

”کیا یہ ضروری ہے؟“ لڑکی نے کسی قدر گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”ضروری؟ ارے یعنی کہ وہی بات ہوئی کہ بس مل کے بکھر گئیں اچھیاں... اوہ... لاحول ولا قوۃ۔ یہ زبان سالی۔ اس کی تو...“ شوکت نے جھنجلاہٹ میں اپنی زبان کو ہی گالی دے

بیٹھا۔

"خیر، بچھڑ گئیں انکھیاں سہی، لیکن ہم پھر بھی تو مل سکتے ہیں۔" لڑکی نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ اس وقت آپ نے چائے نہیں پی تو مجھے اس صدمے سے ٹی بی ہوجائے گی۔"

"اف...فوہ...، آپ سمجھتے کیوں نہیں کہ اس وقت مجھے بہت ضروری کام ہے۔"

"میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا، صرف پانچ منٹ۔"

بالآخر وہ شوکت کے اصرار سے مجبور ہوگئی۔ شوکت نے اپنی گاڑی موگنجی کی طرف موڑ دی۔ سامنے فٹ پاتھ کے کنارے کوگنجی کا پورٹیکو تھا۔

شوکت نے گاڑی سے اترتے ہوئے غور سے چاروں طرف دیکھا۔ بالے کی موٹر سائیکل یا خان کی کار اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ ایسے موقعوں پر بالے کی عدم موجودگی اس کا خون چلو دو چلو بڑھا ہی دیا کرتی تھی۔ اطمینان کی ایک لمبی سی سانس کھینچ کر اس نے اس لڑکی کو ہاتھ میں ہاتھ دے کر گاڑی سے اتارا اور سیڑھیاں چڑھ کر داخلی دروازے میں داخل ہوگیا۔

موگنجی کا نائٹ شفٹ منیجر اندر ہال میں ہی موجود تھا۔ وہ شوکت کو آج خلافِ توقع ایک حسینۂ گل اندام کے ساتھ اندر آتے دیکھ کر مسکرا دیا۔ شوکت کو اس وقت اس کی وہ مسکراہٹ زہر میں بجھی لگی، لیکن بجز ضبط کے چارہ ہی کیا تھا۔ وہ تو پہلے ہی بڑی مشکل سے پانچ منٹ کے لیے آئی تھی۔ دل پر جبر کر کے اس وقت شوکت کو بھی منیجر کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دینا پڑا ورنہ کم بخت کچھ الٹا سیدھا جملہ ہی کہہ بیٹھتا تو نئی نئی ہوجانے والی محبوبہ تو تاؤ میں آ کر یہیں سے پھُر ہوجاتی۔

منیجر کے قریب سے گزرتے ہوئے شوکت نے ملتجیانہ انداز میں اسے آنکھ ماردی۔

منیجر اس کا مطلب سمجھ گیا اور خلافِ توقع اس نے بڑی سنجیدگی سے شوکت کو 'ہیلو' کہہ کر مخاطب

کیا۔

وہ بالے کی وجہ سے شوکت سے کافی بے تکلف تھا اور اکثر تو ان کا مذاق تہذیب کے دائرے سے نکل کر گالی گلوچ تک پہنچ جایا کرتا تھا۔

"وہ سور تو نہیں آیا؟" شوکت نے آہستہ سے اس کی طرف جھک کر پوچھا۔ لڑکی پیچھے رک کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

"کون؟" منیجر نے دانستہ انجان بن کر کسی قدر مؤدب لہجے میں پوچھا۔

"ارے وہی، یار۔ اب بالکل مینچو کیوں بنتے ہو؟" شوکت نے دوبارہ اس کے کان کے پاس منہ لا کر سرگوشی کی۔ مینچو' اس کی خاص ایجاد تھی۔ اپنی اصطلاح میں وہ اسے بے وقوف کی جگہ استعمال کیا کرتا تھا۔

"وہ تو نہیں آیا ہے۔ مگر میں کچھ گستاخی کروں تمہاری شان میں؟" منیجر نے لہجہ روکھا بنا لیا۔

"لا قسم، تم تو بڑے بھائی ہو، یار۔ ویسے کوئی پرائیوٹ جگہ بتاؤ۔ میں اس لونڈیا سے اظہارِ محبت کروں گا۔"

"کلب گیلری میں چلے جاؤ۔ وہاں ہر ٹیبل پر صرف دو ہی کرسیاں ہیں۔" منیجر نے بتایا۔

"تھینک یو، تھینک یو۔" وہ منیجر سے بولا۔ "آیئے، آیئے نا۔" پھر اس نے لڑکی کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ وہ اب تک ہال میں نظریں دوڑا کر کسی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز کچھ ایسا تھا جس سے ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی نظر اس پر پڑ سکے۔ اس نے شوکت کی آڑ لے رکھی تھی۔ پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی شوکت کے ساتھ کلب گیلری میں داخل ہو گئی۔ یہاں چھت گیر ٹھنڈی روشنی اپنے مدھم اجالے سے چاندنی رات جیسا منظر پیدا کر رہی تھی۔ میزیں دور دور تھیں اور ہر ٹیبل کے ساتھ دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ گیلری ایسے رومانی

جوڑوں کے لیے مخصوص تھی جو تنہائی پسند کرتے تھے۔

وہ ایک خالی میز کے گرد بیٹھ گئے۔

"اب بتایئے، کیا منگایا جائے؟"

"صرف کافی۔" لڑکی نے گیلری کی باہر کمپاؤنڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کمپاؤنڈ میں مونجنی میں آئے ہوئے بہت سے تفریح پسندوں کی موٹریں قطار سے کھڑی ہوئی تھیں اور شاید اس لڑکی کی نظریں ان میں ہی کچھ تلاش کر رہی تھیں۔

"ارے، میں نے ابھی تک تمہارا نام تو پوچھا ہی نہیں؟" شوکت رومانی موڈ میں بے تکلفی پر اتر آیا۔

"مجھے نیلی کہتے ہیں۔"

"اور مجھے شوکت اللہ خاں۔ میں بھوپال اسٹیٹ کا بہت بڑا جاگیردار ہوں۔" شوکت نے اپنی بڑائی سے اسے متاثر کرنے کی بے وقوفانہ کوشش کی۔

"آپ شادی شدہ ہیں؟" نیلی نے عجیب سا سوال کیا۔

"شادی...؟ ارے لعنت ہے صاحب شادی کرنے والے پر۔ اپن تو جنم جنم کے کنوارے ہیں۔"

"مجھ سے شادی کریں گے آپ؟" نیلی کے اس سوال نے شوکت کو چونکا دیا۔ اس نے پہلے تو اس کی شکل غور سے دیکھی۔ پھر اپنی انگلی دانتوں میں دبا کر وہ خود اچھل پڑا۔ وہ یقیناً جاگ رہا تھا۔ مگر ایک لمحے کے بعد اس کے دل ودماغ میں ایک عجیب سا وہم پیدا ہو گیا۔ وہ بے وقوف ضرور تھا، لیکن اب اتنا بھی نہیں کہ کوئی بہت خوب صورت جوان لڑکی اچانک اس سے شادی کا سوال کر بیٹھے اور وہ پوری طرح اس پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لے۔

"تم مذاق کر رہی ہو، شاید؟"

"میں سنجیدہ ہوں۔"

"ارے ہاتو واقعی کیا... مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم مجھے جانتی بھی نہیں ہو ٹھیک سے؟

"مجھے آپ پر بھروسا ہے۔"

"سچ...؟ اللہ قسم۔ اب تو میں تم سے ایک لاکھ بار شادی کروں گا۔"

"لیکن ہماری شادی یہاں نہیں ہو سکتی، میرے ڈیڈی کو خبر ہو جائے گی تو وہ آپ کو گولی ماردیں گے۔"

"ارے واہ، کوئی زبردستی ہے جو گولی ماریں گے۔ ہم انھیں پولیس کے حوالے... مگر نہیں، وہ ہاتو تمہارے ڈیڈی ہیں نا۔ خیر ہاتو پھر؟"

"ہمیں آج ہی رات اس شہر سے نکل چلنا چاہیے۔ ہم وہاں سول میرج کر لیں گے۔ پھر کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"بات تو لاکھ روپے کی ہے تو پھر...؟"

"پھر کیا؟ کار تو آپ کے پاس موجود ہی ہے، پھر سوچنا کیسا۔"

"میرا مطلب ہے کہ میرے گھر کے لوگ..."

"ان سے ہم شادی کے بعد بھی مل سکتے ہیں۔"

"تو پھر چلیے وہیں۔" شوکت نے کہا۔

لیکن اسی وقت کسی کے قدموں کی چاپ نے انھیں چونکا دیا۔ شوکت نے جیسے ہی پلٹ کر دیکھا، اس کے سارے ارمانوں کا خون ہو گیا۔ سارجنٹ بالے ایک ہاتھ میں کولڈ ڈرنک کرسی لٹکائے ان کی میز کے قریب پہنچ رہا تھا۔

"تت... تم یہاں بھی آ پہنچے؟" شوکت نے غصے سے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"میں تو اتفاق سے آ گیا تھا، تم نظر آ گئے تو سوچا اکیلا کیا بیٹھوں، ساتھ بیٹھوں تو لطف رہے گا۔" بالے نے اپنی کرسی شوکت کے برابر جماتے ہوئے ڈھٹائی سے کہا۔

"لطف گیا سالا تیل لینے۔" شوکت چراغ پا ہو گیا۔

نیلی اس وقت چونکی ہوئی سی بالے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے بشرے کے تاثرات سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اسے پہلی بار دیکھ رہی ہو اور اسی لیے حیران ہو۔

"بیٹے، زیادہ تین پانچ کرو گے تو لونڈیا سے تمہارا پول کھول دوں گا سب۔" بالے نے جھک کر شوکت کے کان میں کہا اور شوکت کا غصہ اک دم بے بسی میں بدل گیا۔

"یہ... یہ شاید وہی یتیم خانے کے منشی ہیں؟" نیلی نے بالے کی طرف اشارہ کر کے شوکت سے پوچھا۔ اور شوکت اسی متوقع سوال سے ڈر رہا تھا۔

"یتیم خانے کا منشی؟" بالے چونکا، لیکن جب اس نے پھر شوکت کے چہرے پر نظر ڈالی تو وہ مجسم التجا بنا خاموش نگاہوں سے کہہ رہا تھا، بالے بھائی، اس وقت عزت تمہارے ہاتھ ہے۔ بالے مسکرا دیا۔

"جی ہاں، جی ہاں۔ میں بالکل وہی ہوں۔"

لیکن بالے کے لہجے میں چھپی ہوئی شرارت نیلی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی اور شاید اسے توقع بھی نہ تھی کہ شوکت جیسے عقل مند آدمی کے ساتھ اسے ایسے کسی آدمی کا بھی ہم نشیں بننا پڑے گا۔ بالے نے چبھتی ہوئی نظروں سے ایک بار نیلی کو دیکھا اور پھر شوکت کو۔

"کچھ بھی سہی، بیٹے، ہے خوب۔" وہ دبی زبان سے بولا۔

"کیا؟" شوکت نے بے وقوفوں کی طرح منہ کھول کر پوچھا۔

"تمہاری یہ لونڈیا۔"

"ماں بہن سمجھ کے بات کرو۔ وہ میری وہ ہے۔" شوکت نے روٹھنے والے انداز میں کہا۔

"تمہاری وہ ہی سمجھ کر تو کہہ رہا ہوں۔"

بیرے نے اسی وقت کافی لا کر رکھ دی اور شوکت نے رگوں میں کھولتے لہو کی طرح گرم کافی کی ایک پیالی خود بالے کو اس لیے پیش کر دی کہ شاید یہ بلا اسی طرح ٹل جائے۔ مگر

بالے اطمینان سے کرسی پر بیٹھ کر چسکیاں لینے لگا۔

"یار بالے بھائی، اب تو رحم کرو خدا کے لیے۔" شوکت نے میز کے نیچے سے بالے کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے اس سے التجا کی۔

"تم بھی کیا یاد کرو گے، بیٹے جاگیردار۔" بالے ہنستا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور شوکت کے سینے سے گویا من بھر کی سل ہٹ گئی۔ نیلی جلدی جلدی کافی ختم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی نگاہیں اب بھی بار بار کمپاؤنڈ میں کھڑی کاروں کی طرف اٹھ جاتیں۔ بالے لاپرواہی سے ٹہلتا ہوا گیلری سے باہر نکل گیا۔ باہر ہال میں مس بورکر اپنے بدلے ہوئے میک اپ میں وہاں موجود تھی۔ وہ شاید اسی کو تلاش کر رہی تھی۔

"اوہو... ہل... لو۔" بالے نے اسے مخاطب کیا اور وہ مسکرا کر صرف ہیلو تک ہی جواب دے کر رہ گئی۔

"بہت دیر کی آپ نے۔ بہر حال بس ایک منٹ تشریف رکھیے میں ابھی آیا۔" اس سے یہ کہتا ہوا بالے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہال سے باہر نکل آیا۔ اس کے ہال کے دروازے سے نکلتے ہی ہال کے ایک کونے کی میز پر سے ایک تنومند سا آدمی جس نے اپنا نصف چہرہ فیلٹ ہیٹ سے چھپا رکھا تھا، اٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے اس نے ایک نظر ہال میں چاروں طرف ڈالی پھر باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی مس بورکر بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے بھی چاروں طرف ہال میں ایک نظر دوڑائی اور پھر لاپرواہی سے ہال کے دوسرے خارجی دروازے کی طرف ٹہلتی ہوئی بڑھنے لگی۔

بالے کے جانے کے بعد شوکت نے ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس کھینچی اور اپنے تمام تر رومانی بخار کو ترسی ہوئی آنکھوں میں جمع کر کے نیلی کے چہرے کو تکنے لگا۔

"دیکھیے، میں نے وعدہ پورا کر دیا۔ مگر آپ کے دوست کچھ اچھے لوگ نہیں معلوم ہوئے۔" وہ ایک اچٹتی نظر پھر باہر کمپاؤنڈ کی طرف ڈال کر اس سے بولی۔

"وہ...؟ وہ میرا دوست کہا ہے، سور۔ بلیک میلر ہے، بلیک میلر۔ مجھے اس کی سات پشتوں پر قے آتی ہے۔" شوکت نے ہاں میں ہاں ملائی، مگر نیلی بیٹھے بیٹھے ایک دم چونک پڑی۔ باہر پارک کی ہوئی گاڑیوں میں سے ایک کی سرخ بیک لائٹس بار بار روشن ہو کر بجھ رہی تھی۔ وہ گھبرا کر اپنے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے؟" شوکت نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"میرے ڈیڈی آتے ہوں گے۔ ہمیں یہاں سے نکل چلنا چاہیے۔"

"تو چلو۔" شوکت کافی کا بل پلیٹ میں ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سامنے سے باہر نکلنے کی بجائے گیلری کے چھوٹے دروازے سے باہر کمپاؤنڈ میں نکل آئے۔ شوکت نے اپنی کار کا دروازہ کھول دیا اور وہ اگلی سیٹ پر ہی اس کے برابر بیٹھ گئی۔ نیلی جیسی حسین اور پرشباب لڑکی کو اس طرح بے تکلفانہ ہم نشیں پا کر شوکت کی رگ رگ میں شراب کی کئی بوتلوں کا نشہ تیر رہا تھا۔ آج وہ خود کو کسی بھی تیس مار خاں سے کم سمجھنے کو تیار نہ تھا۔ خواہ اس کا مقابل سارجنٹ بالے ہی کیوں نہ ہو۔ بلکہ اپنی دانست میں اس نے آج بالے کو شان دار زک دی تھی۔ بالے کے خواب وخیال میں بھی اتنی حسین محبوبہ نہ گزری ہو گی۔

"ہاؤ سویٹ۔" وہ اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ کر سسکی بھرتے ہوئے بول اٹھا۔

جواب میں نیلی صرف مسکرا دی۔ شوکت کے حوصلے بڑھ گئے۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ اس کی گردن کے پیچھے ڈال دیا اور دوسرا ہاتھ اسٹیئرنگ پر بہکنے لگا۔

"اف فوہ، آپ ایکسیڈنٹ کرائیں گے کیا؟" نیلی نے اسے چونکا دیا۔ اور بے وقوفوں کی طرح اس نے گھبرا کر اسٹیئرنگ دونوں ہاتھوں سے جکڑ لیا۔

ان کی کار سے کافی فاصلے پر ایک دوسری سیاہ رنگ کی لمبی فریز ران کا پیچھا کر رہی تھی، لیکن اس کی رفتار اتنی سست تھی جیسے کوئی محض تفریحاً گاڑی چلا رہا ہو۔

اگلے چوراہے پر شوکت ایک پولیس سب انسپکٹر اور دو کانسٹیبلوں کو کھڑے دیکھ کر گھبرا

گیا۔ بالے کی وجہ سے اگرچہ پولیس کے بہت سے افسران اس کے واقف کار بن چکے تھے، لیکن ایسے موقعوں پر وہ ان سے ہمیشہ کترایا کرتا تھا، جب اس کے ساتھ، بقول بالے کوئی 'محبوب در بغل' ہو۔

"یہ لوگ گر ہماری گاڑی روک کر پوچھیں گے تو آپ میرے لیے ان سے کیا کہیں گے؟" نیلی اچانک اس سے سوال کر بیٹھی۔

"اِتنا بے وقوف سمجھا ہے کیا تم نے؟ میں ان کے باپ کو بھی چرا سکتا ہوں سال دو سال۔" شوکت نے اکڑ میں آ کر اینٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

سب انسپکٹر کے اشارے پر اس نے کار آہستہ کر لینی پڑی۔ مگر اتفاق سے وہ واقف کاروں میں سے نکلا۔

"ہیلو شوکت صاحب۔" اس نے خود ہی اسے ہنس کر مخاطب کیا۔

"او ہیلو، سانے صاحب۔ کہو یار۔" شوکت نے نیلی کو جتانے کے لیے لہجہ اور زیادہ بے تکلفانہ بنا دیا۔

"تم کدھر نکل پڑے اتنی رات کو؟"

"ذرا اپنی مسز کو سیر سپاٹا کرانے لے جا رہا ہوں۔ ان کو ایسی ہی موقع بے موقع سوجھا کرتی ہے۔" شوکت نے بظاہر جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"اوہ، تو یہ بھابی ہیں۔" سانے بے تکلفی سے ہنستا ہوا اور قریب آ گیا اور یہ دیکھتے ہی نیلی نے شرمانے کے انداز میں اس طرح سر جھکا لیا کہ اس کی شکل صاف دکھائی نہ دے سکے۔

"ذرا شرمیلی واقع ہوئی ہیں۔" شوکت نے سانے کی توجہ پھر اپنی طرف پھیرنے کے لیے کہا۔

"خیر خیر، کب تک۔ کبھی تو دعوت کھائیں گے ان کے ہاتھوں کی۔ آخر دیوروں کا

بھی کچھ حق ہے۔"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ ضرور دعوت کریں گے۔ مگر یہ معاملہ کیا ہے آج؟" شوکت نے پوچھا۔

"پولیس ایک خطرناک لڑکی کو تلاش کر رہی ہے جو ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹا گرفت میں آ کر فرار ہو گئی ہے۔"

"کوئی ڈکیت ہے کیا؟"

"ایک خوف ناک خونی گروہ کی آلہ کار۔"

"باپ رے، ضرور پکڑو سالی کو۔ میرے ہاتھ لگے تو سیدھا پھانسی چڑھواؤں۔" شوکت نے اپنے تئیں پولیس سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور پھر اپنی گاڑی آگے بڑھا دی۔ شوکت کی گاڑی کے گزر جانے کے دو تین منٹ بعد ہی وہ سیاہ رنگ کی فریزر بھی چوراہے کے نزدیک پہنچ کر دھیمی ہو گئی۔ سب انسپکٹر سانے نے اشارے سے اسے روک دیا۔ لیکن پھر اس کے اندر جھانکنے کے بعد اسے گزرنے کی اجازت دے دی۔ فریزر شوکت کی کار کے پیچھے ہی چل پڑی۔ اور سانے کنارے کی طرف ہٹ کر اپنا سگریٹ جلانے لگا۔

"صاحب، تیسری۔" ایک کانسٹیبل نے چوراہے سے آواز دی۔

"اوہ، اچھا، روکو۔" سانے نے وہیں سے کہا۔

اور قریب آنے والی تیسری گاڑی بھی روک لی گئی۔ لیکن اس کے رکتے ہی سپاہیوں کے ہاتھ ان کے ماتھے کی طرف اٹھ گئے۔ سانے بھی گھبرا کر قریب آ گیا۔ گاڑی پہچانی ہوئی نہ تھی، مگر اس میں سب انسپکٹر ڈیسوزا موجود تھا۔ سانے اٹینشن ہو گیا۔

"پیچھے کوئی بھی گاڑی آئے، آدمیوں کو جانچے بغیر مت گزرنے دو۔" ڈیسوزا نے یہ کہتے ہوئے گاڑی بڑھا دی۔ سپاہی ایڑیاں بجاتے ہی رہ گئے۔

اب شوکت کی کار شہر کے مضافاتی علاقے میں دوڑ رہی تھی۔ نیلی اب پہلے سے

زیادہ مطمئن نظر آ رہی تھی، لیکن وہ خاموش تھی۔ شوکت نے دو ایک بار سلسلہ گفتگو چھیڑنے کی بھی کوشش کی لیکن جواب نہ پا کر خاموش ہو رہا۔

“اب ہم خطرے سے باہر ہیں۔” لڑکی کھڑکی سے سر باہر نکال کر لمبی لمبی سانسیں کھینچتے ہوئے بولی۔

“خطرہ؟ کیسا خطرہ؟” شوکت نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

“مثلاً یہ کہ میرے ڈیڈی کو خبر ہو گئی ہو اور وہ ہمارا پیچھا کر رہے ہوں۔” نیلی نے بات بنائی۔

“سنِ علوغیت... لاحول ولاقوۃ۔ سنِ بلوغیت تک پہنچ جانے پر کسی لڑکی کا ڈیڈی اسے اس کی مرضی کی شادی کرنے سے نہیں روک سکتا۔”

“لیکن میری عمر بھی تو ابھی تیرہ سال کی ہے۔”

“تیرہ سال؟” شوکت نے اظہارِ حیرت کیا۔ “دو کم ہی بتائے ہوتے تو میں دودھ کی شیشی بھی خرید لیتا۔” وہ پھر ہنس کر بولا۔

“اور میرے ڈیڈی بندوق کی گولی سے کم بات نہیں کرتے۔”

“میں بھی توپ کے گولے سے بات کرتا ہوں۔”

“تو تم ان سے لڑو گے؟”

“ہائیں تو کیا جوتے کھاؤں گا ان سے؟”

“گاڑی روک دو۔”

“یہ کیوں؟”

“میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔”

“ارے بس، روٹھ گئیں؟”

“گاڑی روک دو۔”

"نہیں روکتا۔"

"نہیں روکتے؟"

نیلی نے عجیب سے لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ ہی شوکت کو کوئی سخت سی چیز اپنی گردن پر چبھتی محسوس ہونے لگی۔

"یہ مزاج اچھا نہیں، ڈارلنگ۔ پستول وستول کا کھیل خطرناک، لاحول ولاقوۃ۔ خطرناک ہوتا ہے۔"

"بس ایک منٹ اور، ورنہ تمہارے بھیجے کے چیتھڑے اڑ جائیں گے۔" نیلی کا لہجہ ایک دم خوفناک ہو گیا۔

"اچھا... اچھا... روکتا ہوں۔"

اور شوکت کو گاڑی روکنی ہی پڑی۔ اور اس وقت اسے اس بات کا احساس ہوا کہ ایک سیاہ رنگ کی کار اور اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ نیلی فوراً کار سے اتر گئی۔ اتنے میں دوسری کار قریب آ کر رک گئی۔ اس کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں نیلی کا چہرہ اس وقت کافی بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے کی مسکراتی، ڈرتی نیلی سے اب ایک غضب ناک ناگن بن چکی تھی۔ شوکت بے بسی کے عالم میں اس دوسری کار میں بیٹھے ہوئے اس آدمی کو جس کا نصف چہرہ فیلٹ ہیٹ کے آگے جھکے ہوئے کنارے کی اوٹ میں اور بقیہ آدھا کوٹ کے کھڑے کالر میں چھپا ہوا تھا، دیکھنے لگا۔ وہ سمجھا تھا شاید کوئی راہ گیر ہوگا اور اس سے کچھ مدد مل سکے گی۔ لیکن جب نیلی اس کی کار کا دروازہ کھول کر اس میں بیٹھ گئی تو اسے مایوس ہو جانا پڑا۔

"اس کا کیا کیا جائے؟" نیلی نے اس آدمی سے پوچھا۔

"یہ چوہا ہمارے کسی کام کا نہیں۔ زندہ رہنے دو اسے۔" اس نے یہ کہہ کر گاڑی آگے چلا دی اور کچھ دیر تک تو شوکت کی اتنی بھی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ ہی کر لیتا۔ اسے اس حماقت کا احساس اس وقت ہوا جب پیچھے سے انسپکٹر ڈیسوزا کی کار

آ کر رکی۔ شوکت اسے پہچانتے ہی مجوب سا ہو گیا۔ اس نے یقیناً کوئی ایسا عقل مندی کا کام نہیں کیا تھا جو وہ ڈیسوزا کے استفسار کے جواب میں اسے بتا سکتا۔

”وہ لڑکی کہاں گئی؟“ ڈیسوزا نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اس سے پوچھا۔

”وہ... وہ اُدھر... ابھی گئی ہے، سالی۔“ شوکت نے جلے بھنے سے لہجے میں کہا۔

”اور تم نے اسے جانے دیا؟“

”میں کیا کرتا، اس کے ہاتھ میں بھرا پستول تھا اور پچھلی گاڑی میں اس کا با]پ۔“

”خیر، تم اپنی گاڑی لے کر واپس جاؤ۔ اگر میں پیچھے نہ لگا ہوتا تو وہ لوگ تمہاری بجائے تمہاری لاش کو اس جگہ چھوڑ کر جاتے۔“

”میری لاش...؟“ شوکت کو اب اس لڑکی ک خوف ناک پن کا احساس ہوا۔

”ہاں۔ جلدی نکل جاؤ یہاں سے۔“ ڈیسوزا نے یہ کہتے ہوئے اپنی گاڑی آگے نکال کر سامنے کی سمت دوڑا دی۔ اور شوکت سوچتا ہی رہ گیا کہ آخر یہ سب چوں چوں کا مربہ کیا ہے۔ وہ لڑکی کون تھی اور ڈیسوزا خود کیوں اس طرح اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ اور بالآخر یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ میں اول نمبر کا گدھا ہوں، اس نے آگے سوچنا ہی چھوڑ دیا۔

سیاہ فریزر اب تیز رفتار سے دوڑ رہی تھی اور نیلی پاس والی نشست پر خاموش بیٹھی اس پراسرار شخصیت کو تک رہی تھی جس کا چہرہ فیلٹ ہیٹ اور کوٹ کے کالر میں ڈھکا تھا۔

”کام نہیں ہو سکا۔“ نیلی نے خموشی کا سلسلہ توڑتے ہوئے کہا۔

”ہُم...“ وہ مختصراً بولا۔

”اگر حالات مدد نہ کرتے تو میں بھی مصیبت میں پھنس گئی ہوتی۔“

”مجھے معلوم ہے۔ سپرنٹنڈنٹ خان کو میں نے ہی انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی طرف سے فون کیا تھا۔“

”اوہ، تب ہی مجھے موقع مل گیا۔“

"زیادہ باتیں مت کرو۔" یہ کہتے ہوئے وہ ایک ہاتھ سے اپنا سر تھام کر اسٹیئرنگ پر جھکنے لگا۔

"کیا بات ہے؟" نیلی نے گھبرا کر کہا۔

"میرا سر چکرا رہا ہے۔ شاید تکان سے۔"

"میں چلاؤں گاڑی؟"

"لیکن رفتار تیز رکھنا۔ کوئی ہمارا پیچھا کر رہا ہے شاید۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اسٹیئرنگ نیلی کے حوالے کر کے سیٹ بدل لی۔ نیلی نے گاڑی سنبھالتے ہی رفتار ۵۰ سے ۵۵ میل پر کر دی۔

"شاید پولیس پیچھا کر رہی ہے؟" نیلی نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

"آنے دو۔ صرف ایک آدمی ہے۔"

نیلی پھر کچھ نہ بولی۔ ان کی کار پکوٹی کے مضافاتی آبادی میں داخل ہو گئی۔

پکوٹی شہر سے قریب ترین بلکہ منسلک اوسط درجے کا قصبہ تھا اور اس میں شہر کے متمول لوگوں نے اپنے بنگلے، کوٹھیاں بنوا رکھی تھیں۔ کھلی آب و ہوا کے لحاظ سے یہ مقام صحت کے لیے مفید اور تفریح کے لیے دلچسپ تھا۔ وسط میں ایک کافی لمبی چوڑی پہاڑی تھی، جس کی بلندی زیادہ نہ تھی اور چاروں طرف اس پر سڑکوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف نشیبی علاقے میں کسانوں اور اوسط درجے کے لوگوں کی بستی تھی۔ یہاں ایک چھوٹا سا بجلی گھر بھی تھا جو مضافات کو بجلی سپلائی کرتا تھا۔ پچھلی طرف ایک شفاف پانی کی گہری جھیل تھی جس میں شکارے پڑے رہتے تھے۔ رات کو اس حصے میں پکوٹی کے بازار بند اور سڑکیں سونی ہو چکی تھیں۔ سیاہ فریز انھیں پیچھے چھوڑتی پہاڑی کی پشت کی طرف گھوم گئی۔ پھر وہ ایک پختہ لیکن کم چوڑی بالائی سڑک پر گھوم گئی جس کے کنارے کنارے پتھر کی منڈیر کے ساتھ ٹھنڈی آسمانی روشنی کے سرکاری کھمبے تھے۔

"گاڑی روک لو۔"

"لیکن پولیس؟"

"اسی کو دیکھنا ہے، شاید ہمیں مغالطہ ہوا ہو۔"

لیکن جب کچھ دیر تک گاڑی روکے رہنے پر بھی تعاقب کرنے والی دوسری گاڑی انھیں نظر نہ آئی تو اس نے آگے بڑھنے کا حکم دے دیا۔ نیلی نے کار بالئی روڈ پر موڑ دی۔ اب وہ دوطرفہ چھرے بنگلوں کے درمیان سے اوپر پہاڑی پر چڑھ رہی تھی۔ پھر چند سڑکوں پر گھومنے کے بعد نیلی نے اسے ایک علاحدہ بنے ہوئے شان دار بنگلے کے احاطے میں داخل کر دیا۔ دروازے پر موجود ایک پھیلے ہوئے جبڑوں والا خوف ناک شکل کا پہاڑی دربان گاڑی کو دیکھتے ہی ادب سے ایک طرف ہٹ گیا۔ دروازے کے باہر ایک تختی لگی تھی جس پر چمکیلی حروف میں لکھا تھا، 'وہائٹ ہاؤس'۔ گاڑی احاطے میں ہوتی ہوئی پورٹیکو میں آ کر رک گئی۔

"شاید میرا سگریٹ کیس کہیں گر پڑا ہے، تم سیٹس پر دیکھ کر آؤ۔" وہ آدمی کار سے اتر کر جیبیں ٹٹولتا ہوا بولا اور پھر نیلی کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ سیڑھیاں طے کرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ نیلی کار کے اندر کی لائٹ روشن کر کے جب سگریٹ کیس تلاش کرنے لگی مگر اچانک وہ چونک پڑی جیسے اسے کچھ خیال آ گیا ہو۔

"وہ تو صرف سگار پیتا ہے، پھر سگریٹ کیس؟"

اور پھر آپ سے آپ اس کے قدم تیزی سے سیڑھیوں کی طرف اٹھنے لگے۔ اس نے اب تک اس کی صورت نہیں دیکھی تھی اور اس کا اندازِ تکلم...؟ وہ بھی آج کچھ بدلا ہوا ہی سا تھا۔ مگر جب وہ اندر کے ایک چوکور بڑے کمرے کو عبور کرتی ہوئی ایک دوسرے روشن اور آراستہ کمرے میں داخل ہوئی تو یہ دیکھ کر چونک پڑی۔

"کے سی کہاں ہے؟" کمرہ اچانک ایک کھنکتی ہوئی بھاری آواز سے گونج اٹھا۔ وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔

"کک کے... کے ی؟" اس کے حلق سے گھٹی ہوئی سی آواز نکلی۔ "وہ... وہ ابھی ابھی یہاں ہی تو آئے ہیں۔"

"یہاں کوئی نہیں آیا، بے وقوف لڑکی۔" وہی نامعلوم آواز گرجی۔

"مگر وہ...؟"

"تم ایک جاسوس کو ساتھ لگا کر لائی ہو۔"

"جا... سوس...؟" نیلی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا۔ وہ حسین شعلۂ جوالا جسے دیکھ کر کچھ دیر پہلے شوکت ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا اس وقت اس خوف زدہ ہرنی کی طرح نظر آ رہی تھی جو چوکڑیاں بھرتی ہوئی صیاد کے دام میں آ گئی ہو۔

"مم... میں بے قصور ہوں، باس۔" اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"جانتا ہوں۔ ورنہ اب تک تم زندہ نہ رہتیں۔" آواز پھر گونجی۔

"مجھے ایک بار معاف کر دیا جائے۔" نیلی نے التجا کی۔

"صرف ایک بار، دوسری غلطی تمہاری موت ہوگی۔"

"اب ایسا نہ ہوگا، باس۔" اس نے کانپ کر کہا۔

"وہ جاسوس ہال کے تیسرے کمرے میں بند ہے۔ اس کا ایک ساتھی اور ابھی پہنچ رہا ہوگا۔ اور تم جانتی ہو کہ ان کے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔"

"یس، باس۔"

"تو جاؤ۔" یہ کہتے ہوئے وہ آواز مفقود ہو گئی اور چھت میں لگے ہوئے ایک چاند نما گول روشن شیڈ کے گرد رقص کرتا ہوا ایک باریک سا نیلی روشنی کا دائرہ نظر سے غائب ہو گیا۔ کمرے کی روشنی اور تیز ہو گئی۔ اس دائرے کے غائب ہوتے ہی نیلی کے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت لوٹ آئی۔ وہ اس کمرے سے باہر نکل آئی۔ چوکور ہال کا تیسرا کمرہ بند تھا اور اس کے اوپری حصے پر لگا ہوا ایک سرخ سا شیشہ چمک رہا تھا۔ وہ ابھی باہر کھڑی کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ

کسی کے قدموں کی مدھم سی چاپ نے اسے چونکا دیا۔

"میں ہوں، میڈم۔" دائیں سمت کے ایک دروازے سے یہ آواز آئی۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر کا پستہ قد سانولا سا آدمی کھڑا تھا۔

"اوہ تم۔ باہر کوئی ہے؟"

"ابھی تک تو نہیں آیا کوئی۔ ویسے دربان نگرانی کر رہا ہے۔"

مگر اسی وقت انھیں کتے کے بھونکنے کی آواز نے چونکا دیا۔

"کوئی آ رہا ہے۔" پستہ قد آدمی بولا۔

"آنے دو، سامنے سے ہٹ جاؤ۔"

نیلی یہ کہتی ہوئی تیزی سے ایک دوسرے کھلے ہوئے کمرے کے دروازے میں داخل ہو گئی اور پستہ قد آدمی اسی دروازے کی اوٹ میں غائب ہو گیا، جہاں سے نکلا تھا۔ دبے پاؤں اندر داخل ہونے والا انسپکٹر ڈیسوزا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول تھا اور وہ بہت چونکا ہوا سا احتیاط سے قدم بڑھا رہا تھا۔ کسی چیخ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس کی نظریں ایک کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ جھپٹ کر اس کے نزدیک دیوار سے جا چپکا۔ پھر اس نے جب جھانک کر کمرے کے اندر دیکھا تو چونک پڑا۔ اندر ایک سرخ ساڑی والی خوب صورت سی لڑکی فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔ ڈیسوزا نے ایک بار گھوم کر اس سونے ماحول کا جائزہ لیا جہاں اتنی بڑی کوٹھی میں اسے ابھی تک ایک بھی متنفس نظر نہیں آیا تھا اور پھر وہ پستول ہاتھ میں لیے ایک دم اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ خلافِ توقع وہاں کوئی اور نہ تھا۔ اس نے پستول جیب میں ڈالتے ہوئے ایک بار بے ہوش لڑکی کو پلٹ کر دیکھا پھر اسے ہوش میں لانے کے لیے جھنجوڑنے لگا۔

"خوب۔ بس اب بیٹھے بیٹھے ہی ہاتھ اوپر اٹھا دو، مسٹر۔" ایک بھاری آواز کمرے میں گونجی۔ پستہ قد آدمی پیچھے دروازے میں پستول بدست کھڑا تھا۔ ڈیسوزا نے چاہا کہ جلدی

سے پستول نکال لے، لیکن پستہ قد آدمی نے فائر کر دیا اور گولی سنسناتی ہوئی ڈیسوزا کے سر کے اوپری بالوں سے چھلتی گزر گئی۔

”ایک اور حرکت تمہیں جہنم میں پہنچا دے گی۔“ پستہ قد بڑبڑایا اور ڈیسوزا نے کوشش بے سود سمجھ کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ لڑکی نے اسی وقت مسکرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اور اس وقت ڈیسوزا کو اس فریب کا احساس ہوا جس میں وہ اپنی حماقت سے پھنس چکا تھا۔ نیلی ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے قریب سے گزر کر دروازے کی طرف جانے لگی، لیکن جیسے ہی وہ اس کے قریب ہو کر نکلی ڈیسوزا نے بڑی پھرتی سے اسے پیچھے سے جکڑ لیا۔

”اب چلاؤ گولی۔“ اس نے پستہ قد کو چیلنج کیا۔

”میں کہتا ہوں چھوڑ دو اسے ورنہ تمہاری زندگی ک ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔“

”خوب۔“ یہ کہہ کر ڈیسوزا نے ایک ہاتھ سے نیلی پر گرفت مضبوط رکھی اور دوسرے سے جلدی سے جیب سے پستول نکال لیا۔ پستہ قد اس کی اس حرکت سے غافل تھا۔ اسے اس وقت احساس ہوا جب ڈیسوزا کے ریوالور سے شعلہ نکلا اور پستہ قد کے ہاتھ سے پستول دور جا گرا۔ وہ اپنا زخمی ہاتھ دبا کر جھک گیا۔

لیکن ابھی ڈیسوزا نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ کمرے کی چھت میں لگا ہوا ایک گول شیشے کا شیڈ روشن ہو گیا۔

”مسٹر انسپکٹر، یہاں سے بچ کر نکلنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔“ ایک نامعلوم آواز کمرے میں گونج اٹھی اور ڈیسوزا ٹھٹک کر رہ گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس زرد گول روشن طبق کے گرد ایک آسمانی روشنی کا باریک سا دائرہ بننا شروع ہو گیا جسے دیکھتے ہی نیلی کی آنکھیں حیرت وخوف سے پھیل گئیں۔ اس نے ایک چیخ ماری اور ڈیسوزا کی گرفت میں ہی جھول گئی۔

اسے آسمانی روشنی کے دائرے کی طرف دیکھ کر خوف زدہ ہوتے ڈیسوزا نے بھی

دیکھ لیا تھا۔ اس نے پستول کا رخ دائرے کی طرف کر دیا، لیکن ایسا کرتے ہوئے نیلا دائرہ زرد روشنی سے پھیل کر الگ ہو گیا اور پھیلتے ہوئے رنگ کی طرح نیچے معلق ہو گیا۔ اس نے اب ڈیسوزا اور نیلی کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ ڈیسوزا کو ایسے محسوس ہونے لگا جیسے اس کے ہاتھ پیروں کی جان نکلی جا رہی ہے۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ مع نیلی کے وہیں گر پڑا۔ ان کے گرتے ہی وہ دائرہ اوپر کی طرف سکڑ کر غائب ہو گیا اور کمرہ ایک بھیانک خوف ناک قہقہے سے گونج اٹھا۔

"میں انھیں عبرت ناک سزا دوں گا، ہاشم۔ اسے بھی اس جاسوس کے کمرے میں پہنچا دو اور لڑکی کو اوپر کے میرے کمرے میں بچھی ہوئی میز پر لے جا کر لٹا دو۔" نامعلوم اور پراسرار انسان کی آواز نے پستہ قد آدمی کو حکم دیا۔

"باس، میرا ہاتھ۔" پستہ قد آدمی نے کہنا چاہا۔

"مجھے نزاکت پسند نہیں ہے۔" وہی کڑکتی آواز سنائی دی جس کے ردِعمل میں ہاشم لرز اٹھا۔

"او کے، باس۔" اس نے سہم کر کہا۔ اور وہ دائرہ اور زرد روشنی معدوم ہو گئی۔ زخمی ہاتھ ہونے کے باوجود ہاشم نے ڈیسوزا کو دونوں ہاتھوں کے بل پیٹھ پر اس طرح لاد لیا جیسے قلی بارے اٹھاتے ہیں۔ دراز قد ڈیسوزا کے پیر زمین میں پر رہے تھے۔ وہ بے ہوش تھا۔ وہ اسے اس بند کمرے تک لایا جس کے دروازے کے اوپر سرخ روشنی تھی۔ پھر اس نے اسے زمین پر لٹا کر پہلے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ڈیسوزا کے پرس میں کاغذات کے علاوہ پچاس روپے کچھ آنے تھے۔ وہ اس نے اپنی جیب میں ڈال لیے اور پرس کو لاپرواہی کے ساتھ ایک طرف پھینک دیا۔ پھر ڈیسوزا کا پستول اپنی جیب میں ڈال کر اس نے بند دروازے کے کی ہول میں چابی ڈال کر تین بار گھمائی جس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا اور وہ ڈیسوزا کو گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا۔ اس کمرے میں ایک آدمی اور بھی فرش پر بے ہوش پڑا تھا، لیکن جیسے ہی ہاشم نے اس کی

شکل دیکھی وہ چونک پڑا۔

"کے سی، چھوٹا باس۔" حیرت سے وہ بڑبڑایا۔ اور پھر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کمرے کی چھت میں بھی ویسا ہی گول شیڈ لگا ہوا تھا جو اس وقت روشن ہو گیا۔

"بے وقوف، وہ کے سی نہیں ایک خطرناک جاسوس ہے۔ تم جاؤ اپنا کام کرو۔" نامعلوم آواز کہتی سنائی دی۔

"آئی ایم سار، باس۔" یہ کہتے ہوئے ہاشم نے بے ہوش کے سی کو ایک ٹھوکر ماری اور دروازہ بند کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

اور جب وہ بے ہوش نیلی کو بازوؤں پر اٹھائے اوپری منزل کی طرف لے جا رہا تھا تو اس کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ وہ اس پیکرِ شباب کے خوب صورت چہرے کو ترسی ہوئی نظروں سے تکتا جاتا تھا۔ اس نے اوپری منزل کی تین نمبر کمرے میں اسے میز پر لٹا دیا اور اس کے سرہانے کھڑا ہو کر اس کی صورت تکنے لگا۔ پھر اچانک اسے اپنا خوف ناک باس یاد آ گیا جو ایسی بے ہودگیوں کی بڑی عبرت ناک سزائیں دیا کرتا تھا۔ وہ کانپ کر وہاں سے کھسک گیا۔

☆☆☆☆☆☆

خوفناک آواز

ڈیسوزا کی جب آنکھ کھلی تو اس کے نزدیک ہی شہر کا ایک خطرناک ترین مجرم کے سی کلبلا رہا تھا۔ شاید وہ بھی ہوش میں آ رہا تھا اور چند سیکنڈ بعد اس نے بھی آنکھیں کھول دیں اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"ارے تم...؟ تم بھی یہاں پہنچ گئے؟" اس نے ڈیسوزا کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔

"مجھے پہلے ہی ڈر تھا کہ تم جلدبازی ضرور کرو گے۔" وہ بولا۔

"کس سے باتیں کر رہے ہو؟" ڈیسوزا نے اس تم کا برا مان کر بگڑے لہجے میں کہا۔ کے سی اس کیفیت میں بھی مسکرا دیا۔ لیکن اسی وقت وہ مصیبت پھر آ پہنچی۔ چھت گیر گول شیڈ روشن ہوگی اور پھر وہ آسمانی دائرہ بھی، جو اس کے چاروں طرف گردش کرتا تھا۔

"ہوں، مائی ڈیر سراغ رساں۔ اب ہوش میں آ کر کام کی باتیں کرو۔" وہی نامعلوم آواز کمرے میں گونجتی سنائی دی۔ ڈیسوزا اور وہ دونوں چونک پڑے۔

"بزدلوں کی طرف پس پردہ رہ کر کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ جرأت ہے تو سامنے آ جاؤ۔" نقلی کے سی نے طنزیہ جواب دیا۔

"اوہ، میں تمہارے اس اسسٹنٹ کی طرح بے وقوف نہیں ہوں جو صرف کسی لڑکی کی چیخ پر دوڑ پڑے اور پھر یہ کس نے کہہ دیا کہ میں تمہارے سامنے نہیں ہوں۔ پھر باتیں تم سے کون کر رہا ہے؟" اس پراسرار آواز نے جواب دیا۔

"میں جانتا ہوں تم کہاں سے بول رہے ہو۔"

"وہ تمہارے فرشتے بھی نہیں جان سکتے۔ خیر، کے سی کہاں ہے؟" اس آواز نے پوچھا۔

"جہنم میں۔"

"میں صرف سیدھے جواب سننے کا عادی ہوں، ورنہ تم بھی وہیں پہنچ جاؤ گے۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"تمہارے یہ سائنسی شعبدے مجھے مرعوب نہیں کر سکتے، ڈاکٹر۔" نقلی کے سی نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

"ڈاکٹر...؟" اس آواز نے دہرایا اور پھر اس کا خوف ناک قہقہہ کئی سیکنڈ سنائی دیتا رہا۔

"تم بچوں جیسے اندازے قائم کرتے ہو، مسٹر خان۔ میری شخصیت کو جاننے کے لیے تمہیں کئی جنم لینے پڑیں گے۔"

"لیکن میں تمہیں ایک سے زیادہ جنم نہیں لینے دوں گا۔" نقلی کے سی نے کہا۔

ڈیسوزا خان کا نام سن کر چونک پڑا۔ "تو آپ ہیں۔" وہ حیرت سے بولا۔ "میں سمجھا تھا آپ نے صرف مجھ کو بھیجا ہے۔" ڈیسوزا نے آہستہ سے کہا۔

"میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا تھا، لیکن تب اب حد سے آگے بڑھ گئے ہو، اس لیے مجھے بے رحم بننا ہی پڑے گا۔" وہ آواز بولی۔

"کیا کہنے ہیں تمہاری رحم دلی کے؟ بے گناہ پبلک کی جانوں سے کھیلنے والے بزدل آدمی، میرے ہاتھ پڑ گئے تو میں تمہاری چٹنی بنا دوں گا۔" خان کا لہجہ کسی قدر جوشیلا ہو گیا۔

"آزادی کے خواب نہ دیکھو، میں تمہیں صرف پانچ منٹ دیتا ہوں۔ بتاؤ کے سی کہاں ہے؟ ورنہ بڑی بھیانک موت مرو گے۔"

"کوشش کر دیکھو۔" خان نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

لیکن اس کے بعد وہ آواز معدوم ہو گئی۔ اور خان اور ڈیسوزا ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ خان نے اس بند کمرے کے اطراف کا جائزہ لینا شروع کیا، لیکن دروازہ مضبوطی سے بند

تھا اور کمرے میں کوئی کھڑکی تک نہ تھی، سوائے ایک روشن دان کے، جو فرش سے تقریباً ۱۲۔۱۴ فٹ اونچا تھا اور یہ اس قدر تنگ تھا کہ اس میں سے باہر نکل سکنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ پانچ منٹ بے کار ہی گزر گئے اور ڈیسوزا تو مایوس سا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے موت ناچنے لگی۔ اس نامعلوم خوف ناک آدمی سے کچھ بعید نہ تھا۔ وہ چاہتا تو انھیں عالمِ بے ہوشی میں بھی ختم کر چکا ہوتا لیکن کے سی کا پتا پوچھنے کے لیے اس نے انھیں اتنی دیر زندہ رہنے کا موقع دیا تھا۔ خان پھر بھی مطمئن نظر آ رہا تھا۔

"پستول سالوں نے چھین لیے۔" ڈیسوزا نڈھال کیفیت میں بڑبڑایا۔

"اوہ، ہاں۔" خان کو کچھ یاد آ گیا۔ اس نے جلدی سے پتلون اتار کر اندر جانگیے کے نیچے ران پر ایک چمڑے کے تسمے سے چھوٹا سا ایک ریوالور بندھا ہوا تھا جو باریک چمڑے کے کیس میں تھا۔ اسے نکال کر پتلون پھر سے پہن لینے کے بعد خان نے ریوالور سے اس چھت گیر روشنی کے شیڈ پر فائر کر دیا۔ وہ چھناٹے کی آواز کے ساتھ چور چور ہو گیا۔ اس شیڈ کے چاروں طرف ایک باریک سا دراڑی نظر آ رہا تھا جس کی گہرائی چھت کے اندر تھی، لیکن شیڈ کے ٹوٹتے ہی وہی خوف ناک قہقہہ پھر کمرے میں گونجنے لگا۔

"اس سے کچھ نہ ہوگا، بیٹے جاسوس۔ تمہاری موت ٹل نہیں سکتی۔ میری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ پتھر کی لکیر ہے۔" یہ کہہ کر وہ آواز معدوم ہو گئی اور خان پھر اپنے ہاتھ جھلاتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ ڈیسوزا کے چہرے پر یاسیت کے آثار جھلکنے لگے تھے، جیسے وہ زندہ بچنے کی امید ہی چھوڑ دے رہا ہو۔

لیکن پانچ منٹ کے گزرتے ہی وہ چونک پڑے۔ آپ سے آپ کمرے کی دیوار میں ایک جگہ فرش کے نزدیک تقریباً ایک فٹ لمبا چوڑا خلا پیدا ہو گیا اور اس میں سے بھنبھناہٹ کی آواز آنے لگی۔

"اف، آئی موت۔" خان کے منہ سے نکلا۔ "وہ ضرور بلیک کی مکھیاں ہوں گی۔" یہ

کہتے ہوئے خان نے دوڑ کر اپنا کوٹ اتارتے ہوئے اس خلا پر ڈھاک دیا اور ڈیسوزا اور خان نے کوٹ کے سرے مضبوطی سے دبا لیے۔ صرف ایک مکھی باہر نکلنے میں کامیاب ہو سکی تھی، جو بڑی تیزی سے ان کے گرد چکر لگا رہی تھی۔

”اسے کسی طرح مارو، ورنہ حملہ کر دے گی۔“ خان نے کہا۔ ”میں کوٹ تھامتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس ن کوٹ کے نچلے حصے دونوں پیرو سے دبا لیے اور اوپر سے کونے ہاتھوں میں۔ ڈیسوزا نے اپنا کوٹ اتار لیا اور اس مکھی پر جھپٹ پڑا۔ کوٹ کے جھٹکے سے وہ مکھی دیوار سے جا ٹکرائی اور دوسرے لمحے وہ ڈیسواز کے جوتے کے نیچے تھی۔ خلا میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ اچانک کسی نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ پھر کیس کے بھاری جوتے کی ٹھوکریں دروازے پر پڑنے لگیں اور ایک بار پوری طاقت سے جیسے کسی نے دروازے پر دھکا مارا جس کے نتیجے میں پورا دروازہ مع ایک آدمی کے اندر آ رہا۔

”ارے بالے۔“ خان کے منہ سے نکلا۔

”بالے نہیں، سپر مین۔ آپ لوگوں نے نہیں دیکھا کہ میں نے ایک دھکے میں مضبوط دروازے کو چت کر دیا ہے۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھا۔

”ارے باہر نکلیے نا، آپ وہاں کیا کر رہے ہیں؟“ اس نے حیرت سے انھیں اس کیفیت میں دیکھ کر کہا۔

”میں نے موت کا دروازہ بند کر رکھا ہے، تم لوگ نکل جاؤ۔“

”اور آپ؟“ ڈیسوزا نے پوچھا۔

”میں آتا ہوں، میری فکر نہ کرو۔“

”تو ہم بھی نہیں جائیں گے۔“ بالے اکڑ گیا۔

”اچھا، میری جیب سے لائٹر نکال کر اس کوٹ میں آگ لگا دو۔“

”اس گرم کوٹ میں؟ یعنی آپ مفت میں ڈھائی سو کا خون کر رہے ہیں۔“

"جلدی کرو، الو۔ یہی ایک ترکیب کارگر ہو سکتی ہے ورنہ ان خوں خوار مکھیوں کو نکلنے کا ذرا بھی موقع ملا تو ہم تینوں کی موت ہو جائے گی۔" خان نے کہا۔

"ہائے رے، ڈھائی سو کے کوٹ۔" یہ کہتے ہوئے بالے نے کوٹ کو ان کی طرف سے آگ لگا دی۔ ذرا سی دیر میں کوٹ نے آگ پکڑ لی۔ یہاں تک کہ خان کو اپنے ہاتھ بھی جلتے محسوس ہونے لگے، لیکن وہ پھر بھی اسے اس حالت میں تھامے رہا جب تک کہ وہ اچھی طرح جل نہ اٹھا۔ پھر آپ سے آپ مکھیوں کی بھنبھناہٹ کم ہوتی معلوم ہونے لگی اور رفتہ رفتہ معدوم ہو گئی۔

"اوہ، تو باہر وہ بکس؟" یہ کہتے ہوئے کچھ یاد کر کے بالے باہر کی طرف دوڑ پڑا۔ خان اور ڈیسوزا ابھی اس کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے باہر نکل آئے۔ یہاں انھوں نے دیکھا دیوار سے ملا ہوا لوہے کا ایک چھوٹا سا بکس رکھا ہوا ہے جو اندازے کے مطابق عین اس خلا کے پیچھے تھا جو اندر کی دیوار میں پیدا ہوا۔

"یہاں اور کوئی نہیں ملا کیا؟" خان نے بالے سے پوچھا۔

"میں دراصل آپ کو ہی کے سی سمجھ کر آپ کی کار کے اسٹپنی میں چھپ گیا تھا۔ یہاں آپ اتر کر اندر آتے ہی غائب ہو گئے اور میں سامنے کی بجائے پیچھے سے اس عمارت میں داخل ہو کر ایک ایک جگہ تلاش کرتا رہا۔" بالے نے بتایا۔

"اور تمھیں کوئی نہیں ملا یہاں؟"

"جی نہیں۔ صرف ایک کمرے سے کچھ آواز آ رہی تھی۔ لیکن اندر گھسنے پر کوئی نظر نہ آیا۔"

"وہ لڑکی؟"

"ہائے وہی مل گئی ہوتی تو اپنی عاقبت نہ سدھر جاتی۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی دانست میں ہمیں موت کے حوالے کر کے نکل

گئے۔" خان بڑبڑایا۔

"اس سور کو ہمارے پروگراموں کی خبر کیسے ہو جاتی ہے؟"

"یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کئی بار ہمارا پالا ایسے سائنسی ذرائع والے مجرموں سے پڑ چکا ہے جو ہماری نقل و حرکت کی ذرا ذرا سی خبر رکھتے تھے۔ لیکن کیا حشر ہوا ان کا۔" خان نے پوچھا۔

"بیڑا غرق۔"

"تو یہ بھی کہاں جائے گا بچ کر۔" خان ہال کو عبور کر کے اندر والے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"لیکن اسے خبر کیسے ہو جاتی ہے ہر بات کی؟" ڈیسوزا نے سوال کیا۔

"ہر بات کی نہیں، صرف خاص خاص باتوں کی۔ اب دیکھو ہمارے نکلنے کی اس ترکیب کا انھیں علم نہیں ہوا۔ میرا یہاں کے سی کے بھیس میں یہاں آنا میری حماقت سے اسے معلوم ہوا، نہ میں روشنی دیکھ کر اس کمرے میں گھستا اور نہ بھانڈا پھوٹتا۔ تمھیں میں نے اسی لیے وائرلیس پر پیچھا کرنے کی ہدایت کی تھی کہ اسے صرف تم پر دشمن ہونے کا شبہ ہو اور اس طرح میرا کام زیادہ آسان ہو جائے۔ لیکن تم ذرا دیر میں پہنچے، ورنہ اس کی ساری توجہ تمھاری ہی طرف رہتی۔"

"میں نے آپ کو کے جی سمجھ کر ڈاج دینے کے لیے راستہ بدل دیا تھا۔" ڈیسوزا نے بتایا۔

"اچھا، یہ اوپر والا کیا جادو ہے؟"

"محض ایک سائنسی شعبدہ۔ پیرالائزر کرنے کی اوکڑک ویوز ہیں جن کو اس نے اپنے آدمیوں کے لیے جان کا خطرہ بنا رکھا ہے۔ حالاں کہ ان سے آدمی وقتی طور پر سن یا بے ہوش ہو جاتا ہے۔"

"آپ نے اسے ڈاکٹر کیوں کہا تھا؟"

"وہ میرا اندازہ تھا۔ کیوں کہ اب تک کے اس کے کام کرنے کے تمام طریقے یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ وہ میڈیکل سائنس میں مہارت رکھتا ہے۔"

"پھر اب؟"

"پہلے اس عمارت کی اچھی طرح تلاشی لے لیں بعد میں طے کریں گے۔" خان نے بتایا۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ مجرم جو بھی ہوں، بہت چالاک تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہائٹ ہاؤس میں جھاڑو دے دی گئی ہو۔ نہ تو کسی متنفس کا پتا تھا اور نہ میز و فرنیچر کسی کارآمد چیز کا۔

"ابراہیم کہاں ہے؟" خان نے باہر نکلتے ہوئے بالے سے پوچھا۔

"اسپتال میں۔ بھائی حرام مونچھ کی ڈیوٹی بھی وہیں لگا دی گئی ہے۔"

"مس بورکر؟"

"مس بورکر کا مجھے کیا پتا۔ میں اس کا پرائیوٹ سکریٹری ہوں کیا؟"

"ابے گدھے، میں اس نرس کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جسے دیکھ کر تم دیوانے ہو گئے تھے۔"

"اوہ، وہ مس بورکر تھی۔ تو پھر اسے میں بور ہونے کے لیے مونجی میں ہی چھوڑ آیا تھا۔"

خیر، یہ لو پاکٹ کیمرہ۔ اس میں اس لڑکی نیلی کی تصویر ہے۔ اس کا پرنٹ فوراً نکلوا لو۔" خان نے باہر پورٹیکو میں آتے ہوئے بالے کو ہدایت کی۔

"اس کا انلارجمنٹ بھی کرا لوں؟ مجھے اشد ضرورت ہے۔"

"بکو مت۔"

"ہائے، آپ اس کی خوب صورتی کا اندازہ اب تک نہیں لگا سکے۔ کوئی اور ہوتا تو

کب کا ریشہ خطمی ہو گیا ہوتا۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے؟" ڈیسوزا نے پوچھا۔

"ابھی گھر چل کر پروگرام بناتے ہیں۔ آج میں بری طرح بور ہو گیا ہوں۔" خان نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

باہر وہ کار اب تک موجود تھی جو ڈیسوزا لایا تھا اور جسے اس نے باہر سڑک پر ہی ایک طرف اندھیرے میں کھڑا کر دیا تھا۔

"ایک بات اور بتا دیجیے۔" بالے نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا؟" خان نے پوچھا۔

"آپ نے اس نیم چہرہ، لاحول ولاقوۃ۔ پری چہرہ خدائی آفت کا فوٹو کیسے لے لیا؟"

"جب وہ تمہارے اس جاگیردار کے ساتھ مونجنی میں داخل ہو رہی تھی۔ مونجنی کے دروازے پر اتنی کافی روشنی رہتی ہے کہ فلیش لائٹ کے بغیر ایک اچھے کیمرے سے فوٹو لیا جا سکے۔"

"اہا... تب تو میرا البم اب حسینانِ جہاں کے چوکھٹوں سے بھر جائے گا۔"

"میں فضولیات پسندی کے موڈ میں نہیں ہوں، بالے۔"

"فضولیات فضیلت کی جمع ہے۔ ویسے آپ نہیں مانتے تو میں چپ ہوں۔" خان نے کوئی جواب نہیں دیا اور دوڑتی کار میں کسی کے نہ ہونے جیسا سناٹا چھا گیا۔

☆☆☆☆☆☆

اغوا

'سلور کلب' اسٹیشن سے قریب ہی خوش فکر نوجوانوں کی ایک مشہور تفریح گاہ تھی۔ چاند بیگ ایک ادھیڑ عمر کا تن درست سا آدمی اس کا منتظم اور مالک تھا۔ اس کلب کے ممبر ہر فرقہ و مذہب اور ہر طبقہ خیال ک لوگ تھے۔ یہاں کھیلوں کی حد تک ہر قسم کے سامان مہیا تھے۔ ٹینس، پنگ پانگ، تاش، شطرنج، بلیرڈ اور دوسرے تمام ان ڈور گیمز۔ یہ کلب شروع میں چند دوستوں کے ساتھ چاند بیگ نے قائم کیا تھا، لیکن رفتہ رفتہ وہ اس قدر بڑھ گیا کہ ان دنوں دور دور کے علاقوں کے لوگ بھی اس کے ممبروں میں شامل ہو چکے تھے۔ سرِ شام ہی کلب میں چہل پہل شروع ہو جاتی اور رات کے گیارہ بارہ بجے تک رہتی۔ سلور کلب ایک کافی وسیع عمارت میں پھیلا ہوا تھا جس کے باہر ایک خوب صورت بغیچہ اور پھر قد آدم فصیل والا احاطہ تھا۔ ہفتے کے ہفتے اس کلب میں رقص اور موسیقی کا پروگرام بھی ہوا کرتا تھا۔

کلب کا آج کا پروگرام کچھ مختلف تھا۔ بنگال کے آئے ہوئے موسیقاروں کے ایک گروپ کو کلب کی طرف سے عصرانہ دیا گیا تھا اور اسی سلسلے میں ان موسیقاروں نے کلب کے ممبروں کے سامنے اپنے فنِ موسیقی کا مظاہرہ کرنے کا وعدہ کیا تھا جس کی وجہ سے بعض ممبروں نے اپنے قریبی دوستوں یا رشتے داروں کو بھی مدعو کر لیا تھا۔ چاند بیگ خود مہمانوں کے استقبال میں پیش پیش تھا۔

یہ کلب کیوں کہ شہر کے معروف تر علاقوں سے علاحدہ اور اپنے ممبروں تک ہی محدود تھا، اس لیے شہر کی مصروف زندگی سے غیر متعلق اور پولیس کی نظروں سے بھی دور رہتا۔ کیوں کہ چاند بیگ پر پولیس کو اعتماد تھا اور وہ جانتی تھی کہ یہ مہذب آدمیوں کا کلب ہے اس لیے یہاں غیر قانونی لوگوں کی آمد کا سوال ہی نہیں اور پھر خود کلب کا مالک چاند بیگ بھی اس اصول

پر سختی سے کاربند تھا۔ اس کی عقابی نگاہیں اندر آنے والوں کے چہرے پہچان لیتیں اور اگر کوئی غلط سوسائٹ کا آدمی وہاں آ پہنچتا تو اسے اخلاقی معذرت کے ساتھ دروازے سے ہی لوٹا دیا جاتا۔

اس وقت وہ ہال کے داخلی دروازے پر کھڑا بڑے غور سے ان پانچ آدمیوں کو دیکھ رہا تھا جو بغیچہ عبور کر کے دروازے کی طرف آ رہے تھے۔ یہ لوگ شکل اور لباس سے کچھ اچھے لوگ معلوم نہ ہوتے تھے۔ ان میں آگے آگے ایک نوجوان اور تن درست آدمی تھا جس نے سر پر ایک پچرنگی پی کیپ لگا رکھی تھی۔ وہ ایک پیازی رنگ کی بش شرٹ پہنے تھا جس پر راج کپور کی فلم کمپنی کے آر کے کے ٹریڈ مارک جگہ جگہ چھپے ہوئے تھے، اس کے پیروں میں پشاوری چپلیں تھیں اور پتلون کے پائنچے ٹخنوں سے اوپر اٹھے ہوئے تھے، بش کوٹ کے سامنے کے بٹن کھولے وہ بڑے لاابالی انداز میں آڑا ترچھا ہو کر چل رہا تھا۔ پیچھے چار آدمیوں میں ایک دہرے بدن کا آدمی تھا جس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں، چہرہ گول لیکن داہنے گال پر زخم کا گہرا سا نشان تھا، اس نے ایک دھاری دار بنیان اور گرم پتلون پہن رکھی تھی۔ دوسرا لمبے قد کا تن درست سا آدمی تھا اس کے چہرے پر مکھی چھاپ ہٹلری مونچھیں تھیں، چہرہ بھرا ہوا اور اس پر کہیں کہیں چیچک کے داغ تھے، سر کے بال چھوٹے تھے، اس نے صرف قمیص اور پینٹ پہن رکھی۔ تیسرا ایک دبلا پتلا منحنی سا اوسط قد و مات کا آدمی تھا، گال ذرا پچکے ہوئے لیکن آنکھیں چمکیلی تھیں، مونچھیں باریک اور اوپری ہونٹوں کے دونوں سروں سے کم ہی تھیں، یہ پاجامہ، کرتا اور کوٹ پہنے تھا، سر پر بال دار ٹوپی تھی۔ چوتھا بھی اکہرے بدن کا آدمی تھا لیکن اس کا چہرہ، داڑھی اور مونچھوں سے بے نیاز تھا، ٹھوڑی لمبی، چہرہ کتابی اور آنکھیں چمکیلی تھیں، ناک طوطے کی طرح ٹھوڑی کی طرف گھومی ہوئی تھی، یہ نیلے رنگ کی بش شرٹ اور سفید پتلون میں تھا۔

وہ پانچوں دروازے میں داخل ہو کر جب چاند بیگ کے سامنے سے گزرنے لگے تو وہ انھیں پہچاننے کی کوشش کرتا رہا، لیکن ان میں سے ایک بھی صورت جانی پہچانی معلوم نہ پڑتی

تھی۔ وہ داہنے ہاتھ پر مڑ کر ایک میز کے گرف بیٹھ گئے۔ پچرنگی پی کیپ والا جوان آدمی ان چاروں کا سرغنہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ایک طائرانہ نظر پورے ہال پر ڈالی اور پھر اپنا سینہ پہلے سے زیادہ پھلا لیا۔

موسیقاروں کا پروگرام شروع ہونے میں صرف چند منٹ رہ گئے تھے۔ ان پانچ آدمیوں کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اسے کوئی ہوٹل یا عام تفریح گاہ سمجھ کر گھس آئے ہوں۔ چاند بیگ سے نہ رہا گیا تو وہ ان کے قریب پہنچ ہی گیا۔ وہ انھیں باری باری دیکھ کر پچرنگی پی کیپ والے کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"آپ کو کیا تکلیف ہے، بھائی؟" پی کیپ والے نے خودی شانِ بے نیازی سے اسے مخاطب کیا۔

"کیا میں آپ کا تعارف حاصل کر سکتا ہوں؟" چاند بیگ نے مہذبانہ لہجے میں کہا۔

"ارے تم کیا حاصل کرو گے مجھ سے، کوئی ایسا ویسا سمجھا ہے کیا۔" پچرنگی پی کیپ والا بگڑ گیا۔ اور چاند بیگ اس خیال سے گھبرا سا گیا کہ اگر ان لوگوں سے بات بڑھائی گئی تو پروگرام کا رنگ بگڑ جائے گا اور مفت میں سبکی ہوگی۔

"میں تو یہ پوچھ رہا تھا کہ آپ کون لوگ ہیں؟"

"ایسا، تو پھر یہ تارووارف کا لفوا کائے کو، سیدھے سیدھے پوچھنا یار کہ ہم کون ہیں؟"

"تم استاد کو نہیں جانتے، بھائی؟" منحنی آدمی نے چاند بیگ کی طرف ایسی نظروں سے دیکھ کر کہا جیسے وہ اسے کوئی بڑا بدنصیب انسان سمجھ رہا ہو اتنا بدنصیب جو اس کے استاد سے بھی واقف نہ ہو۔

"اب تم ہی جنوا دو نا۔" بڑی مونچھوں والا کسی قدر اینٹھ کر بولا۔

خیر، ہم خود ہی بتائے دیتے ہیں۔ اے، دیکھو، ہمارا نام ہے طرّے خاں اور یہ ہمارے الو کے پٹھے ہیں۔”

“استاد۔” بڑی مونچھوں والے نے فوراً ٹوک دیا۔

“کیا کہا میں نے؟ پٹھے ہی تو نا؟ ہاں، تو یہ ہمارے چاروں پٹھے، ارے بھئی، اپنا اپنا نام بتا دو نا۔”

“علی قلی خاں نمبر ۱” بڑی مونچھوں والے نے کہا۔

“علی قلی خاں نمبر ۲۔” دوسرا بولا۔

“علی قلی خاں نمبر ۳۔” منحنی سے آدمی نے بھی خود کو شامل کر لیا۔

“علی قلی خاں نمبر ۴۔” چوتھے نے بتایا۔

“اور میں ان علی قلیوں کا باوا آدم۔”

“استاد، قلی سامان ڈھونے والے کو کہتے ہیں۔” بڑی مونچھوں والے نے پھر نکتہ اعتراض بلند کیا۔

“ارے یار، چار علی قلی مل کر قلی قلیوں نہیں ہوتے تو کیا تمہارا سر ہوتے؟” پچرنگی پی کیپ والے نے اسے ڈانٹ دیا۔

“ہاں، استاد۔ جیسے بلی کی بلیوں۔”

وہ آپس میں ہی بحث کرنے لگے اور چاند بیگ ان کے اس عجیب سے سوال پر کچھ مشتعل سا ہو گیا۔

“آپ لوگ یہاں سے تشریف لے جایئے۔ یہ پرائیوٹ کلب ہے۔” چاند بیگ نے جھنجلا کر کہا۔

“کدھر کہتا ہے پراویٹ ارا ویٹ۔” ہیٹ والے نے ناک بھوں چڑھا کر پوچھا۔

“یہ کلب صرف ممبروں کے لیے ہے۔ آپ لوگ کہیں اور تشریف لے جایئے۔”

اس بار چاند بیگ کا لہجہ زیادہ سخت تھا۔

"کیا کہا؟ کیا لے جایے؟" ہیٹ والا بگڑ گیا۔

"میں پولیس کو فون کر دوں گا۔"

"ارے جاؤ جاؤ، بڑے آئے خون کرنے والے۔ یہاں تو خود درجنوں خون کر کے بیٹھے ہیں۔" ہیٹ والے نے اور مشتعل ہوتے ہوئے کہا۔

"تو پھر مجھے پولیس کو بلانا ہی پڑے گا۔" یہ کہتا ہوا جواب کا انتظار کیے بغیر چاند بیگ چلا گیا۔ پچرنگی ٹی شرٹ والے نے اس کے جانے کے بعد بڑی مونچھوں والے علی قلی خاں نمبرا کو آنکھ ماری اور دونوں مسکرا دیے۔ اتنے میں اناؤنسر کلب کے وسیع ہال کے اسٹیج پر آتا ہوا نظر آیا اور ساتھ ہی مائک میں گونج پیدا ہو گئی۔

"حضرات، آپ کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اب کلب کی طرف سے موسیقی کا پروگرام پیش کیا جا رہا ہے۔ اور ہمیں یہ اعلان کرنے میں بھی بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ آج کے اس پروگران کا افتتاح مس ایلینا کے رقص سے ہوگا۔ مس ایلینا کوئی پیشہ ور رقاصہ نہیں، بلکہ جیسا کہ آپ میں سے اکثر لوگ جانتے ہوں گے ایک گراں قدر فنکار ہیں۔ ہم ان سے درخواست کریں گے کہ وہ اسٹیج پر تشریف لائیں۔"

اناؤنسر کے اس اعلان کے بعد ہی اسٹیج کی روشنی زرد سے تبدیل ہو کر سرخ ہو گئی اور ایک عکس اس پر لہرانے لگا۔ پھر رفتہ رفتہ اسٹیج کی دوسری روشنیاں بھی جل اٹھیں اور لوگ ایک شعلہ جوالا کو اسٹیج پر آمادۂ رقص دیکھ کر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ایلینا سرخ و سفید رنگ کی گدرے بدن والی جوان سال لڑکی تھی۔ اس کے حسن میں ایک خاص کشش اور آنکھوں میں تیز چمک تھی۔ اس کی سڈول گوری پنڈلیاں تعیش پسندوں کے لیے مرکز نظر بنی ہوئی تھی۔ چہرے سے وہ کوئی اطالوی یا پھر اینگلو انڈین لڑکی معلوم ہوتی تھی، لیکن رقص کا انداز ہندوستانی تھا۔ اس نے پیروں میں پیتل کے گھنگھرو باندھ رکھے تھے۔ اور سرخ نیل پالش والے چمک دار

ناخنوں کے ساتھ ٹخنوں سے نیچے اس کے بھرے بھرے پیر بہت خوب صورت معلوم ہو رہے تھے۔

”ارے، کیا مال ہے، یار یہ بھی۔“ پچرنگی بش شرٹ والے نے بے ساختہ انداز میں ایلینا کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ آواز نہ آہستہ تھی نہ تیز لیکن پاس والی میز پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے اسے ضرور سن لیا۔ وہ چونک کر انھیں دیکھنے لگے۔ ”ان لوگوں کو کیا تکلیف ہے، بھائی؟“ پچرنگی بش شرٹ والا اپنے ساتھیوں کی طرف رخ کر کے بھونڈی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

”چلتے ہوں گے، سالے۔“ علی قلی نمبر ۲ نے اینٹھتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

ان کی میز اسٹیج سے زیادہ دور نہ تھی اور پچرنگی بش شرٹ والا ترسی ہوئی نگاہوں سے ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی اس حسین رقاصہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بار بار اس کے گھنگھروؤں کی تھاپ پر اس طرح اچھل پڑتا جیسے ان سفید نرم اور نازک پیروں میں بندھے ہوئے گھنگھروؤں کی نقرئی جھنکار اس کے احساسات کو جھٹکے دے رہی ہو۔ لیکن ایک بار جب وہ رقص کرتی ہوئی اسٹیج کے سرے پر آئی تو وہ ایک دم چونک پڑا۔ وہ اس کے اس پیر دیکھتا رہ گیا جسے ایڑی کے بل آگے بڑھا کر وہ پاروتی کے رقص کا ایک منظر پیش کر رہی تھی۔

اس کے اس پیر کی انگلیوں میں بیچ کی انگلی چھوٹی اور اوپر اٹھی ہوئی تھی۔

”بھائی علی قلیو۔“ اس نے ایک لمبی سی سانس کھینچ کر اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ وہ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”کیا بات ہے؟“ ایک نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہم تو مر مٹے اس پر۔“

”پھر اڑا دو سالی کو۔“ نمبر ۲ نے مشورہ دیا۔

”کب؟“

"ابھی اس کا ناچ ختم ہونے کے بعد۔"

"طے رہی۔"

"لیکن وہ چاند بیگ تو ہمارے لیے پولیس کو بلانے گیا ہے؟"

"ہمارا کام اس سے پہلے ہو سکتا ہے۔"

"تو پھر دیر کیا ہے، اس کا ناچ اب ختم ہی ہو رہا ہے۔"

"بس تیار ہو جاؤ۔"

"اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہوگا؟"

"اسے ہم سنبھال لیں گے۔"

ان کے گفتگو کرتے کرتے ایلینا کا رقص ختم ہو گیا اور موسیقاروں نے اپنا پروگرام شروع کر دیا۔ ایلینا اب اپنا لباس تبدیل کرنے ہال سے ملے ہوئے پچھلے کمرے میں جا رہی تھی۔ پچرنگی بش شرٹ والے کی نظریں برابر اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔

"ہائے، کیا حرام ناز ہے۔"

"خرامِ ناز۔" علی قلی نمبر ۱ نے اسے ٹوک دیا۔

"ہم نے کتاب میں یہی پڑھا تھا۔ تم اپنی اصلاح رہنے دو۔" بش شرٹ والا اس پر بگڑ گیا۔ ایلینا کے جاتے ہی دوسرے سرے کی میز سے ایک تن درست سا ادھیڑ عمر آدمی جس نے گرم سرمئی سوٹ پہن رکھا تھا، اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا ایک ہاتھ اس کی جیب میں تھا۔ اس نے ایک نظر ہال پر ڈالی اور کنارے کنارے چلتا ہوا ہال کے پچھلے کمرے میں گھس گیا۔

"اس کمرے کا ایک دروازہ پیچھے برآمدے سے بھی ہے۔" علی قلی نمبر ۲ نے آہستہ سے پچرنگی بش شرٹ والے کے کان میں کہا۔

"ایسا تو پھر ایک ایک کر کے برآمدے میں ہی نکل آؤ۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور

سامنے والے دروازے سے باہر نکل گیا۔

ہال کی پشت پر تقریباً چھ فٹ چوڑا برآمدہ تھا۔ اندر پروگرام ہونے کی وجہ سے باہر سناٹا تھا۔ پچرنگی بش شرٹ والے نے بند کھڑکی کے شیشے سے جھانک کر دیکھا، اندر ایلینا لباس تبدیل کر چکی تھی اور کرٹن پارٹیشن سے باہر نکل رہی تھی۔ کمرے میں وہ آدمی دیوار کی طرف پشت کیے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ ایلینا اسے دیکھ کر چونک پڑی۔

"تم...؟" اس کے منہ سے نکلا۔

"تمہیں لوگوں کی نظروں سے محفوظ رہنے کی ہدایت کی گئی تھی؟" اس آدمی نے اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے بھاری لہجے میں سوال کیا۔

"میں غلام نہیں ہوں کسی کی۔ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔" ایلینا نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"لڑکی، جانتی ہو تم کس سے باتیں کر رہی ہو؟" وہ آدمی طیش میں آ گیا۔

"ایک نامعلوم آقا کے وفادار کتے سے۔" ایلینا نے بگڑ کر جواب دیا۔

"اگر مجھے باس کی ناراضگی کا خیال نہ ہوتا تو میں ابھی تمہیں تمہارے انجام کو پہنچا دیتا۔"

"اس سے کہہ دو کہ مجھ سے کام لینا ہے تو مجھ پر ضرورت سے زیادہ حکومت نہ جتائے۔" ایلینا نے کہو۔

"باس جو کچھ کرتا ہے، سوچ سمجھ کر کرتا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ پولیس کو تمہاری کس قدر تلاش ہے؟"

"یہ جھوٹ ہے۔ میرے بارے میں پولیس کے فرشتوں کو بھی شبہ نہیں۔"

"جو کچھ بھی ہو، باس کا حکم ہر صورت مانا جائے گا۔"

"میں نے اب تک اس کے کسی حکم سے سرتابی نہیں کی، لیکن یہ میرا ذاتی معاملہ

ہے۔“

”جس کی خاطر تم نے اس پروگرام میں باس کی مرضی کے خلاف شرکت کی ہے، وہ ہماری قید میں پہنچ چکا ہے۔ اور تمہاری ایک غلطی اس کی زندگی بھی ختم کرا دے گی۔“ اس آدمی نے آہستہ مگر تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”اوہ... جب ہی وہ یہاں نہیں تھا۔“ لڑکی نے اسے بجھی ہوئی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

”تمہیں اسی وقت واپس جانا ہوگا۔“ وہ دروازے کی طرف پلٹتے ہوئے بولا۔

اور لڑکی نے پریشان ہو کر سر جھکا لیا جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہو۔ وہ آدمی اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے چند منٹ بعد ہی ایلینا اٹھ کھڑی ہوئی، آئینے کے سامنے پہنچ کر اس نے پہلے اپنا چہرہ صاف کیا اور پھر اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر سیاہ بالوں کا وگ اتار ڈالا۔ اندر سے اس کے ریشمی سنہرے بال چمکتے نظر آنے لگے۔ وہ اب چہرے پر خفیف سے تغیر کے ساتھ مونجی کی نیلی نظر آنے لگی تھی۔ چیچرنگی بش شرٹ والے کے چاروں ساتھی برآمدے میں آ چکے تھے۔ ان میں سے دو کلب کے دروازے کے نزدیک ٹہل رہے تھے۔

باہر ابتدائی رات کی سیاہی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ برآمدے سے ہوتی ہوئی ایلینا سیڑھیاں اتر کر باہر نکلی۔ اندر پروگرام ابھی جاری تھا۔ اور چاند بیگ پولیس کو ٹیلی فون کرنے کے بعد مس ایلینا کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔

باہر ایک چھوٹی سی دو سیٹر پرانی کار ایک طرف کھڑی تھی اور وہ گرم سوٹ والا ادھیڑ عمر آدمی اسٹیئرنگ پر بیٹھا بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایلینا کو دیکھتے ہی اس نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ ان کی کار کے روانہ ہوتے ہی ایک دوسری ٹیکسی اس کے پیچھے چل پڑی۔ اس میں چیچرنگی بش شرٹ والا اور اس کے چاروں ساتھی تھے۔

ہری رام روڈ سے نکل کر جب وہ کار شومین کراس اسٹریٹ پر گھومی تو وہ ٹیکسی نظر سے غائب ہو چکی تھی۔ یہ سڑک عام طور سے سونی رہتی تھی۔ کار میں وہ دونوں خاموش تھے۔ نہ اب تک ایلینا نے اس سے کوئی گفتگو کی تھی نہ اس نے۔

اچانک شومین کراس اسٹریٹ کے دوسرے سرے پر ایک ٹیکسی نے سامنے آ کر ان کا راستہ روک لیا۔ اس میں سے اترنے والے پچرنگی بش شرٹ والا اور اس کا ساتھی تھے۔ ادھیڑ عمر آدمی کا ہاتھ اس کی جیب میں چلا گیا۔ لیکن ان میں سے دو تو گاڑی کی بانٹ کھول کر اس کا انجن دیکھتے رہے اور دو ٹہلتے ہوئے ایلینا والی کار کے نزدیک آ گئے۔ وہ کیوں کہ چلنے سے غنڈے قسم کے آدمی معلوم ہوتے تھے اس لیے اس آدمی نے کوئی پہل نہیں کی۔ وہ خموشی سے اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

”بھائی صاحب، ذرانچ ہوگا آپ کے پاس، ایکسیلیٹر کا تار ٹوٹ گیا ہے۔“ ان میں سے علی قلی نمبرا نے نزدیک آ کر اس سے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس آدمی نے بگڑا ہوا سا جواب دیا۔ ”گاڑی دھکیل کر راستے سے ہٹا لو۔“

”اچھی بات ہے۔“ یہ کہہ کر گھومتے گھومتے وہ تیزی سے پھر پلٹا اور اس پھرتی سے اس نے اس آدمی کی گردن اپنی گرفت میں لے لی کہ وہ اپنی جیب میں پڑا ہوا ہاتھ بھی نہ نکال سکا۔ دوسرے ساتھی نے فوراً ہی کار کا دروازہ کھول دیا اور بڑی مونچھوں والے علی قلی نمبرا نے اسے گاڑی سے سڑک پر گھسیٹ لیا۔ علی قلی نمبر۲ نے گاڑی کا سوئچ آف کر کے چابی نکال کر اپنی جیب میں ڈال لی۔ اتنی دیر میں پچرنگی بش شرٹ والا ٹہلتا ہوا قریب آ گیا۔ وہ بڑی لاپرواہی سے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور ایلینا اب تک گم سم سی بیٹھی تھی۔ شاید وہ ابھی فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں، وہ پولیس کے آدمی تو کسی صورت معلوم نہ ہوتے تھے۔

"ہائے، یہی تو ہیں وہ جنھوں نے ہمارا دل چرایا ہے۔" پچرنگی بش شرٹ والے نے کار کی کھڑکی سے اندر جھانک کر ایلینا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون ہو تم؟" ایلینا نے بگڑ کر پوچھا۔

"کون ہیں؟ ہائے، تیرِ نظر سے گھائل کر کے پوچھتے ہو کیا ہوا؟" پچرنگی بش شرٹ والے نے گھٹیا سا بے تکا شعر جڑ دیا۔

"کیا چاہتے ہو؟" ایلینا نے بھنوئیں سکوڑ کر پوچھا۔

"ارے، مریضِ محبت دوا چاہتے ہیں۔ تمھیں تو معلوم ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔" اس نے عامیانہ پن کا مظاہرہ کیا۔

"استاد، یہ باتیں پھر کر لینا، ورنہ کہیں پولیس آ گئی تو...؟" بڑی مونچھوں والے علی قلی نمبرا نے چند گھونسوں میں اس ادھیڑ عمر آدمی کو ہوش کی سرحد سے آگے پہنچ کر پلٹتے ہوئے کہا۔

"چلو، جانِ من۔" پچرنگی بش شرٹ والا لڑکی کو کار سے باہر گھسیٹتے ہوئے بولا۔ اور یہ دیکھ کر کہ وہ اپنے منی بیگ میں ہاتھ ڈالنا چاہتی ہے اس نے اس کا منی بیگ چھین کر ساتھی کی طرف پھینک دیا۔

"سیدھی چلتی ہو یا...؟" یہ کہہ کر اس نے زبردستی سے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ وہ مچلنے لگی، نمبرا بڑھا کہ اس کی مدد کرے مگر اس نے روک دیا۔

"اونہہ، پرائی چیز کو ہاتھ لگانا حرام ہے۔" اس نے سر ہلا کر اسے منع کیا۔

"اور تم تو جیسے اس کے سگے ہو گے۔"

"ہیں نہیں تو ہو جائیں گے۔"

لیکن ان کی بحث یہیں رہ گئی۔ وہ دور سے آنے والی پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سن کر چونک پڑے۔

"جلدی کرو، شاید پولیس آ رہی ہے۔" پچرنگی بش شرٹ والے نے کہا۔

کچھ دیر بعد ان کی ٹیکسی خلافِ قانون پانچ آدمیوں اور ایک لڑکی کو لیے شہر کے مشرقی مضافات کی طرف دوڑ رہی تھی۔ پولیس کی دو گاڑیاں جن میں سے ایک پر پولیس افسروں کے ساتھ چاند بیگ بھی سوار تھا اور دوسری پر چند مسلح کانسٹیبل، پیچھے سے آ پہنچی، مگر ان کے درمیان تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ ٹیکسی کی رفتار اور تیز ہو گئی۔

شہر کی آخری ایکسائز چوکی سے نکلتے ہی انھوں نے گاڑی اس غیر آباد فوجی کیمپ کی طرف گھما دی جس کی بیرکس پچھلے دو سالوں سے ویران پڑی تھیں۔ جنگ کے اختتام کے بعد فوجوں کے اپنے مرکز کو لوٹ جانے سے یہاں الو بولنے لگے تھے۔ یہاں پانی وغیرہ کی قلت اور شہر سے دوری کی وجہ سے پناہ گزینوں نے بھی رہنا پسند نہیں کیا تھا اور پھر یہ بیرکس عرصے سے بے مرمت پڑی تھیں۔ اس لیے ان کا اجاڑ پن کسی قدر خطرناک بھی معلوم ہونے لگا تھا۔

ٹیکسی ایک اسٹور کی پرانی بیرک کے دروازے پر رک گئی۔ ان میں سے ایک نے جلدی سے اتر کر خالی اسٹور کا دروازہ کھول دیا اور ٹیکسی کو ڈرائیو کر کے اس کے اندر لے جانے کے بعد دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اتنے میں پولیس کی گاڑیاں بھی آ پہنچیں۔ پولیس کے نیچے اترتے ہی بیرکس کی طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ پولیس آفیسرز اور کانسٹیبل پیچھے ہٹ کر اپنی گاڑیوں کی آڑ میں ہو گئے اور باقاعدہ مقابلہ شروع ہو گیا۔

فائرنگ کا یہ تبادلہ بمشکل پانچ منٹ چلا، پھر بیرکس کی طرف سے فائرنگ بند ہو گئی۔ پولیس نے یہ محسوس کرتے ہی تین طرف سے بیرک پر حملہ کر دیا، لیکن جب وہ اس میں داخل ہوئے تو انھیں یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ صرف ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی اور اسٹور بیرک کا پچھلا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پولیس تقریباً ایک گھنٹے تک اس مقام کی تلاشی لیتی رہی، لیکن جب انھیں کوئی نہ ملا تو مایوس ہو کر اپنا ایک آدمی وہاں چھوڑتے ہوئے وہ لوگ لوٹ گئے۔ ٹیکسی وہ واپس لیتے گئے تھے۔ پولیس کے چلے جانے کے چند منٹ بعد ہی بیرکس کے درمیان بنے ہوئے اس زمین دوز خشک ڈرین پٹ کے سے سوراخوں سے چار سر نکلے اور پھر چاروں

طرف نظریں دوڑانے کے بعد وہ باہر نکل آئے۔ پولیس کو اس مقام کا خیال تک نہ آیا ہوگا، حالاں کہ دو برس سے ویران پڑی ہوئی ان بیرکس کے ڈرین پٹس کا خشک ہونا قدرتی بات تھی۔

”گئے سالے۔“ پچرنگی بش شرٹ والے نے دونوں ہاتھ جھٹک کر کہا۔ اس کے بعد ایلینا کو بھی باہر نکال لیا گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ، انھوں نے اس کے منھ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ وہ ایک بیرک کی دیوار کے سہارے چلتے ہوئے دوسری ایک ویران بیرک میں داخل ہو گئے۔

”اچھا عشق ہے تمہارا استاد۔ پھوکٹ کا جھگڑا کھڑا کر رکھا ہے۔“ علی قلی نمبر ۲ نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

”تم شٹ اپ رہو، برخوردار۔ یہ دل کا معاملہ ہے۔ یعنی کہ بس دل ہی تو ہے۔“

”کچھ بھی ہو، استاد۔ چھانٹا خوب ہے، کیا لڑکی ہے۔“

”ارے چھانٹا میں نے ہے اور رال آپ کی ٹپک رہی ہے۔ میں اس کو سچ مچ اپنی گھر والی بناؤں گا۔“

”ہونہہ، بنایا، اب تک تو نہ جانے کتنی لونڈیوں کو راستہ دکھا چکے ہو۔“

”تم چپ رہو جی۔“

☆☆☆☆☆☆

چوہوں کی تجارت

سپرنٹنڈنٹ خان کی میز پر ایک دفتی کا چھوٹا سا ڈبہ رکھا ہوا تھا اور اس کے اندر اینٹی پلیگ انجیکشن تھے۔ وہ بڑے غور سے سرکاری کیمیکل اینالائزر کی رپورٹ دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت ابراہیم آپہنچا۔ چپراسی نے ہدایت کے مطابق اسے فوراً اندر پہنچا دیا۔

"ہُم... کیا ہوا؟" خان نے اس کا سلام لیتے ہوئے پوچھا۔

"اب تک مس ڈوری کو اے سی ٹی ایچ کے ایک درجن ٹیوب گلوکوز بلبس میں دیے جا چکے ہیں۔ ڈاکٹر شرما کا خیال ہے کہ اس کی دماغی کیفیت سنبھل رہی ہے۔" ابراہیم نے اٹینشن کھڑے ہوئے بتایا۔

"اور ڈاکٹر مارٹن؟"

"وہ بھی خطرے سے باہر ہیں۔"

"ڈوری کے لیے اب ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔"

"جی، بہتر ہے۔"

"وہ آدمی کہاں ہیں جو چوہے خریدتے ہوئے پکڑے گئے تھے؟"

"لاک اپ میں، اور چوہوں کے پنجرے باہر رکھے ہیں۔"

"کچھ بتاتے ہیں؟"

"دو نے قبولا ہے کہ ایک آدمی نے ان سے پانچ روپے فی چوہے کے حساب سے چوہے خریدنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ آدمی کون تھا۔"

"پھر کیا شیطان کے ہاتھ بیچتے وہ؟" خان نے جواب کی نصف نوعیت سے جھنجلا کر کہا۔

”اس نے انھیں چوہے لے کر رات کو ۹ بجے بڑے قبرستان کی شاہی باوڑی پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔“

”شاہی باوڑی؟“ خان سوچ میں پڑ گیا۔

”اچھا، تو پھر تم افضل خاں اور دوسرے دو آدمیوں کو لے کر ۹ بجے وہاں پہنچ جاؤ گے۔“

”چوہے لے کر؟“ ابراہیم نے پوچھا۔

”ہاں۔ اور کپڑے تم ان چاروں قیدیوں کے ہی پہن لو۔ بلکہ ممکن ہو تو ان جیسی شکلیں بنانے کی کوشش کرو۔ ورنہ حتی الامکان اپنے چہرے چھپائے رہنا۔“

”بہتر ہے۔“

”جاؤ، افضل اور دوسرے آدمیوں کو خبر کر دو۔“

”صاحب، ڈیسوزا صاحب۔“ چپراسی نے اندر آ کر خبر کی۔ ابراہیم تو سلام کر کے باہر نکل گیا اور خان کے اشارے پر چپراسی نے واپس ہوتے ہی ڈیسوزا کو اندر بھیج دیا۔ ڈیسوزا کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ وہ کافی فکرمند نظر آ رہا تھا۔

”وہ... وہ لڑکی فرار ہو گئی۔“ ڈیسوازنے آہستہ مگر تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

”وہ جو لاک اپ میں تھی؟“ خان نے مسکرا کر پوچھا اور اس کے اس مطمئن اندازِ تکلم پر ڈیسوزا تذبذب میں پڑ گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس اتفاق کے لیے نچلے عملے کی غیر ذمہ داری پر اسے سپرنٹنڈنٹ کی ڈانٹیں سننے کو ملیں گی۔ لیکن خان پر تو جیسے اس خبر کا کوئی اثر ہی نہیں ہو۔

”مختلف راستے ایک ہی مرکز پر پہنچ رہے ہیں اور مُیں صرف وقت کا منتظر ہوں۔“ خان نے ہنس کر جواب دیا۔

”میرے پلے تو کچھ نہیں پڑا، صاحب۔“ ڈیسوزا نے دونوں ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"ابھی تک اس خوف ناک انسان کی شخصیت خود اس کے آدمیوں سے ڈھکی چھپی ہے اور خود اس کے آدمی بھی نہیں جانتے کہ وہ کون ہے۔"

"آپ بھی؟" ڈیسوزا نے سوال کرنا چاہا۔

"میں مکمل ثبوت حاصل کیے بغیر اس سلسلے میں کوئی رائے زنی نہیں کروں گا۔"

"لیکن اس طرح تو کام اور مشکل ہو جائے گا؟"

"میرا ہر اقدام سوچا سمجھا ہے۔ ویسے کیا تم بتا سکتے ہو کہ ان انجیکشن ٹیوبس میں کیا چیز بھری ہوئی ہے؟" خان ڈیسوزا سے ایک غیر متوقع سوال کر بیٹھا۔

"یہ تو اینٹی پلیگ ویکسین ہے سر۔"

اس میں گندھک کا پانی ہے۔"

"گندھک کا؟" ڈیسوزا حیرت سے چونک پڑا۔

"ہاں۔ اور ایسے لاکھوں انجیکشن ٹیوبس اب تک بازار میں جا چکے ہیں۔"

"تو گویا..."

"سر دست زبان بند رکھنا ہی مناسب ہے۔"

"ان کی گفتگو ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ خان نے ریسور اٹھالیا۔

"ہیلو..." ادھر سے کوئی بول رہا تھا۔ "میں شہر کے تمام غنڈوں کا پیر مغاں، اوہ نہیں مپیر مغاں بول رہا ہوں۔" فون پر آواز سنائی دی۔ خان مسکرا دیا۔

"سپرنٹنڈنٹ صاحب کو معلوم ہو کہ میں ایک لڑکی پر دل و جان سے عاشق ہو کر اسے اڑا لایا ہوں۔ اور آج ہی شام کو نکاح خوانی کا ارادہ ہے۔ آپ کو مع اہل وعیال کے شرکت کی دعوت ہے۔"

"کام کی بات کرو۔" خان نے فون پر ڈانٹ سنائی۔

"دنیا میں اس سے بڑا کام اور کون ہو سکتا ہے۔ عشق لڑاؤ، شادی کرواور اولاد۔"

"شٹ اپ۔"

"میں بالکل نہیں ڈرا۔"

"وہ لڑکی کہاں ہے؟"

"میری جیب میں۔"

"شامت آئی ہے کیا؟"

"آپ ٹیلی فون پر میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"اسے ایسی جگہ رکھو کہ کوئی اس تک پہنچ نہ سکے۔"

"بالے صاحب کو خدا نے اتنی عقل دی ہے۔ میں نے علی قلیوں میں سے دع کی خدمات اس نیک کام کے لیے وقف کر دی ہیں۔"

"لوگ تم سے سودا کرنے کی کوشش کریں گے اور تم مشکل سے راضی ہو گے۔"

"کیا بھاؤ بتاؤں؟"

"ایک لاکھ۔"

"میرا کمیشن؟"

"دس جوتے۔"

"آپ واقعی حساب داں ہیں۔ میرے ساتھ چار شریف آدمی اور ہیں۔"

"کون کون ہیں وہ لوگ؟"

"علی قلی نمبر۱ عبدالرفو بھائی عبدالغم، علی قلی نمبر۲ نبی خاں، علی قلی نمبر۳ بھائی گلزار علی، علی قلی نمبر۴ بے جے کے مہا قبلیے۔ فرمایئے، کیسا انتخاب ہے؟"

"ٹھیک ہے، لیکن یہ خیال رہے کہ مقابلہ کافی چالاک لوگوں سے ہے۔"

"بالے صاحب بھی کچھ ایسے ویسے نہیں نہیں۔"

"تم یہ کام ختم کرتے ہی مجھ سے فوراً ملو۔"

"لیکن وہ زیرِ حراست لڑکی؟"

"اس کا انتظام میں نے کردیا ہے، تمہاری جگہ سانے کو بھیج دیا تھا میک اپ میں..."

"ہائے، یہ کیا غضب کیا آپ نے؟ وہ مجھ سے شادی کا وعدہ کرچکی تھی۔ میں تو لٹ گیا۔"

"اگلے جنم میں کرلینا۔ اب بکواس بند کرو۔" خان نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

شام کا دھندلکا چھا چکا تھا اور سڑکوں پر کافی چہل پہل نظر آرہی تھی۔ فٹ پاتھ کے کنارے کنارے چرچ روڈ پر ایک بوڑھا آدمی جس کے جسم پر عام ہندوستانی شہریوں جیسا ڈھیلا ڈھالا لباس تھا، اپنی دھن میں کھویا بھیڑ کو چیرتا چلا جا رہا تھا۔ پھر اس کے قدم ایک سونی سی کراس لین کو عبور کرتے ہوئے اس پرانے قبرستان کے دروازے پر رک گئے جس کا احاطہ چو طرفہ بلند پختہ فصیلوں سے قائم کیا گیا تھا۔ اب تک اس قبرستان میں کئی سو سال پرانی قبروں کے علاوہ ایک نیم شکستہ چھوٹی سی مسجد اور ایک باوڑی موجود تھی اور پرانے لوگوں کی روایت کے مطابق یہ باوڑی کسی زمانے میں اکبری فوج کے ایک سالار نے بنوائی تھی، شاید اس کی فوجوں نے یہاں کچھ دن پڑاؤ کیا تھا اور اسی دوران میں اس کی تعمیر کی گئی۔ وہ بوڑھا آدمی باوڑی سے کچھ دور رک کر ایک پختہ قبر کے نزدیک پتھر پر بیٹھ گیا اور منہ ہی منہ میں آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑانے لگا۔ اس جگہ سے باوڑی صاف دکھائی دیتی تھی، لیکن اگر کوئی باوڑی کی طرف سے ادھر دیکھتا تو شاید اسے نہ دیکھ پاتا۔ وہ بار بار اس باوڑی کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتا جاتا جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔

رات کی تاریکی گہری ہوتی گئی اس اس ویران شہرِ خموشاں کے بیچ کھڑے ہوئے شریفے اور چڑیل وغیرہ کے درخت ہوا کے جھونکوں سے لرزنے والے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سے ماحول کے بھیانک پن کو اور سنسنی خیز بنانے لگے، جیسے ان پرانی بوسیدہ اور بے سہارس سے

ایک ہی حالت میں پڑی ہوئی قبروں سے سینکڑوں سال پرانے مردے نکل کر تالیاں بجا رہے ہوں، لیکن اس بوڑھے آدمی کو اس مقام کے بھیانک پن کی جیسے پرواہ تک نہ تھی۔ اس کی تمام تر توجہ اس پختہ اور زمین دوز باوڑی کی طرف مرکوز تھی۔ شہر کی گھڑیال کے ۹ بجاتے ہی قبرستان کے دروازے کی طرف سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ چار انسانی سائے اندر داخل ہو رہے تھے۔ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں اور وہ ایک ایک پنجرہ ہاتھوں میں لٹکائے ہوئے تھے۔

وہ چاروں باوڑی کے چوڑے اور نیچے کی طرف اترنے والی سیڑھیوں کے دروازے پر پہنچ کر رک گئے۔ پھر ان میں سے ایک نے ٹارچ سے چاروں طرف روشنی ڈالنی شروع کر دی۔

"یہاں تو کوئی نہیں معلوم ہوتا۔" ان میں سے ایک بولا۔

"اندر اترو۔" دوسرے نے کہا۔

اور یکے بعد دیگرے وہ پختہ سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگے۔ یہ سیڑھیاں تقریباً پندرہ فٹ تک نیچے چلی گئی تھی یہاں اندر باؤلہ کے پانی والے وسطی گول حصے کے چاروں طرف تقریباً دس فٹ چوڑے دالان بنے ہوئے تھے۔ اور ہر دالان میں اندر کی طرف دو کمرے تھے۔ یہ جگہ اس قدر سرد تھی کہ ان میں سے ایک کو جھرجھری سی آ گئی۔ باوڑی کا پانی کافی نیچے تھا اور بالکل اسی طرح کے کمرے اور دالان کے دو منزلیں نیچے بھی تھیں، جن میں سب سے نیچے والی منزل پانی میں نصف ڈوبی ہوئی تھی۔ جب وہ سیڑھیوں سے اتر کا ان دالانوں کے چکر کاٹنے لگے جو دائرے کی شکل میں باوڑی کی بیچ کی کھلی سطح کے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے تو ان کے قدموں کی چاپ گونجنے لگی۔ وہ چاروں خاموش تھے۔ انھیں یہاں کوئی متنفس نہ ملا، لیکن جب وہ آخری دالان کے وسط میں پہنچے تو ٹارچ کی روشنی میں درمیان میں رکھے ہوئے لکڑی کے ایک اسٹینڈ نے انھیں چونکا دیا۔ اس اسٹینڈ میں جس کے صرف تین

پائے تھے ایک کاغذ کا پرزہ لٹک رہا تھا اوراسٹینڈ کے اوپر ایک چھوٹا سا لکڑی کا بکس رکھا تھا۔ ان لوگوں نے چوہے دان فرش پر رکھ دیے اور ان میں سے ایک نے اس کاغذ کو اسٹینڈ سے نکال لیا۔ اس پر سرخ پنسل سے لکھا ہوا تھا، 'جو لائے ہو وہ یہاں رکھ دو اور اس بکس میں سے ایمان داری کے ساتھ اپنی قیمت لے کر واپس لوٹ جاؤ۔ بے ایمانی کی تو زندہ واپس نہ جا سکو گے اور کسی کو معلوم نہ ہو کہ تم یہاں آئے تھے۔'

انھوں نے بکس کھول کر دیکھا اس میں بہت سے نوٹ رکھے تھے۔

”یہ تو بہت سے ہیں۔“ ایک نے بکس میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”میرے بیس چوہے ہیں، مجھے سو دے دو۔“ دوسرے نے کہا۔

”ارے، سب رکھ لو یار جیب میں۔ باہر چل کر بانٹ لیں گے۔“

”تم نے کاغذ پر شاید آخری جملہ نہیں پڑھا ہے؟“ پہلے نے اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

”پھر ضرور کوئی یہاں چھپا ہوگا؟“ تیسرا بولا۔

”ہمیں اس سب سے کیا۔ اپنے اپنے پیسے لو اور چلو۔“ پہلے نے اسے ڈانٹا اور پھر اس نے خود ان میں سے ہر ایک کو اس کے چوہے دان میں موجود چوہوں کے حساب سے روپے تقسیم کر دیے اور باقی رقم اسی ڈبے میں رہنے دی۔

”عجیب جگہ ہے یہ سالی۔“ ایک نے لوٹتے ہوئے تبصرہ کیا۔

”اپنی تو توبہ ہے، بھائی۔ اب جو کبھی ادھر کا رخ کروں۔“

وہ محتاط انداز میں دائیں بائیں نظریں دوڑاتے باہر نکل آئے۔ باؤڑی سے باہر نکل کر انھوں نے ایک بار چاروں طرف دیکھا۔ پھر وہ ایک دوسرے کو کچھ اشارے کر کے منتشر ہو گئے۔ وہ باؤڑی کی اونچی منڈیر سے ہٹ کر پرانی قبروں کی آڑ لے چکے تھے۔ اور ماحول پر دوبارہ وہی خوف ناک سناٹا مسلط ہو گیا۔ وہ بوڑھا اب غائب ہو چکا تھا۔

اچانک چار سفید سائے چار مختلف سمتوں سے اتنی خموشی سے ابھرے کہ ان چاروں کو شاید اس کا احساس تک نہیں ہوا۔ اور پھر کسی کی گرفت سے چھوٹنے کی کوشش کرنے والوں کے ہاتھ پیر ہلانے کی خفیف سی آوازوں کے بعد ایک لامتناہی سناٹا چھا گیا۔ مختلف سمتوں سے وہ چاروں سفید سائے ان چاروں کو کندھوں پر اٹھائے باؤڑی کی سیڑھیاں اترنے لگے اور پھر اندھیرے کی پناہ میں ان کے وجود روپوش ہو گئے۔ ان کے جاتے ہی باؤڑی کے نزدیک منڈیر پر جھکے ہوئے ایک گھنے درخت سے ایک اور سایہ اترا اور منڈیر کے سہارے رینگتا ہوا باؤڑی کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ وہ وہی بوڑھا تھا جو بظاہر واپس جا چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹارچ تھی جو ابھی تک اس نے روشن نہیں کی تھی۔ اندازے کے مطابق چند سیڑھیاں اتر کر وہ باؤڑی کے پہلے دالان میں پہنچ گیا۔ یہاں جب کچھ دیر سانس روک کر آہٹ لینے پر بھی اسے زندگی کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو اس نے ٹارچ روشن کر کے چاروں طرف دیکھنا شروع کیا۔ اس ے ہاتھ میں اس وقت ایک پستول بھی دبا ہوا تھا۔ پھر وہ اندرونی سیڑھیاں طے کر کے نچلے دالان میں اتر آیا اور اسے حیران ہونا پڑا، کیوں کہ یہاں بھی کسی ذی روح کا پتا نہ تھا۔ نہ ہی وہ چوہے دان یا اسٹینڈ نظر آیا۔ ہر طرف ایسا موت کا سا گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے یہ مقام برس ہا برس سے ویران پڑا رہا ہو۔ دالانوں کے کونوں پر مکڑیوں کے جالے بھی تنے ہوئے تھے اور چمکاڈروں کی بیٹ کی بو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

اچانک ایک عجیب سی گونج پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ایک حیرت ناک واقعہ ہوا۔ باؤڑی کا پانی آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔ گونج مسلسل سنائی دیتی رہی یہاں تک کہ وہ پانی اس قدر گھٹ گیا کہ تیسرا نچلا دالان پورا اور صاف نظر آنے لگا۔ بوڑھے نے جلدی سے خود کو ایک کھمبے کی آڑ میں چھپا لیا، کیوں کہ تیسرے نچلے دالان کے فرش پر کسی طرف سے روشنی کی شعاعیں پڑتی نظر آ رہی تھیں۔ یہ روشنی بتدریج تیز ہوتی گئی جیسے کوئی آگے بڑھتا آ رہا ہو۔ پھر کسی کے قدموں کی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔

آنے والے ایک سے زیادہ لوگ تھے۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ رہے تھے۔ بوڑھے نے دیکھا دو آدمی دونوں طرف سے ایک تیسرے آدمی کے دونوں بازو تھامے ہوئے تھے اور اس آدمی کی آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔

ان میں سے کسی کو بھی بوڑھے کے وجود کی شبہ تک نہ ہوا۔ بیچ کے دالان میں آ کر وہ رک گئے۔ ان کے ہاتھوں میں ٹارچ تھیں۔

"اب تم جا سکتے ہو۔ لیکن یہ نہ بھولنا کہ وعدہ خلافی کی سزا موت ہوگی۔ ہم لوگ اپنے اصولوں اور اپنے قول پر بڑی سختی سے عمل کرتے ہیں۔" ان میں سے ایک نے بیچ والے کی آنکھوں کی پٹی کھول کر کہا۔ "اور اس قبرستان سے باہر نکلنے تک تم پلٹ کر نہ دیکھو گے ورنہ تمہیں سزا دینے کے لیے ہمارے پستول کی ایک گولی کافی ہوگی۔" اس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

"تمہیں پیسے مل جائیں گے۔"

یہ جواب دے کر وہ آدمی سر ہلاتا ہوا سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔ وہ دونوں کچھ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور جب وہ آدمی باؤڑی سے باہر چلا گیا تو وہ واپس لوٹے۔ ان کے اور بوڑھے آدمی کے درمیان تقریباً ۲۰۔ ۲۵ قدم کا فاصلہ تھا، لیکن بوڑھا آدمی اس وقت حیران رہ گیا جب اس نے نچلی منزل کے دالان میں اترتے ہی باؤڑی کے پانی کو اوپر اٹھتے دیکھا۔ یہاں اسے تاریکی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ وہ دالان کی پچھلی دیواروں اور کھمبوں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ باؤڑی کے پانی کی سطح برابر اٹھتی جا رہی تھی۔ وہ پانی اب اس کے گھٹنوں تک پہنچ گیا۔ پھر کچھ سوچ کر وہ چونک پڑا اور اندازے کے مطابق سیڑھیوں کی طرف قدم اٹھاتا ہوا اوپری منزل پر آ گیا۔ پھر وہ تیزی سے اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف لپکا، مگر جب باؤڑی سے باہر نکلا تو بدستور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس کے قدم تیزی سے قبرستان کے دروازے کی طرف اٹھنے لگے۔ اس وقت تک وہ آدمی باہر سڑک پر آ چکا تھا۔

دروازے کے باہر دائیں طرف کچھ فاصلے پر ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ وہ جھپٹ کر

اب اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ کار کے اندر ڈرائیونگ سیٹ پر ایک آدمی اونگھ رہا تھا اور ایک پچھلی نشست پر نیم دراز تھا۔ اسے دیکھتے ہی پچھلی نشست والے نے جلدی سے کار کا دروازہ کھول دیا اور ڈرائیور چونک کر سنبھل گیا۔

"کیا ہوا، سیٹھ؟" پچھلی نشست والے نے دبے لہجے میں اس سے پوچھا۔

"وہ سالے بہت چالاک ہیں اور خطرناک بھی۔ کل تک پیسے انھیں چکانے ہی پڑیں گے۔" وہ آدمی فکرمند لہجے میں بولا۔

"کہو تو ٹھکانے لگا دوں حرامیوں کو؟" اس آدمی نے، جو لب و لہجے سے کوئی غنڈہ معلوم ہوتا تھا، اپنی آستینیں چڑھا کر پوچھا۔

"ان کا ایک معمولی سا اشارہ تم جیسے نہ جانے کتنے آدمیوں کو ٹھکانے لگا سکتا ہے۔"

"تو پھر آپ پولیس کی مدد کیوں نہیں لے لیتے؟"

"تاکہ خود بھی جہنم جاؤں اور انھیں بھی ساتھ لے جاؤں۔"

"مگر...؟"

"اب چپ رہو، میرا دماغ کافی پریشان ہے۔ ڈرائیور، پارک ایونیو لے چلو۔"

ڈرائیور منہ سے کچھ نہ بولا، اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

اس گاڑی ک روانہ ہوتے ہی وہ بوڑھا قبرستان کے دروازے سے نکلا، اس نے گاڑی کے کچھ دور چلے جانے کے بعد نہ اوپر اٹھا کر حلق سے کچھ عجیب سی آوازیں نکالنی شروع کر دیں۔ یہ کسی قدر الو کی آواز سے ملتی جلتی تھیں۔ تیسری آواز کے ساتھ ہی اچانک دوسرے سرے سے کسی کار کی ہیڈ لائٹس چمکیں اور پھر ایک لمبی سرخ بیڈفورڈ سامنے آ کر رک گئی۔

"آگے جانے والی گاڑی کا پیچھا کرو۔" وہ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر نشست پر گرتے ہوئے بولا۔

"بہتر ہے۔" ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

کچھ دیر بعد دونوں کاریں آگے پیچھے آبادع میں داخل ہو کر مین روڈ پر دوڑن لگیں۔ پھر اگلی گاڑی شہر کی اونچے طبقے کی آبادی والے علاوے چرچ روڈ کی طرف گھوم گئی۔

پارک ایونیو کا علاقہ اس وقت بالکل سونا پڑا تھا۔ عمارتوں کی روشنیاں بھی گل تھیں اور پرشکوہ بازار کی بڑی بڑی اور شاندار قسم کی تمام دکانیں بھی بند ہو چکی تھیں۔ اگلی کار ایک پتلی سی گلی میں گھوم کر رک گئی۔ گلی کے موڑ پر ایک تین در کے بڑے سے بند اسٹور پر ایک تقریباً ۴۰ فٹ لمبا بورڈ لگا تھا جس پر لکھا تھا، 'مے اینڈ کمپنی ڈرگسٹ اینڈ فارمیسٹ'۔

کار سے اترنے والے دونوں آدمی اسی اسٹور کی داہنے سمت کے ایک چھوٹے سے بند دروازے پر رک گئے۔ پہلے آدمی نے جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ ڈرائیور نے آگے بڑھادی اور دوسرا آدمی اس دروازے کے باہر پی پہرا دینے لگا۔ اسے دوسری کار کے رکنے کی آواز مطلق نہ سنائی دی، کیوں کہ وہ کچھ دور بڑی سڑک پر ہی ایک کنارے رک گئی تھی۔

اچانک ایک دردناک چیخ نے اس علاقے کی خاموش اور پرسکون فضا کو لرزا دیا۔ آواز اسٹور کی طرف سے ہی آئی تھی۔ دوسری کار سے اترنے والا بوڑھا آدمی اپنے ڈرائیور کو گاڑی پیچھے لانے کی ہدایت کرتا ہوا تیزی سے دوڑ پڑا۔ اسٹور کے پچھلے دروازے پر کھڑا ہوا آدمی بھی ایک جست مار کر دروازے کے اندر گھس گیا۔ اندر ایک چھوٹے کمرے کو عبور کرنے کے بعد دواؤں کے گودام کے بیچ و بیچ کوئی اوندھا پڑا تھا۔ گودام کی چھت میں لٹکی ہوئی بجلی کی روشنی کا اجالا یہ بتا رہا تھا کہ اس اسٹور کے سامان کو ابھی کچھ دیر پہلے کوئی الٹ پلٹ کرتا رہا ہے، جیسے کوئی چیز تلاش کرنے آیا ہو۔ بوڑھا آدمی اب دوڑ کر زمین پر پڑے آدمی کے نزدیک پہنچا تو وہ اس کی شکل دیکھ کر چونک پڑا۔ وہ مر چکا تھا۔ مے اینڈ کمپنی کا ادھیڑ عمر منیجر سالومن، جس کا پیچھا کرتا ہوا وہ شاہی باؤڑی سے یہاں تک آیا تھا، چاقو کے ایک مہلک وار سے ہلاک کیا گیا تھا۔ یہ وار کافی گہرا اور دل کے قریب پڑا تھا۔ پاس میں ایک خون آلود چاقو بھی پڑا تھا جو اپنے دستے

کو چھوڑ کر لمبائی میں کم از کم ۱۶ انچ رہا ہوگا۔ اسے اسی چاقو سے ہلاک کیا گیا تھا۔ لیکن تمام گودام ڈھونڈ ڈالنے پر بھی کسی کا پتا نہ چلا۔

’’قاتل کے فرار ہونے کے تمام راستے بھی مسدود تھے اور صرف ایک امکانی راستہ وہ چھت کا روشن دان تھا جو درمیان میں ایک چوکور گنبد کی طرح اوپر کو اٹھا ہوا تھا اور جس میں چاروں طرف شیشے لگے تھے اور ایک طرف کا کھلا شیشہ اس امکان کی تصدیق کر رہا تھا کہ اس طرح یقیناً قاتل کو فرار کا کافی موقع اور وقت مل چکا تھا۔

اسٹور میں اندر ٹیلی فون موجود تھا۔ بوڑھے آدمی نے ڈائل گھما کر نمبر ملائے اور وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

’’ہیلو۔‘‘ دوسری طرف سے انسپکٹر شاہ کی آواز سنائی دی۔

’’پارک ایونیو پر مے اینڈ کمپنی کے اسٹور میں کمپنی کے منیجر سالومن کی لاش پڑی ہوئی ہے، آ کر قبضہ کر لیجیے۔‘ بوڑھے آدمی نے فون پر ہدایت کی۔

’’لاش..؟ سالومن کی...؟‘‘ انسپکٹر شاہ کے حیرت زدہ الفاظ سنائی دیے۔ ’’اور آپ کون ہیں؟‘‘

’’میں خان بول رہا ہوں۔ اور ہاں، اپنے ساتھ کچھ آدمی بھی لیتے آیے۔ میں اسی وقت اس مقام کی پوری طرح تلاشی لینا چاہتا ہوں۔‘‘

’’ویری ویل، سر۔‘‘ شاہ نے نام سنتے ہی گھبرا کر فون رکھ دیا۔

بوڑھے کے میک اپ میں سپرنٹنڈنٹ خان جیب میں اپنے ریوالور پر ہاتھ ڈالے کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ وہ اس وقت کافی بے چین نظر آ رہا تھا۔ کبھی اس کی نظر سالومن کی خاک و خون میں غلطاں لاش پر پڑتی اور کبھی وہ کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھنے لگتا۔ انسپکٹر شاہ کو آدمی لے کر آنے میں ۲۰ منٹ لگے۔ تب تک خان اسٹور کا کافی حصہ دیکھ چکا تھا۔ شاہ سپرنٹنڈنٹ خان کو سلام کر کے لاش کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تم لوگ اسٹورز کا کونا کونا چھان مارو، خاص طور پر میں انجیکشنوں کا اسٹاک دیکھنا چاہتا ہوں۔" خان نے آدمیوں کو ہدایت کی اور وہ فوراً ہی منتشر ہو کر اس کام میں مشغول ہو گئے۔

خان اس اسٹور روم سے نکل کر ہال میں پہنچ گیا جہاں دواؤں کی بڑی بڑی الماریاں اور شیلف رکھے ہوئے تھے۔ پھر اس کی توجہ اس پارٹیشن کی طرف ہو گئی جس کے دروازے پر منیجر کی تختی لگی ہوئی تھی۔ وہ پٹ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ یہاں صرف ایک میز اور تین چار کرسیاں، ایک ریک، ایک اور فولادی الماری رکھی ہوئی تھی جو مقفل تھی۔ میز کی درازیں اس نے جھٹکے سے توڑ ڈالیں اور ان کے کاغذات دیکھنے لگا۔ ان میں دوسری فرموں کے نام لکھے کچھ خطوط کی مسترد کاپیاں تھیں، کچھ کاربنوں کے ٹکڑے اور کچھ چاک پڑے تھے۔ الماری کی کنجی شاید مقتول کی جیب میں رہی ہو، لیکن پستول کی نال کو ہول پر لگا کر فائر کرنے سے پٹ کھل گیا۔ اندر الماری میں پتلے پتلے شیلف لگے تھے جن پر قیمتی دواؤں کے چھوٹے چھوٹے ڈبے قرینے سے رکھے تھے لیکن شیلف کے پیچھے الماری میں نظر آنے والے خلا نے اسے کچھ چونکا دیا، اور اس نے جب ایک شیلف کو اپنی طرف کھینچ کر دیکھا تو تمام شیلف ایک ساتھ ایک ہی سلسلے میں منسلک کسی دروازے کے ایک پٹ کی طرح باہر کی طرف نکل آئے۔ اندر پشت کی طرف صرف فولادی ایک چادر نظر آ رہی تھی۔ خان سوچ میں پڑ گیا۔ پھر یہ خلا کیوں؟ شیلف فولودی پشت سے پیوست کیوں نہیں ہیں۔ پھر اوپر نیچے ٹٹولتے ہوئے اس کی نظر الماری کی چھت میں ایک کونے میں لگے ہوئے چھوٹے سے بٹن پر پڑ گئی۔ اسے پوری طاقت سے دبایا گیا جس کے ساتھ کہیں دور بجتی ہوئی بہت مدھم سی گھنٹی کی آواز سنائی دینے لگی اور دوسرے لمحے آپ سے آپ ایک الماری کی پشتی فولادی چادر اندر کی طرف دھنسنے لگی اور ذرا سی دیر میں دائیں ہاتھ پر ایک قدِ آدمی خلا پیدا ہو گیا جس کے دوسری طرف گہری تاریکی مسلط تھی۔ وہ ہاتھ میں ٹارچ لیے اندر داخل ہو گیا۔ یہاں چند قدم چل کر تاریک راستہ بائیں سمت گھوم گیا تھا اور سیڑھیاں شروع

ہو گئی تھیں۔ ان سیڑھیوں سے اتر کر وہ ایک تقریباً ۱۰۰ فٹ لمبے اور ۲۰ فٹ چوڑے ہال میں پہنچ گیا۔ اس کی چھت کافی بلند تھی اور دیواروں میں برقی قمقمے لگے ہوئے تھے۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ اس وقت یہاں کسی اور ذی روح کا وجود نہیں ہے۔ اس نے ایک دیوار گیر روشنی کا سوئچ آن کر دیا۔ اس نے روشنی میں دیکھا، ہال میں بھی چند فولادی الماریاں تھیں جن میں سے بعض کھلی تھیں اور بعض بند، انھیں کھول کر دیکھنے پر وہ عام استعمالی ساخت کی نکلیں۔ ایک میں شیشیوں میں مختلف قسم کے زہر بھرے ہوئے تھے۔ یہ الماری احتیاط سے مقفل کی گئی تھی اور اسی شبے پر خان نے اسے توڑا۔ یہ زہر بہر حال کمپنی کے لائسنس کے مطابق تھے اور پھر سردست خان کو ان سے سروکار بھی نہ تھا۔ ہال کے آخری حصے میں چند آہنی چوکور صندوق رکھے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ہوا کی گزر کے راستے نظر نہ آنے کے باوجود اس ہال میں کافی خنکی تھی، شاید ایر کنڈیشنڈ رکھا گیا تھا۔

اب تک کی ان کوششوں کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تھا۔ شاید خان کو وہ چیز اب تک کہیں نظر نہ آئی تھی جس کا وہ متلاشی تھا۔ اچانک کسی کھٹکے کی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔ اس کا ہاتھ فوراً روشنی کے سوئچ پر جا پہنچا۔ ہال میں پہلے جیسی گہری تاریکی چھا گئی اور خان نے خود کو ایک الماری کی آڑ میں چھپا لیا۔ اور یہ سب کچھ دو سیکنڈ سے بھی کم کے وقفے میں ہوا۔ ٹھیک اسی وقت 'کریک کریک' کی آوازوں کے ساتھ ایک باریک سی روشنی کی دراڑ ہال کی پچھلی دیوار میں پیدا ہو گئی جو بتدریج پھیلتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ تقریباً پانچ فٹ اونچا اور دو فٹ چوڑا دروازہ سا نظر آنے لگا۔ خان نے جیب سے پھر پستول نکال کیا، جس کی نال کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ اسے اس دروازے سے ایک انسانی سایہ اندر داخل ہوتا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ وہ اکیلا نہ تھا، اس کے پیچھے ایک سایہ اور تھا، وہ دونوں اندر آ گئے۔

"پولیس کے باپ بھی یہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔" ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔

"لیکن گشتی پولیس سخت نگرانی کر رہی ہے۔ ہمیں سڑکوں پر سناٹا ہونے سے پہلے ہی اسٹاک سے نکل کر جانا چاہیے۔"

گفتگو کرتے ہوئے وہ ان آہنی چوکور صندوقوں کی طرف متوجہ ہو گئے جن کے بارے میں خان ابھی تک کوئی رائے قائم نہ کر سکا تھا۔ ان میں سے ایک نے ان صندوقوں کے ڈھکنے اٹھا اٹھا کر دیکھنا شروع کیا۔

"کیا اتنے سے صندوق میں پانچ ہزار انجیکشن ہوں گے؟" ایک نے دوسرے سے سوال کیا۔

"فضول کی باتیں نہ کرو، وقت کم ہے، کہیں پولیس کو سن گن لگ گئی تو لاشیں ہی جائیں گی یہاں سے۔" یہ کہہ کر ان دونوں نے ایک صندوق اٹھایا۔ اسے اس چور دروازے کے منہ پر لا کر رکھ دیا۔ باہر سے دو سیاہ ہاتھ نظر آئے جنہوں نے صندوق کو کھینچ لیا۔ پھر اسی طرح دوسرا صندوق بھی دروازے کے باہر پہنچ گیا۔

انھوں نے ابھی تیسرے صندوق کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ اچانک ہال میں روشنی ہو گئی اور وہ دونوں حیرت سے تقریباً اچھل پڑے۔ موت پستول بدست ان کے سامنے تھی۔

"ہم... ہم مال چرا رہے تھے۔" ان میں سے ایک نے چہرے پر معصومیت پیدا کر کے اٹکتی آواز میں کہا۔

"خوب... نقلی مال چرانا تم جیسے چوروں کا ہی کام ہے۔" خان انھیں نشانے پر رکھتے ہوئے بولا۔ جس پر ان کے چہرے ایک لمحے کے لیے فق سے ہو گئے، لیکن وہ فوراً ہی سنبھل گئے۔ اتنے میں خان کو دروازے کی طرف وہی دو سیاہ ہاتھ نظر آئے۔

"باہر کتنے آدمی ہیں؟" خان نے ایک سے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

"ہوں گے کوئی دس بیس۔" دوسرا زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"میرے پستول کی ایک گولی تمہاری سات پشتوں تک کے مزاج درست کر سکتی

ہے۔"

"ہم معمولی چور ہیں۔ چھوڑ دیجیے تو آپ کی مہربانی ورنہ جیل ہوئی تو جیل سہی۔"

"تم یوں نہ مانو گے۔" یہ کہہ کر خان نے آگے بڑھتے ہوئے ان میں سے ایک کے جبڑے پر اس زور سے ایک گھونسا رسید کیا کہ وہ تیورا کر گر پڑا۔ لیکن اسی وقت ایک خفیف سی چرچراہٹ کے ساتھ وہ دروازہ بند ہونے لگا۔ خان نے یہ دیکھتے ہی جیب سے وسل نکال کر بجادی۔ سیٹی کی تیز آواز سناٹے کا سینہ چیرتی ہوئی دور تک پھیلتی چلی گئی، جس کے ساتھ ہی باہر کہیں کچھ دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر لگاتار دو فیر ہوئے اور کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز کے ساتھ پھر بھگدڑ سنائی دینے لگی اور دروازہ اتنی دیر میں بند ہو چکا تھا۔

دوسرا آدمی خان کو پہلے کی طرف متوجہ پا کر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ پھر اس کا ایک ہاتھ اس کی اندرونی جیب میں چلا گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ باہر نکلے خان کے پستول سے ایک شعلہ نکلا اور اس کا ہاتھ وہیں جھول گیا۔ دوسرا بے بسی کے عالم میں دیوار سے چپک کر رہ گیا۔

"چلو، یہ چور دروازہ کھولو۔" خان نے دوسرے آدمی کو ڈانٹ کر حکم دیا۔

"وہ... وہ باہر سے کھلتا ہے۔" اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

"اوہ، تو ابھی تمہارا دماغ ٹھکانے نہیں آیا؟"

یہ کہتے ہوئے غضب ناک موڈ میں خان کا الٹے ہاتھ کا تھپڑ اس زور سے اس کے منہ پر پڑا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

"چلو، کھولو سیدھے سے۔" خان نے اسے زبردستی بند دروازے کی طرف دھکیلا، جو اب بند ہو کر سفید دیوار کا ہی ایک حصہ نظر آ رہا تھا۔ ڈرتے ڈرتے اس آدمی نے قریب پہنچ کر دائیں طرف دیوار کے سہارے لگے ہوئے ایک پیگ سیٹ کی درمیان کی کھونٹی کو گھمانا شروع کیا جس کے ساتھ ہی دیوار میں وہی خلا پیدا ہوتا گیا۔ اور خان ان دونوں کو پستول کے اشارے

پر دھکیلتا باہر نکال لایا۔ اس نے محسوس کیا کہ اب وہ اسی عمارت کے پچھلے حصے کی ایک نیم تاریک سی گلی میں کھڑا ہے اور دیوار کے اس حصے کو ایک جھاڑی نے عشق پیچاں کی بیل چڑھی ہوئی تھی، عام نظروں سے چھپا رکھا تھا۔ دو پولیس کانسٹیبل گلی کے موڑ پر کھڑے ہوئے تھے۔ وہ خان اور اس کے ساتھ ان دونوں آدمیوں کو نکلتے دیکھ کر جلدی سے ان کی طرف دوڑے۔ خان کو دیکھتے ہی سپاہی اٹینشن ہو گئے۔

"کیا ہوا ان لوگوں کا؟"

"صاحب، وسل سن کر ہم لوگ اور انسپکٹر چوپڑہ صاحب اس طرف دوڑے تھے۔ چوپڑہ صاحب نے فائرنگ بھی کی، لیکن وہ لوگ گاڑی لے کر نکل گئے۔ جیپ میں چوپڑہ صاحب تین آدمیوں کو ساتھ لے کر ان کے پیچھے گئے ہیں۔"

"انھیں ہتھکڑی لگا دو۔" خان نے ان دونوں آدمیوں کی طرف اشارہ کر کے کانسٹیبلوں کہا۔

"بہت اچھا، حضور۔" یہ کہہ کر وہ دونوں پھرتی سے بڑھے اور اپنی کمر سے ہتھکڑی کھول کر ان دونوں کے ہاتھوں میں ڈال دیں۔ خان نے پانی پستول کا نشانہ اس دوران ان کے سینوں کی طرف ہی رکھا تھا، اس لیے وہ دم بھی نہ مار سکے۔

"ساتھ آؤ۔" خان نے موڑ سے اسٹور کے سامنے کی طرف والے حصے کی طرف گھومتے ہوئے کہا۔ کانسٹیبل قیدیوں کو لے کر پیچھے چلنے لگے۔

قیدیوں کو انسپکٹر شاہ کے سپرد کر کے اور سالوس کے قتل کی واردات کی رپورٹ درج کرنے کی ہدایت کر کے خان نے وہ چوکور آہنی صندوق بھی انسپکٹر شاہ کے سپرد کر دیے تا کہ صبح پولیس ہیڈ کوارٹرز پہنچا دیا جائے۔ اس نے ان میں سے صرف ایک پیکٹ اپنی جیب میں ڈال لیا۔

"کیا کوئی قیمتی چیز ہے ان صندوقوں میں؟" شاہ نے مؤدب لہجے میں اس سے

پوچھا۔

"او... قیمتی... اوہہ۔ ان میں گندھک کے پانی سے بھرے ہوئے طاعون کے انجیکشن ہیں۔"

"طاعون کے؟ اور گندھک کے پانی کے؟"

"فراڈ۔ لیکن لاکھوں کا۔" خان نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں ان ہی کی تلاش میں تو اتنے دنوں سے سر مار رہا تھا۔"

شاید شاہ کی سمجھ میں خان کی سیدھی بات نہ آسکی اس لیے وہ سر ہلا کر خاموش ہو گیا۔

"اگر انسپکٹر چوپڑہ ان مفرور آدمیوں کو گرفتار کر کے لے آئیں تو انھیں مع صندوقوں سینٹرل پولیس اسٹیشن پہنچا دیجیے۔" یہ کہتا ہوا وہ جواب کا انتظار کیے بغیر سر کے اشارے سے ان کے سلام کا جواب دیتا باہر نکل گیا۔ اس کی کار اب تک دور سڑک کے اندھیرے میں کھڑی تھی اور ڈرائیور اب تک وہیں موجود تھا۔ اس نے خان کو دیکھتے ہی کار کا دروازہ کھولا۔

"تم اب جا سکتے ہو۔ میں اکیلا ہی جاؤں گا۔" خان نے قریب پہنچ کر کہا۔

ڈرائیور چپ چاپ گاڑی سے اتر آیا۔

☆☆☆☆☆☆

علی قلی نمبر ۱۔۲۔۳۔۴

آدھی رات کے سناٹے میں پانگوڑی کے گندی آبادی والے علاقے کے باہر ایک سرخ رنگ کی ڈاج کار آ کر رکی اور اس میں سے چار آدمی جو سیاہ لمبے اوور کوٹ پہنے ہوئے تھے فیلٹ کیپس سے اپنے چہرے چھپائے نیچے اترے۔

وہ چاروں نچلی چھتوں والے تاریک اور گندے مکانوں کے درمیان سے گزرتے ایک چبوترے کے قریب رک گئے۔ یہاں ایک افیونچی قسم کا آدمی لیٹا ہوا تھا، جو جھنجوڑنے پر اٹھ بیٹھا۔

"لائے ہو؟" وہ منمنی سی آواز میں بولا۔ "آج چڑھی نہیں کچھ۔"

"اے، بدرو لال کدھر رہتا ہے؟" ان میں سے ایک نے اس سے سوال کیا۔

"لال نہیں، وہ تو قالی قالی ہوتی ہے، بھیا۔ آ...ا ی...تم بھی کھاتے ہو؟"

"ہوش میں آ کر بات کرو۔" یہ کہتے ہوئے اس کے ہاتھ میں ایک دو روپے کا نوٹ تھما دیا۔

خودا تمھیں جنت نجیب کرے۔ آج کی تو ہو گئی۔" یہ کہہ کر وہ پھر لیٹنے لگا۔ لیکن دوسرے لمحے ایک تھپڑ نے اس کا نشہ کرکرا کر دیا۔

"بدرو لال کہاں رہتا ہے؟" اس سے پھر وہی سوال کیا گیا۔

"بدو... ہائے بدو... ہم بدو... تم بدو..."

"ایک اور مار، سالے کو۔ یہ نشا بھی ہرن ہو جائے گا۔" دوسرے نے کہا۔

"اُدھر... وہ درا و کے مکان میں۔" اس آدمی نے ایک طرف اشارہ کیا اور پھر لیٹ گیا۔

"چلو۔" اس آدمی نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور وہ سب آگے بڑھ گئے۔

"ہونہہ... سالے تیل لینے آئے تھے۔ مرغی کے انڈے... پھنچ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کروٹ لی اور نیلگوں آسمانی خلاؤں میں گھورنے لگا۔

دروازے پر دستک ہوتے ہی نیم پختہ اور پرانی ساخت کے دارو والے مکان میں بیٹھے ہوئے دو آدمی چونک پڑے۔ ان کے سامنے شراب کی ایک بوتل اور دو گلاس رکھے تھے۔

"علی قلی خاں، ذرا جھانکو تو کون ہے؟" ایک نے دوسرے سے کہا۔

"ہوگا کوئی چرخی کی اولاد۔" دوسرا لاپرواہی سے بولا۔

دستک پھر سنائی دی اور انھیں دروازہ کھولنا ہی پڑا۔ آنے والا ایک اکیلا آدمی تھا، جو گرم چسٹر پہنے کوئی بھاری بھرکم آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کا اوپری چہرہ فیلٹ ہیٹ سے چھپا ہوا تھا۔

"لڑکی کہاں ہے؟" اس نے اندر داخل ہوتے ہی پوچھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا جس کا رخ ان دونوں کی طرف ہی تھا۔

"لڑکی... کون لڑکی؟" وہ حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"بکو مت، ورنہ یہیں ڈھیر کر دوں گا۔"

"روپیہ لائے ہو؟"

"لڑکی کہاں ہے؟"

"ہماری جیب میں، کیوں، بھائی علی قلی۔" یہ کہہ کر وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر زور سے ہنس پڑے۔

"چپ رہو۔" وہ آدمی گرجا۔ "ورنہ میں تمہاری ہڈیوں کا سرمہ کرا دوں گا۔"

"سرمہ تو آپ سرمہ بیچتے ہائیں؟"

"اوہ، تم یوں نہ مانو گے۔" یہ کہہ کر اس نے زور سے فرش پر پیر پٹکا جس کے ساتھ

ہی باقی تین آدمی بھی دروازہ کھول کر اندر آ گئے۔

"یہ لو، تین بھائی اور بھی ہائیں۔" یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگے۔

"باندھ دو سالوں کو۔ یہ یوں نہ بتائیں گے۔"

"یہ غنڈے مار کھانے کے عادی ہوتے ہیں اس سے کچھ نہ ہوگا۔" ان کے ایک ساتھی نے رائے دی۔

"تو کیا ان سے ڈر کر ہم انھیں منہ مانگی رقم دے دیں؟"

"یہ آپ جانیں اور باس۔"

"اے بھائی۔" ان دو میں سے ایک نوواردوں سے مخاطب ہوا۔ "تم کو لڑکی لینے کا ہائے تو سیدھے سیدھے لاکھ روپیہ لاؤ نہیں تو اپنا کالا منہ کر جاؤ۔ وہ اپنے استاد کی گھر والی بنے گی۔"

"اچھا ہم روپیہ دیتے ہیں، پہلے لڑکی بتاؤ کہاں ہے؟" نووارد نے نرم پڑ کر کہا۔

"ارے واہ، ہم ہی الو کے پٹھے ملے ہیں کیا؟ لڑکی بتا دیں اور تم لے اڑو۔ یہ اپنا پرانا دھندہ ہے، بھائی۔ اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ... لے۔"

چبوترے پر لیٹا ہوا افیونچی دیر سے سڑک کی طرف گھور رہا تھا۔ جیسے اسے کسی کا انتظار ہو، پھر کسی کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی نے اس کی آنکھیں چکا دیں۔ اس نے گردن اونچی کر کے دیکھا۔ سڑک پر ایک دوسری کار آ کر رکی تھی۔ اس کار سے صرف ایک آدمی اترا، جو سیاہ گرم سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اسی طرف آنے لگا۔ لیکن جب وہ اس چبوترے کے نزدیک سے گزرنے لگا تو افیون کی پینک میں پڑے ہوئے آدمی نے اسے ٹوک دیا۔

"اے بھائی، ایک تولہ بھرا اپنے لیے بھی لیتے آنا۔" وہ منمنایا۔ جانے والا سنتے ہی رک گیا اور غور سے اسے دیکھنے لگا۔

"دیکھتے کیا ہو، مجھے غصہ آ گیا تو ناک کان اکھاڑ کر چیل کوؤں کو کھلا دوں گا۔"

"تو تم ہو، سور۔"

"آپ ڈاکٹر جھالا سے ضرور ملیے۔ وہ آنکھوں کے اسپشلسٹ ہیں۔" وہ آدمی یہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم نے تو اس پل پر ملنے کو کہا تھا؟"

"وہاں ان کم بختوں نے اپنی گاڑی کھڑی کر دی ہے۔"

"تو وہ گاڑی ان کی ہی ہے؟"

"جی ہاں۔ شان دار لوگ معلوم ہوتے ہیں۔"

"کیوں نہ ہوں گے، لاکھوں کا بزنس کیا ہے۔"

"لاکھوں کا۔ ارے تو مجھے بھی وہ راستہ بتا دیجیے نا۔ دیکھیے مجھے ایک درجن شادیاں کرنی ہیں، چار درجن مرغے، آئی ایم ساری بچے پالنے ہیں اور پھر ان کے اسکول..."

"شٹ اپ، یہ بکواس کا وقت ہے؟"

"سر دست وہ لوگ وہاں بھائی حرام مونچھا اور نبی خاں کی مرکت کر رہے ہیں، ذرا ان کی ہڈیاں نرم ہو جائیں پھر چلیں گے۔"

"الو، یہ کھیل تماشا کیا لگا رکھا ہے تم نے؟"

"وہی آپ کا حکم۔ ایک چیلنج ملا تھا مجھے کہ لڑکی ہمارے حوالے کر دو ورنہ جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ میں نے کہلا دیا کہ ایک لاکھ کا انتظام کر دو پھر ہاتھ تو کیا پاؤں بھی دھو لیں گے۔"

"پھر؟"

"آج یہ چاروں شریف آدمی وہی حساب چکانے آئے ہیں۔"

"تو تم یہاں کیا جھک مار رہے تھے؟"

"ایک تو آپ کا انتظار، دوسرے مصلحت۔"

“لڑکی کہاں ہے؟”

“وہ اسی مقام پر موجود ہے اور محفوظ ہے۔”

“انھیں لڑکی لے جانے دو۔”

“ارے یعنی کہ میرا ایک لاکھ...؟”

“تمہارے بزرگوار کما کر رکھ گئے ہیں کیا؟”

“آپ میری تقدیر پر جھاڑو پھیر رہے ہیں کیا؟”

“جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ اب ہم انھیں زیادہ وقت نہیں دے سکتے۔ ڈوری بھی نیشنل اسپتال میں ختم کر دی گئی ہے اور نقلی انجیکشنوں کے وسیع پیمانے کے بزنس کا بھی بھانڈا پھوٹ گیا ہے۔”

“کچا بنایا ہوگا کمہار نے۔ لیکن آپ تو کہتے تھے کہ وہ شخصیت نامعلوم ہے؟”

“ہاں۔ کمال یہی ہے کہ وہ خود کو ہر طرح سے محفوظ رکھ کر یہ تمام کھیل رچائے ہوئے ہے۔ خود اس کے آدمی بھی اس سے واقف نہیں ہیں۔”

“اور آپ بھی ناواقف ہوں گے؟”

“میں بغیر ٹھوس ثبوت فراہم کیے اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔”

“تو پھر ان چار جانوروں کا کیا کیا جائے؟”

“میرا خیال ہے کہ وہ رقم نہیں لائے ہوں گے صرف دھوکہ دے کر لڑکی کو حاصل کرنے آئے ہیں۔”

“یہ کیسے جان لیا آپ نے؟ آپ عالم الغیب تو نہیں ہیں؟”

“کیا؟”

“عالم الغیب صرف خدا کی ذات ہے اس لیے میں نے تختہ الٹ کر عرض کیا ہے۔”

“چلو، بکواس بند کرو، جلدی چلو۔”

”کچھ توڑ پھوڑ کی آواز تو آنے دیجیے۔ بھائی حرام مونچھ کا سر بہت مضبوط ہے۔“

”اب میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔ جاؤ جلدی۔“

”یعنی کہ میں اکیلا۔“

”ہاں۔ تم لوگ بظاہر مجبور ہو جانا اور انھیں موقع دینا کہ وہ لڑکی کو تلاش کر کے حاصل کر لیں۔“

”اس کے بعد؟“

”اس کے بعد پولیس آ پہنچے گی۔ میں نے اس کا انتظام کر دیا ہے۔ وہ تمہارے آدمیوں کو گرفتار کر لے گی۔“

”ارے واہ، یعنی ہمارا ہی جوتا اور ہمارا ہی سر۔“

”اور تم فرار ہو کر نالے کے اس پار پہنچ جانا جہاں میری کار موجود ہوگی۔“

”ان الٹی سیدھی باتوں کا حاصل؟“

”صرف اسی طرح انھیں تعاقب سے غافل کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ وہ بہت چالاک ہیں۔“

”بالے صاحب کسی خان سے نہیں ڈرتے۔ میں ان چاروں کی چٹنی بنا کر لونڈیا کو بحق خود محفوظ کر لوں گا۔

”تم کھسکتے ہو یا نہیں؟“ خان اسے گھورنے لگا۔

”اچھا ایک بات بتا دیجیے کہ آپ ان کا تعاقب پاؤں پاؤں کریں گے یا موٹر پر چڑھ کر؟“

”کار کے ذریعے تعاقب کو وہ دو تین بار ناکام بنا چکے ہیں، اس لیے میں نے فیر گراؤنڈ پر ہیلی کاپٹر کا انتظام کرا لیا ہے۔“

”آپ سچ مچ بڑے عقل مند ہیں۔“ بالے نے کسی بڑے بوڑھے کی طرح گردن

ہلائی، لیکن اس سے پہلے کہ خان کا گھونسا بلند ہو، وہ بھاگ اٹھا۔

دارو کے مکان کے بند دروازے پر ایک زور کی ٹھوکر ماری اور وہ اندر کی طرف کھل گیا۔ سینہ پھلائے اندر داخل ہونے والا اس فیونجی کے میک اپ میں سارجنٹ بالے تھا۔ رؤف اور نبی اسے دیکھتے ہی تقریباً چیخ دیے۔

”لو، وہ آ گئے استاد۔“

”ہاں آ گئے تو کیا، کسی کے باپ کا اجارہ ہے کچھ۔“ بالے اکڑ دکھاتا ہوا قریب آ گیا۔

”یار، آج دھندا خوب ہوا۔ میں نے ایک سیٹھ کا ٹینٹوا جو دبایا تو سالے نے دو ہزار اگل دیے۔“ وہ لاپرواہی کے انداز میں یہ کہتا ہوا میز کے نزدیک ایک لگی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اب تک ان اوورکوٹ والوں کی طرف دیکھا تھا ہی نہیں۔ علی قلی نمبر ۱ اور ۲ بار بار اس سے اشارہ کر رہے تھے، لیکن وہ نشے کی سی کیفیت بنائے اپنی بکے جا رہا تھا۔

”وہ ہماری ہونے والی گھر والی تو خیریت سے ہے نا؟ اب میں اس سے شادی بنائیں گا۔“

”استاد تم نشے میں ہو۔“ ععلی قلی نے اس کا بازو جھنجوڑ کر کہا۔

وہ چاروں اب تک ہاتھوں میں پستول لیے خاموش اندھیرے کی طرف کھڑے تھے۔

”کون سور نشے میں ہائے۔ تم نے پی اور نشہ پرے کو۔ یہ بوتل پھر کیا اس کی ماں کا نٹیچون نیوی کٹ ہائے؟“ بالے عجیب قسم کی گالیوں پر اتر آیا۔

”استاد، ادھر۔“ بالآخر علی قلی نمبر ۲ کو ان پراسرار نوواردوں کی طرف اشارہ کرنا پڑا۔ بالے چار سیاہ سائے کمرے کے نیم تاریک گوشے میں کھڑے دیکھ کر ایک دم اچھل پڑا۔

”بھ... بھ... بھوت۔“

”بھوت نہیں، استاد۔ یہ اس لڑکی کا سودا کرنے آئے ہیں۔“

”اوہ تو سوداگر بھائی لوغ۔ کیا مانگتے ہیں؟“

”وہ لڑکی۔“ ان میں سے ایک کی گرجتی آواز سنائی دی۔

”کڑکی؟ ہاں کڑکی تو ہے، یار۔ پھر ولاؤنا مال وال تو چھ۔“

”وہ لڑکی کہاں ہے؟“ ان میں سے ایک نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

”ہائے، کہاں ہے؟ ہائے، آواز دے کہاں ہے۔“ بالے نے نشے میں ایک جھونک لیتے ہوئے لڑکھڑاتی زبان میں گانا شروع کر دیا۔

”اس کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایلینا یہیں کہیں ہے۔“ نوواردوں میں سے ایک نے دوسرے کے کان میں کہا۔

”تو میں ان سے سمجھتا ہوں، تم لوگ اس جگہ کا کونہ کونہ چھان مارو۔“ اس نے کہا اور پھر اپنے پستول کا رخ ان لوگوں کی طرف کر کے بولا۔

”اگر کسی نے بھی حرکت کی تو گولی سینے سے پار ہو گی۔“

”یا علی قلی، میرا چاقو دے تو۔“

”استاد، پستول ہے ان کے پاس۔“

”تو میرا پستول بھی نکال لاؤ۔“

”خبردار جو کوئی اپنی جگہ سے ہلا۔“ سیاہ لبادے والے نے پھر ڈانٹا۔

”یہ لو، سالے باپ کا گھر سمجھے ہیں۔“ بالے ن اپنی جگہ بغیر حرکت کیے کھڑے کھڑے کہا۔ لیکن اس آدمی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے تین ساتھی اس مکان مے مختلف حصوں کی تلاشی لے رہے تھے۔ وہ جب واپس لوٹے تو خالی ہاتھ تھے۔

”نہیں ملی۔“ ان میں سے ایک نے بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ کہا۔

”لڑکی کہاں ہے؟“ پستول کا نشانہ باندھے ہوئے آدمی ن کرخت لہجے میں

پوچھا۔

"نہیں بتائیں گا، پہلے روپیہ لاؤ۔" بالے نے بھی اکڑ کر جواب دیا۔

"ایک بار انکار کیا تو کھوپڑی گولی کھاتی پھرے گی۔"

"یار، کیسی بدبودار باتیں کرتے ہو تم، لاحول ولاقوۃ۔"

"میں صرف ایک سے پانچ تک گنتی گنوں گا، اگر اس درمیان میں تم نے نہیں بتایا تو تینوں کی لاشیں یہیں تڑپتی نظر آئیں گی۔"

"تو تم گنتی پہاڑے جانتے ہو۔ لو بھائی، یاد کرو بچے اور معنی۔" بالے کے اس جملے پر ان میں سے ایک کی ہنسی بے اختیار چھوٹ گئی۔ جس پر پہلا آدمی اسے خوف ناک نظروں سے گھورنے لگا اور وہ سہم کر چپ ہو گیا۔

"پانچ کی گنتی پر پہنچتے ہی فائر کر دو ان پر۔" اس نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کی۔

"ایک۔" وہ کسی کے جواب کا انتظار کیے بغیر شروع ہو گیا۔

"دو۔"

"تین۔"

"اونہہ۔ ڈھائی اور ڈیڑھ گیا بھائی۔" بالے نے بیچ میں ٹوک دیا۔

"چار۔" وہ ان سنی کر کے بولتا گیا۔

"استاد تم نہیں بتاتے تو میں بتا دوں گا۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔" علی قلی ۱ نے بالے کی آنکھ کا اشارہ پاتے ہی بول پڑا۔

"ابے میں جیتے جی بیوہ ہو جائیں گا۔" بالے نے احتجاج کیا۔

"پا..."

"ٹھہرو..." علی قلی ۱ نے ہاتھ اونچا کر کے اسے روکا۔

"بتا دو، بتا دو، استاد۔ جان ہے تو بہت کما لیں گے۔" علی قلی ۲ نے بھی اپنا ارادہ

بدل دیا۔

"ارے، مگر ہم اس چھوکری سے لو کرتا ہے۔"

"بہت چھوکریاں ملیں گی، استاد۔ کاہے کو آفت مول لینے کا۔" علی قلی نے اسے سمجھایا۔

"تو تم ہی بتا دو۔"

"جلدی بولو، ورنہ بس فائر کرتا ہوں۔"

"لوٹ لو، سالو۔ وہ جو کہا ہے کسی فلم نے کہ ارمانوں کی دنیا لوٹ لی... ہائے لوٹ لی... نیچ... اوپر..." یہ کہہ کر اس نے انگلی اٹھا دی۔

"بتاتے ہو یا چلاؤں گولی۔"

"ارے بولا نا، یار۔ اوپر۔ آنکھیں نہیں ہیں تو ادھار مانگ لو۔" اور واقعی جب ان لوگوں نے چونک کر اوپر دیکھا تو میانوں سے اوپر اور کھپریل سے نیچے کوئی سفید سی چیز نظر آ رہی تھی۔ بالے نے محض دھمکانے کے لیے قدم بڑھانا چاہا، لیکن اس آدمی نے اپنے پستول کا رخ پھر ان کی طرف کر دیا۔

نو واردوں میں سے دو آدمی اوپر میالوں پر چڑھ گئے، یہاں دو میالوں کے درمیان ایک اسٹریچر رکھا ہوا تھا، جس کے اوپر لیلینا سفید سی سوتی رسی سے بندھی بے ہوش لیٹی تھی۔ اسے نیچے اتار لیا گیا۔

ٹھیک اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور مسلسل ہوتی گئی۔

"دیکھو، کون ہے۔ خبردار جو اندر بلایا کسی کو، ورنہ اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑ جائے گا۔"

"اپنی جان سن لائٹ سوپ صابن نہیں ہائے۔"

دستک پھر سنائی دی، جس کے ساتھ ہی کسی نے پکارنا شروع کیا۔ "استاد، استاد۔"

"کاے کو بوم مارتا ہے، یار۔ کون ہے پھاٹے خاں؟"

"استاد، پولیس آرہی ہے۔" باہر سے آواز آئی۔

"پولیس۔" وہ سب چونک پڑے۔

"ارے، تو بھاگو نا، دیری کائے کی۔" بالے نے علی قلی نمبر ۱ اور علی قلی نمبر ۲ کی طرف دیکھ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کے انداز سے وہ اس کا مطلب سمجھ چکے تھے۔

"خبردار۔ جب تک ہم لوگ باہر نہ نکل جائیں تم لوگ اپنی جگہ سے نہیں ہلو گے۔"

"ارے واہ، ہم لوگ کاٹھ کے الو ہیں، الو ہیں کیا، جو نہیں ہلیں گے؟ ہم ضرور ہلیں گے، اے لو۔" یہ کہہ کر وہیں کھڑے کھڑے بالے نے ہلنا شروع کردیا اور رؤف اور نبی دونوں کو اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔ مگر جب وہ پلٹے تو وہ چاروں آدمی مع ایلینا کے غائب تھے۔ وہ کمرے کی بند کھڑکی کھول کر نکل گئے تھے۔ بالے، رؤف اور نبی سامنے والے دروازے سے ہی نکل کر باہر بھاگے، لیکن اسی وقت پولیس کی جیپ کارپانیگوڑی پولیس اسٹیشن کا انچارج جس میں انسپکٹر راز داں ایک ہیڈ کانسٹیبل اور تین سپاہی سوار تھے، واردوالے مکان کے سامنے بریک لگا کر رکی۔ علی قلی نمبر ۱ اور علی قلی نمبر ۲ تو بھاگتے بھاگتے پکڑ لیے گئے، لیکن بالے چھلاوے کی طرح غائب ہو چکا تھا۔

کچھ دور تک مزید تلاش کرنے کے بعد انسپکٹر راز داں نے واردوالے مکان کی بھی تلاشی لے ڈالی، مگر وہاں کچھ نہ تھا۔ وہ واپس لوٹا تو بہت جھلایا ہوا تھا۔

"شاید ہم دیر سے پہنچے۔ اغوا شدہ لڑکی کو پھر غائب کردیا گیا۔" وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ان بدمعاشوں سے ضرور کچھ پتا چلے گا۔" ہیڈ کانسٹیبل نے علی قلی نمبر ۱ اور نمبر ۲ کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"پولیس اسٹیشن چل کر ہی ان سے سمجھا جائے گا۔" وہ اپنی کار اور تیز دوڑانے لگا۔

جس وقت وہ پائیکوڑی کی بڑی سڑک کے کنارے کے پولیس اسٹیشن پر پہنچے تو وہاں علی قلی نمبر ۳ اور نمبر ۴ بھی موجود تھے۔ شاید وہ بھی کسی اطلاع پر ہی پکڑ کر لائے گئے تھے۔

نقلی قلی نمبر ۱ اور نمبر ۲ اپنے ساتھیوں نمبر ۳ اور نمبر ۴ کو دیکھ کر مسکرا دیے۔

”یہ لو، بیٹے پکے سور معلوم ہوتے ہیں۔ تھانے میں بھی ہنس رہے ہیں۔“ پولیس اسٹیشن کا رائٹر اپنے چشمے کی اوٹ سے انھیں گھورتے ہوئے بولا۔

”چاروں کو میرے آفس میں لاؤ۔“ انسپکٹر رازداں یہ کہتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا جس کے دروازے کے باہر تختی لگی تھی، 'انسپکٹرس آفس'۔

”رائٹر صاحب، میرا نیک مشورہ ہے کہ آپ دال میں حکیم ثناء العین کا سرمہ کھایا کیجیے۔ آپ کو اچھے خاصے آدمی جانور دکھائی دینے لگے ہیں۔“ علی قلی نمبر ۱ نے چلتے چلتے رائٹر کو مشورہ دیا۔

”ارے واہ، چھپر پھاڑ کر بولے۔“ رائٹر نے ناخوش گوار موڈ میں طنز کیا۔

”آپ کو خالیخولیا بھی ہو گیا ہے شاید۔“ علی قلی نمبر ۲ نے رائٹر کی طرف اشارہ کر کے نمبر ۱ سے کہا۔ اور پھر چاروں ہنس دیے۔

”حوالدار۔“ رائٹر گلا پھاڑ کر چیخا۔ ”لے جاؤ انھیں، ورنہ مجھے غصہ آ رہا ہے۔“

”ہے ہے ان کو آتا ہے پیار پر غصہ... اور ہم کو غصے پہ...“ نمبر ۱ نے سرد سانس کھینچ کر کہا۔

”تمہارا سر آتا ہے۔“ رائٹر نے جھنجلا کر پیپر ویٹ ہاتھ میں اٹھا لیا۔

لیکن اسی وقت ہیڈ کانسٹیبل نے آ کر انھیں انسپکٹر کے دفتر میں چلنے کو کہا۔ وہ چاروں انسپکٹر رازداں کے سامنے پہنچ کر قطار میں کھڑے ہو گئے۔

”کون ہو تم لوگ؟“ رازداں نے اینٹھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”آدمی۔“ نمبر ۱ نے سنجیدگی سے کہا۔

"حکومت، کیا نام ہے تمہارا؟"

"علی قلی نمبر ا۔"

"اور تمہارا؟"

"علی قلی نمبر ۲۔"

"کیا مذاق ہے یہ۔ میں نام پوچھ رہا ہوں؟"

"میرا نام علی قلی نمبر ۳۔" تیسرا بولا۔

"اور خاکسار علی قلی نمبر ۴ ہے۔ اس سال شیر افگن بنتے بنتے رہ گیا ہے۔" نمبر ۴ نے بھی اپنا تعارف کرا دیا۔

"میں تم لوگوں کو حوالات میں بھیجوں یا پاگل خانے؟"

"جو جگہ آپ کو بھلی لگتی ہو۔" نمبر ا نے معصوم لہجے میں جواب دیا۔

"اوہ، تو مجھے سختی کرنی ہی پڑے گی۔"

"اچھا، پہلے آپ ان حوالداروں کو باہر بھیج دیجیے۔"

"کیوں؟"

"آپ سے پرائیوٹ میں کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"نہیں، جو کہنا ہے، سب کے سامنے کہو۔"

"کہہ دوں؟" نمبر ا نے نمبر ۲ سے پوچھا۔

"اللہ جانے۔" نمبر ۲ نے منہ بنا لیا۔ جس پر خموشی سے علی قلی نمبر ا نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ انسپکٹر رازداں کا ہاتھ احتیاطاً اپنے پستول پر چلا گیا، لیکن جب نمبر ا کا ہاتھ نکلا تو اس میں پستول کی بجائے شناختی کارڈ تھا جو اس نے رازداں کے سامنے رکھ دیا۔

"لاحول ولاقوۃ۔ پھر کیوں اتنی دیر سے پریشان کر رہے ہو۔"

"پہلے انھیں باہر بھیجیے۔" رؤف نے حوالداروں کی طرف اشارہ کیا اور وہ انسپکٹر

رازداں کا اشارہ پاتے ہی حیران حیران سے باہر چلے گئے۔ انھیں اس وقت اور زیادہ حیرت ہوئی جب اندر سے بجائے غصیلی آوازوں کے انھیں قہقہے سنائی دیے۔

"مجھے کیا معلوم تھا کہ شہر کے چار شریف آدمیوں نے غنڈہ گردی اختیار کرلی ہے۔"

رازداں نے رؤف سے کہا۔

"مصلحت، انسپکٹر صاحب، قطعی مصلحت، ورنہ یہ معزز لوگ کہیں اس کام کے لیے تیار ہوسکتے تے۔" رؤف نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "خیر، نبی خاں تو آن ڈیوٹی تھے مگر یہ دونوں میرے دوست اس نازک موقع پر جب کوئی ساتھی نہیں مل رہا تھا اپنے کام آئے۔"

"لیکن ایسا کرنے کا مقصد کیا ہوسکتا ہے؟"

"یہ خان صاحب جانیں۔ ان کی باتیں کچھ عجیب سی، مگر بڑی مضحکہ خیز ہوتی ہیں۔ اس میں بھی کوئی راز ہوگا۔" نبی خاں نے بتایا۔

"اوہ سمجھا تو وہ فون بھی پھر خان صاحب کا ہی ہوگا۔"

"کون سا؟"

"یہاں ایک ٹیلی فون آیا تھا کہ سلور کلب سے اغوا کی گئی لڑکی اس وقت پائیکوڑی کے وارو والے مکان میں ان بدمعاشوں کے ساتھ موجود ہے۔"

"یعنی کہ ہم بدمعاش؟" رؤف نے تھوک نگلنے کی کوشش کی۔

"ارے بھئی، اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی ان کی۔ ممکن ہے ٹیلی فون کے کہیں اور بھی رسیو کیے جانے کا خطرہ رہا ہو۔" رازداں نے سمجھایا۔

اور پھر وہ دوستانہ فضا میں گفتگو کا موضوع بدل کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔

☆☆☆☆☆☆

محاصرہ

خان نے بریک لگا کر نیشنل فیئر گراؤنڈ کے باہر ہی اپنی گاڑی روک دی۔ یہاں ہر طرف ایک پر ہول سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آس پاس دور تک کسی کا نام و نشان نہ تھا۔ گاڑی فیئر گراؤنڈ کے پارکنگ کمپاؤنڈ میں کھڑا کر کے وہ اندر کی طرف دوڑ پڑے جہاں ایک کھلے شیڈ میں ہی انھیں دور سے وہ ہیلی کوپٹر نظر آ گیا جس کی حفاظت پولیس کے دو مسلح کانسٹیبل اور ایک سارجنٹ کر رہے تھے۔ خان کو دیکھتے ہی وہ اٹینشن ہو گئے۔

ہیلی کاپٹر کو میدان میں لے آیا گیا۔ خان کو ہیلی کوپٹر کی پرواز کی بہترین مشق تھی۔ ہیلی کاپٹر صرف ۲ سیٹر تھا، اس لیے باقی آدمی وہیں چھوڑ دیے گئے۔ بالے خان کے پاس والی نشست پر جم گیا اور پھڑ پھڑا کر اڑنے والے کسی پرندے کی طرح ہیلی کاپٹر بتدریج زمین سے سیدھا اوپر بلند ہونے لگا۔

”ان کا پیچھا چھوڑ کر ہم لوگ ہیلی کاپٹر کے چکر میں ادھر آ نکلے ہیں اور وہ راستے میں ہی کہیں گول ہو گئے تو...؟“ بالے نے پوچھا۔

”میرا کوئی انتظام نامکمل نہیں ہوتا، لو سن لو...“ یہ کہہ کر خان نے ہیلی پاپٹر میں لگے ہوئے وائرلیس ریسیور کو آن کر دیا۔

”پٹرال تھری کالنگ۔ ایچ کے۔ پٹرول تھری کالنگ... کم ان۔ ایچ کے اسپیکنگ۔ اوور۔“ خان نے ماؤتھ پیس پر کہا۔

”وہ گاڑی رنبیرہ روڈ سے ابھی ابھی گزری ہے۔ اوور۔ رخ شمال کی طرف ہے اوور۔“

”تمہیں دیکھا تو نہیں؟“ خان نے پوچھا۔

”نو سر۔ میری موٹر سائیکل اندھیرے میں تھی اوور۔“

”ان کے شبے کی حد سے دور رہ کر گھیرا ڈالو اوور۔“ خان نے ہدایت کی۔

او کے، سر۔ اوور۔“

بلب کی اپارکنگ جاری رہی۔

”پٹرول سیون کالنگ ایچ کے... ایچ کے اٹینڈ، پلیز...“ دوسری آواز سنائی دی۔

”کم اِن... اٹینڈنگ... اوور۔“

”وہ گاڑی تیز رفتاری سے کمانیہ اسکوائر عبور کر کے بیرم گام روڈ پر گھومی ہے۔“

”نظر سے دور رہ کر گھیرا ڈالیے... اوور۔“

”ویری ویل، سر۔“

اور کچھ دیر بعد ان کا ہیلی کاپٹر خود کمانیہ اسکوائر کے اوپر سے پرواز کرتا گزرنے لگا۔

”میرا تو کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔“

”کیوں؟“

”میں قاضی صاحب کو نکاح خوانی کا بیعانہ بھی دے آیا تھا۔ ہائے میرے پانچ روپے۔“

”شکر کرو کہ اتنی ہی حجامت ہوئی ہے۔“

”حجامت کہاں ہوئی ہے۔ میں نے تو اسی غم میں شیو تک نہیں کیا۔“

”لونڈیا بڑی خطرناک نکلی۔ پہلی بار اسپتال سے صاف نکل گئی، پھر اس دن موبجنی میں تعاقب میں دھول جھونک گئی اور...“

”آج آپ نے اسے رفو چکر کرا دیا۔ ضرور کچھ کال میں دالا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ خان نے تیوری بدل کر پوچھا۔

”آپ کو وہ ہو گیا ہے۔“

"یعنی..." خان نے نگاہیں بدستور دور نیچے زمین کے اس حصے پر دوڑاتے ہوئے کہا، جہاں بیرم گام روڈ دور تک دوطرف مکانات اور خاموش کھڑے گھنے چھترے درختوں کے درمیان کے بل کھاتی نظر آرہی تھی۔ رات کے اندھیرے میں کسی سڑک پر دوڑتی ہوئی کار ہیلی کاپٹر پر سے دیکھ لیا جانا ناممکن نہ تھا، کیوں کہ کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی خود نگاہوں کو متوجہ کرلیتی تھی۔ کافی فاصلے پر اس سڑک پر دو کاریں آگے پیچھے رینگتی نظر آرہی تھیں یہ شاید پولیس گاڑیاں تھیں۔

"وہ جو کسی اچھی خاصی فلم میں پر ان کو ہوجایا کرتا ہے۔"

"بے موقع بے ہودگیاں مجھے قطعی پسند نہیں۔"

"تو پھر یہ بالے صاحب کی اپنی پسند ہے۔"

"شیادہ بکو گے تو یہیں سے نیچے پھینک دوں گا۔"

"پھینک دیجیے، پھینک دیجیے نا۔ حکومت نے آپ کو سات خون جو معاف کیے ہیں۔"

"نارتھ زون۔ ایمرجنسی پٹرولز۔ ایچ کے کالنگ۔" خان نے وائرلیس پر بولنا شروع کیا۔

"پٹرول تھری اٹینڈنگ، سر۔"

"پٹرول نائن ہیر سر۔"

"پٹرول سیون اسپیکنگ۔"

"پٹرول سکس ایچ کے۔ آرڈر پلیز۔"

"بیرم گام روڈ سے ممبا ٹینک تک کے پورے علاقے کو محاصرے میں لے لیا جائے۔" خان نے حکم دیا۔

"او کے ایچ کے۔"

"او کے باس۔"

"ویری ویل سر۔"

اور خان نے پھر ماؤتھ پیس رکھ دیا۔

"اجازت ہو تو میں بھی ایک کال کرلوں؟" بالے نے پوچھا۔

"ضرورت؟"

"میں اپنی روٹھی ہوئی تقدیر کو آواز دینا چاہتا ہوں۔"

"شٹ اپ۔"

"اچھا، اجازت ہو تو ایک عدد دردبھرا گانا گالوں۔"

"مار کھا جاؤ گے۔"

"رونا گانا ہر شریف انسان کا پیدائشی حق ہے۔ میں نے پیدا ہوتے ہی استاد بندے علی خاں کا تان توڑ گایا تھا۔"

لیکن خان نے کوئی توجہ نہ دی۔ وہ دوربین سے نیچے خلا میں گھورتا رہا۔ ہیلی کاپٹر اس وقت گہرے نیلے آسمان کے بے کراں وسعوں میں زمین سے تقریباً پانچ سو گٹ اوپر اڑ رہا تھا۔

"ایایایایایا ئے اِاے.. اے اے اِاے... واہ واں واں واں... سکھی ری میں تو پیا کے پاس کیسے جاؤں... کیسے جاؤں... کے کے کے کے کے کیسے... ہوڑن شولے پہ ہوڑ جاؤں ...جھاؤں... اوں اوں.. اوں اوں.. اُو آہ.. نن... نہیں جاتا۔"

آواز اس کے حلق میں اٹک گئی اس کی گردن خان کے پنجے میں تھی۔

"میں خیال گا رہا تھا۔" بالے نے معصومیت سے کہا۔

"جوتے کھانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"جب قحط سالی آتی ہے تب۔ مگر قحط تو سالا ہونا چاہیے۔ اچھا بتایئے، قحط آتی ہے یا آتا ہے۔ یعنی مونث ہے کہ..."

”دماغ مت چاٹو ورنہ بہت بری طرح پیش آؤں گا۔“

”اپنا اپنا اخلاق ہے۔“

”ایچ کے... یور اٹینشن، پلیز... ایچ کے... پٹرول سیون کالنگ۔“

”کم اِن... میں بول رہا ہوں۔“ خان نے ماؤتھ پیس پر فوراً جواب دیا۔

”وہ گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی ہے۔ اوور۔“

”ممیا ٹینک کی طرف حلقہ تنگ کرتے جاؤ۔ ہم اسے تلاش کر لیں گے۔ اوور۔“ یہ کہہ کر خان نے ہیلی کاپٹر کی پرواز کم بلندی پر کر دی۔

”آخر ان چڑی ماروں کا تعاقب اس قدر اہتمام سے کیوں کیا جا رہا ہے۔“

”تاکہ وہ تعاقب کی طرف سے بے فکر ہو کر اپنے صحیح مقام پر پہنچ سکیں۔“

”آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے صحیح مقام پر ہی جائیں گے۔“

”وہ لڑکی اس پراسرار گروہ کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے اور سلور کلب میں کیوں کہ اپنے باس کے حکم سے بغاوت کر کے اپنے کسی محبوب کی خاطر رقص کرنے آئی تھی اس لیے اسے سزا یا فیصلے کے لیے سب سے پہلے اسی کے سامنے پیش کریں گے۔“

”آپ کو یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟“

”مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ میں نے اس شکل کی کسی لڑکی کو کبھی نہ کبھی سلور کلب میں جاتے دیکھا ہے اور وہ اس دن ایک مرد کے ساتھ تھی۔ انداز و ادا کا طریق سے وہ ایک دوسرے کے لیے رومان زدہ نظر آتے تھے۔“

”تو مر گئے۔“

”کون؟“ خان نے سرچ لائٹ کی طرح اپنی نظریں نیچے چاروں طرف گھماتے ہوئے کہا۔

”بالے صاحب کے مغز کے سب کیڑے۔ نہ جانے کون ہوگا وہ الو کا پٹھا۔“

“وہ... نیوی کا ایک افسر ہے، اس کا نام حمید ہے۔”

“تو آپ نے اسی لیے مجھے سلور کلب کا اشارہ کیا تھا اس دن؟”

“ہاں۔ اور اگر تم لوگ اسے غنڈوں کی حیثیت سے اغوا نہ کرتے تو شاید وہ اب تک زندہ نہ رہتی۔” خان نے بتایا۔

“خاکسار کے پلے کچھ نہیں پڑا۔”

“اگر وہ سمجھ لیتا کہ ایلینا پولیس کے شکنجے میں چلی گئی ہے تو وہ کسی صورت بھی اسے ختم کرا دیتا۔”

“تو وہ ضرور اس مرد واحد غائب کو جانتی ہوگی۔”

“یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہائٹ ہاؤس کے واقع سے تو یہی معلوم پڑتا ہے کہ وہ اپنے آدمیوں کے لیے بھی نامعلوم ہے۔ لیکن ایلینا، پلیگ کے کیڑوں کی چوری کا ثبوت ضرور تھی اور اس لیے اسے ختم کر دیا جاتا۔”

“آپ نے فون پر شاہی باوڑی کا ذکر کیا تھا؟”

“وہ چیز ابھی تک سمجھ میں نہیں آسکی اور سچ پوچھو تو مجھے ابھی تک اسے ٹھیک سے دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا ہے۔ میرا خیال ہے وہاں سے کسی مقام کے لیے زمین دوز راستہ جاتا ہے۔ ابراہیم وغیرہ کو بھی اسی راستے سے غائب کیا گیا ہے۔”

“چلیے، خس کم جہاں پاک۔”

“کیا مطلب؟”

“مجھے وہ لونڈا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ ایک دم اخروٹ۔”

“کام کا آدمی ہے۔ تمہاری طرح کام چور تو نہیں۔”

“آپ غلط محاورہ استعمال کر رہے ہیں۔ کام چرائی جانے والی چیز ہی نہیں ہے۔”

“اچھا اب چپ رہو۔”

"لیکن وہ لوگ ابراہیم اور اس کے ساتھیوں کو کہیں ختم نہ کردیں۔"

"میں نے انھیں مصنوعی پلیگ کا نسخہ دے دیا ہے۔ اپنی زندگیاں خطرے میں دیکھ کر وہ اسے استعمال کریں گے جس سے ان کے بدن پر جگہ جگہ گلٹھیاں نکل آئیں گی اور اس وقت یقیناً وہ لوگ انھیں کہیں باہر پھنکوا دیں گے۔"

"کوئی نئی ایجاد کی ہے آپ نے؟"

"کچھ نہیں، محض ایک سیال مادہ، جسے جسم کے جس حصے پر ذرا سا لگالو، وہاں گلٹی کی طرح جلد پھول جاتی ہے۔"

"ارے، وہ دیکھیے۔ مگر وہ تو دو تین گاڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔" بالے نے چونک کر نیچے کی طرف اشارہ کیا۔

نیچے، ممیا ٹینک کے چوراہے پر تین کاریں سڑک کراس کر رہی تھیں۔ خان نے دوربین سے دیکھا سرکاری روشنی کے کھمبے کے نیچے سے گزرنے والی کار وہی سرخ ڈاج تھی۔

"وہ رہی۔" وہ بولا۔

اور پھر ہیلی کاپٹر کی پرواز کا رخ اسی طرف ہوگیا۔

سرخ ڈاج آگے جا کر ایک ہائی وے پر گھوم گئی۔ دوسری کاریں مقابل سمت نکل گئی تھیں۔

کچھ دیر بعد ہیلی کاپٹر ایک پختہ یک منزلہ عمارت کی چھت پر اتر رہا تھا۔ یہ عمارت ایک پرانے غیر آباد چھوٹے سے قلعے کی پشت پر اس سے ملحق واقع تھی اسے جدید اور قدیم تعمیر کا امتزاج کہا جا سکتا تھا۔ اترتے اترتے ہیلی کاپٹر سے ایک ہوائی آسمان کی طرف داغ دی گئی۔ یہ محاصرہ کرنے والی پٹرول پولیس کے لیے سگنل تھا۔ ہیلی کاپٹر جس چھت پر اترا، وہ بالکل سونی اور تاریک تھی۔ اس پروازی مشین کی سب سے بڑی خصوصیت یہی تھی کہ اس کی کوئی آواز نہ ہوتی تھی۔ نیچے اترتے ہی وہ اسی چھت کے اس سامنے والے چھوٹے سے دروازے کی طرف

دوڑے جو شاید اس کے نیچے جانے والے زینے پر کھلتا تھا، وہ بند تھا۔ مجبوراً انھیں برسات کا پانی بہانے والے ایک پائپ کے ذریعے نیچے اترنا پڑا۔ نچلی منزل کا بار جو کھلا ہوا تھا اس میں اتر کر وہ تاریکی میں دیوار سے چپک کر کھڑے ہو گئے۔ لیکن خلافِ توقع اس منزل پر بھی سناٹا تھا۔

”تم یہاں ٹھہرو میں نیچے جاتا ہوں۔“ خان نے بالے کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ موقع کی نزاکت کے پیشِ نظر بالے کچھ نہ بولا۔ وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔ خان اب گراؤنڈ فلور تک جانے والے زینے کے ذریعے نیچے اتر رہا تھا۔ یہ زینہ ایک بڑے سے کمرے میں جا کر ختم ہو گیا تھا جہاں فرش پر دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور ایک آدمی جس کی پشت خان کی طرف تھی ایک گدے والی کرسی پر بیٹھا باہر کے داخلی دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

خان نے زینے سے اتر کر دیوار کے کونے سے لگتے ہوئے جیب سے ایک بادام نکال کر زینے پر پھینک دیا۔ وہ فرصت کے اوقات میں خشک میوے چبانے کا عادی تھا اور دو چار بادام تو ہر وقت اس کی کسی نہ کسی جیب میں پڑے رہتے تھے۔

سناٹے میں 'کھٹ' کی آواز ہوتے ہی وہ آدمی چونک پڑا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر فوراً پستول باہر نکال لیا اور بڑے محتاط انداز میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا زینے پر چڑھنے لگا۔ خان اتنی دیر میں کمرے کو عبور کر کے اس دروازے پر پہنچ گیا، جس کے باہر دبیز ریشمی پردہ لٹک رہا تھا۔ دروازہ صرف بھیڑا گیا تھا، خفیف سے دھکے پر وہ کھل گیا۔ خان نے درازے اندر جھانکا۔ دو آدمی ایک میز کے گرد بیٹھے تاش کھیل رہے تھے اور ان سے کچھ فاصلے پر ہی فرش پر ایک لاش پڑی تھی۔

خون میں لت پت، ایک نوجوان تن درست آدمی کی لاش اور ان دونوں کو جیسے اس کے وجود سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ وہ بے فکری سے تاش کھیلنے میں مشغول تھے۔

خان ان کی نظر بچا کر دیوار کے سہارے چلتا تیسرے کمرے کے دروازے تک پہنچ

گیا۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے اندر داخل ہونے تک اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ یہ کمرہ اندر سے اونچی چھت والا شان دار کمرہ تھا۔ اس میں دو صوفے وسط میں بچھے تھے۔ ارد گرد کناروں سے لگے کچھ لوہے کے اسٹینڈ رکھے تھے۔ لیکن ایک حیرت ناک چیز ہال کے وسط میں چھت سے ایک راڈ کے ساتھ لٹکنے والا روشنی کا ایک چپٹا ہنڈا تھا، جو بڑی تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ اور اس کے گرد وہی نیلگوں ہالہ۔ اس کمرے سے گزر جانا یقیناً بہت خطرناک تھا۔ خان پہلے وہائٹ ہاؤس میں اس روشنی کی طاقت کا اندازہ لگا چکا تھا۔ وہ چاہتا تو اس وقت بھی اس پر فائرنگ کر سکتا تھا، لیکن اس طرح فائرنگ کی آواز سے ساری عمارت گونج اٹھتی۔ وہ کچھ لمحے سوچتا رہا۔ پھر اس نے اپنا پستول نکال کر پتلون کی جیب میں ڈالتے ہوئے کوٹ کی جیبیں خالی کر ڈالیں اور اسے اتار کر ہوا میں گھماتے ہوئے صوفوں کی طرف پھینکا۔ کوٹ کے درمیان میں گرتے ہی ایک گونج سی پیدا ہوئی اور اس گردش کرتی ہوئی روشنی کے ہالے سے برقی کرنیں تڑپ کر اس کوٹ پر گریں۔ دوسرے لمحے وہ جل کر سیاہ ہو چکا تھا۔ کوٹ کے جلنے کے بعد ہی وہ روشن ہنڈا اوپر اٹھنے لگا اور چھت سے جا لگا۔

پھر اس کمرے کا ایک بند دروازہ جھٹکے سے کھلا اور دو آدمی پستول بدست اندر گھس آئے اور حیرت سے اس جلے ہوئے کوٹ کو دیکھنے لگے۔ خان اتنی دیر میں پردے کی آڑ لے چکا تھا۔

”تعجب ہے، صرف کوٹ؟“ پہلا بولا۔

”وہ بھی ضرور یہیں کہیں ہوگا۔ چلو تلاش کریں۔“ دوسرے نے کہا۔

لیکن جس وقت وہ دونوں کمرے میں ادھر ادھر تلاش کرتے پردے کے نزدیک آئے تو خان اچانک ان پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے اپنے دونوں بازوؤں میں اتنی قوت سے ان کی گردنیں دابیں کہ ان کے حلق سے آواز تک نہ نکل سکی۔ خصوصاً ایسے وقت جب وہ پر جوش ہو، خان کی گرفت سے کسی کا نکل جانا آسان نہ تھا۔ اس نے انھیں بے بس کر کے اس زور سے ان

کے سر آپس میں ٹکرائے کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ وہ انھیں چھوڑ کر تیزی سے اس دروازے کی طرف دوڑا جہاں سے وہ دونوں اندر داخل ہوئے تھے۔ دروازہ شاید بند ہو چکا تھا یا آپ سے آپ بند ہونے والا دروازہ تھا۔ خان نے جھونک میں اس زور سے دروازے کو ٹکر ماری کہ وہ شور کی آواز کے ساتھ اندر کی طرف کھل گیا۔ خان اندر داخل ہوتے ہی چونک پڑا۔ یہ ایک چھوٹا سا سجا سجایا اسمبلی ہال تھا۔

ایک لمبی آبنوسی میز کے دونوں طرف تقریباً ۲۴ کرسیاں بچھی ہوئی تھیں، صرف سامنے والی درمیانی خالی تھی اور باقی تمام کرسیوں پر مہذب صورتوں اور شان دار لباسوں والے ۲۴ آدمی بیٹھے تھے۔ وہ سب حیرت سے اچھل کر خان کی طرف دیکھنے لگے۔ ٹھیک اسی وقت ایک بھیانک کھنکتا قہقہہ کمرے میں گونجا اور ان آدمیوں کی حیرت دوبالا ہو گئی۔

"تو تم یہاں تک پہنچ ہی گئے۔" ایک نامعلوم بھاری خوف ناک آواز خان سے مخاطب ہوئی۔

"اس لیے کہ اب تمہارا وقت آ پہنچا۔"

"میں... اہا ہا ہا ہا ہوپ۔ تم صرف یہاں تک پہنچے ہو، مجھ تک نہیں۔ ویسے اپنی تسکین کے لیے چاہو تو ان رئیسوں کو لے جاؤ۔ تمہیں ان کی ہی تلاش تھی نا۔ جانتے ہو یہ کون ہیں؟"

"بہت سے پہچانے ہوئے ہیں ان میں۔ تمہارے مکروہ دھندے کے شریکِ کار۔ معصوم عوام کے قاتل۔" خان نے ان آدمیوں کی طرف نفرت بھری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے تو صرف پلیک پھیلا دیا تھا۔ دھندے تو ان لوگوں نے کیے ہیں۔ یہ بڑے لوگ ہیں۔"

"اہاہاہا۔" وہ پراسرار آواز پھر بولی اور ساتھ ہی ان ۲۴ آدمیوں کے چہرے فق ہو گئے۔ خان یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ آواز اس سامنے والی خالی کرسی کی طرف سے آ رہی

تھی جس پر بار بار ان ۲۴ آدمیوں کی حیرت زدہ نظریں پڑ رہی تھیں۔ خان کے خیال کے مطابق کرسی پر کوئی ٹرانسمیٹر لگا ہوا تھا۔

"باس۔" وہ سب چیخ اٹھے۔ "کیا تم ہم سے غداری کر رہے ہو؟"

"غداری؟" وہ بھاری آواز طنزیہ لہجے میں کہتی سنائی دی۔ "بزنس میں مروت کی گنجائش نہیں ہوتی۔"

"سور، پاجی، کمینے۔" وہ ۲۴ آدمی اس نامعلوم شخصیت کو گالیاں دینے لگے۔ جس کے جواب میں صرف اس کا خوف ناک قہقہہ انھیں سنائی دیا۔ اس پر ایک آدمی نے جھنجلا کر اپنا جوتا اتار کر اس خالی کرسی پر کھینچ مارا۔ پھر وہ سب کے سب بدحواسی سے ہال کے مختلف دروازوں کی طرف بھاگ اٹھے۔

"خبردار جو کسی نے قدم آگے بڑھایا۔" خان گرجا۔ لیکن وہ بمشکل اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ پشت سے کسی کے دبے قدموں کی چاپ سن کر اسے چونکنا پڑا۔ اگر وہ ایک سیکنڈ بھی دیر کر دیتا تو شاید اس کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ فائرنگ کی آواز کے ساتھ کسی پستول کی گولی سنسناتی ہوئی اس کے کان کے نزدیک سے گزر کر پردے پر پڑی۔ دوسرے لمحے خان کے ریوالور سے ایک شعلہ نکلا اور پچھلے کمرے سے آ کر فائر کرنے والوں میں سے ایک وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے نے ایک کھمبے کی آڑ لے لی اور جوابی فائرنگ کرنے لگا۔ اچانک دوسرے دروازے سے ایک اور ہاتھ نکلا اور اس بار بھی خان بال بال بچا۔ اس بار گولی اس کے سر سے صرف ایک انچ اوپر لگی۔ وہ اس نشانے کی زد میں تھا اور اگر جست بھی کرتا تب بھی اس سے بچنے کا امکان نہیں تھا، قریب تھاہ خان پر دوسرا فائر ہو کہ اسی وقت باہر کہیں سے فائرنگ کی ایک آواز سنائی دی اور اس درازے کے پیچھے چھپے ہوئے آدمی کی لاش اوندھی فرش پر آ گری۔

پردے کی آڑ سے فائرنگ کرنے والا آدمی بھاگ اٹھا لیکن دروازے پر ہی سارجنٹ بالے سے اس کی ٹکر ہو گئی۔

"کہاں چلے، میری جان۔ اپنا ہاتھ بھی چکھتے جاؤ نا۔" یہ کہہ کر اس اس زور سے اس کی ناک پر گھونسا جڑا کہ وہ تیورا کر وہیں گر پڑا۔

فائرنگ کی آوازوں نے باہر محاصرہ کرنے والی پٹرولنگ پولیس کو چونکا دیا تھا۔ ابھی وہ چوبیس آدمی عمارت کے پچھلے دروازے تک پہنچے تھے کہ چاروں طرف سے پولیس آ پہنچی۔ وہ بدحواس ہو کر چاروں طرف بھاگے، لیکن انھیں چن چن کر گرفتار کر لیا گیا۔ عمارت میں تین مسلح آدمی اور ملے جو شاید اس پراسرار طاقت کے آلۂ کار تھے، لیکن مقابلے سے پہلے ہی وہ گرفتار ہو گئے۔ البتہ نیلی یا ایلینا اور اس پراسرار آواز والی نامعلوم شخصیت کا کوئی پتا نہ تھا۔

☆☆☆☆☆☆

تیرتی لاش

گرفتار شدہ ۲۴ آدمیوں میں سے ۱۴ اس شہر کے ایسے بیوپاری تھے جو دوائیں فروخت کرنے والی اوسط درجے کی فرموں کے مالک یا منتظم کار وغیرہ تھے۔ باقی اس شہر کے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ انھیں تا تحقیقات حراست میں بھیج دیا گیا۔ صبح ہوتے ہی سب سے پہلے خان کی ہدایت پر انسپکٹر ڈیسوزا نے مسلح پولیس ساتھ لے کر ان تمام چودہ گرفتار شدگان کے اسٹورز پر چھاپے مارے اور خان کا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔ ان تمام کے پاس سے گندھک کے پانی والے طاعون کے نقلی انجیکشنوں کے کئی کئی ہزار کے ذخیرے برآمد ہوئے۔

آخر دوپہر تک ان میں سے بہت سے آدمیوں نے قبول دیا کہ انھیں آدھی رات کو پراسرار طریقے پر یہ نقلی انجکشن لوہے کے چھوٹے صندوقوں میں سپلائی کیے جاتے تھے۔ سب سے پہلے انھیں ایک نامعلوم شخصیت نے ٹیلی فون پر دعوت دے کر وہائٹ ہاؤس میں جمع کیا تھا اور وہیں یہ سودا طے پایا تھا کہ یہ انجکشن ہمیں اصل انجکشنوں سے نصف قیمت پر سپلائی کیے جائیں گے اور حساب ہر ہفتے اس نامعلوم طاقت کے ایک آدمی کو چکانا ہوگا۔ حساب میں گڑبڑ کی سزا اتنی سخت تھی کہ کسی کو بے ایمانی کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

صرف ایک آدمی نے جو 'مے اینڈ کمپنی' کا منیجر تھا، رقم دبالی تھی۔ جس پر اسے واقعی موت کے منہ میں جانا پڑا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی نہ جانتا تھا کہ وہ پراسرار شخصیت کون ہے، جو خود نظر نہ آ کر صرف اپنی آواز سے انھیں حکم دیتی ہے۔ وہ اسے صرف باس کے نام سے جانتے تھے۔ مال انھیں گھر بیٹھے پہنچ جاتا تھا اور رقم خود اس نامعلوم شخصیت کا ایک نمائندہ آ کر لے جاتا تھا۔ البتہ اگر کوئی بیوپاری گڑبڑ کرتا تھا تو اسے وہائٹ ہاؤس یا پھر اس جگہ جانا پڑتا تھا جہاں آج سب کے سب اس لیے بلائے گئے تھے کہ اس شہر کا معاملہ ختم کر کے اب دوسرے بڑے شہروں

میں اس خوف ناک اور گھناؤنے بزنس کو پھیلایا جائے۔ رقم وصول کرنے والے آدمیوں کا جو حلیہ ان لوگوں نے بیان کیا تھا۔ وہ کے سی سے ملتا جلتا تھا۔

خان اپنے انویسٹی گیشن روم میں ان لوگوں سے پوچھ گچھ کر رہا تھا اور بالے ان کا بیان نوٹ کرتا جاتا تھا۔ کے سی کا خیال آتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”اب کیا سوجھی؟“ بالے نے تھکے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ ان لوگوں کو لاک اپ میں بھیج دو۔ باقی پھر دیکھیں گے۔“

”چلو، بیٹو۔ اپنے ڈبے میں۔ وہیں انڈے دے دینا۔“ بالے نے گویا انھیں ہانکا۔ پھر اس نے دروازہ کھول کر باہر موجود ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان قیدیوں کو لاک اپ میں واپس لے جایا جائے۔

کچھ دیر بعد ان کی کار کرزن روڈ پر ہوتی ہوئی، ڈرگ روڈ پولیس اسٹیشن کی طرف دوڑ رہی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا غیر اہم پولیس اسٹیشن تھا۔ سب انسپکٹر ڈوبے یہاں کا انچارج تھا۔ خان کی شکل دیکھتے ہی اسے پسینہ آگیا۔

”گڈ مارننگ سر۔“ اس نے سلامی دیتے ہوئے کہا۔

”وہ قیدی کہاں ہے؟“ خان نے پوچھا۔

”محفوظ ہے، پچھلے لاک اپ میں۔“

”کوئی ہنٹر ہے؟“

”ہنٹر...؟“ ڈوبے کو کپکپی سی آگئی۔ ”ابھی لایا۔“

وہ ایک منٹ بعد ہی ہنٹر لے آیا۔ اس کے بعد پولیس اسٹیشن کے اسٹاف کو حیرت و خوف میں غرق چھوڑ کر وہ دونوں لاک اپ کے پچھلے کمرے کا دروازہ کھلوا کر اس میں گھس گئے۔ خان نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ یہاں کے سی ہتھکڑی پہنے پتھر کے چبوترے پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ طویل القامت، خوف ناک قسم کا یہ جرائم پیشہ افراد کا سردار اب بری طرح

مضمحل اور پراگندہ خاطر ہو چکا تھا۔ داڑھی کے بال بڑے ہوئے اور آنکھوں میں تھکن سی تھی۔ پولیس کے اس اتنے بڑے ڈپارٹمنٹ میں وہ اگر کسی سے ڈرتا تھا تو سپرنٹنڈنٹ خان سے۔ اور آج اسے اس قدر خوف ناک موڈ میں دیکھ کر تو اسے جھرجھری آ گئی۔ خان کبھی اتنا غضب ناک نہ دکھائی دیا کرتا تھا۔ بالے کی بھی اسی وجہ سے کچھ بولنے کی ہمت نہ پڑی۔ خان اندر آتے ہی کے سی پر برس پڑا۔ لگاتار چار پانچ ہنٹر اس پر برسانے کے بعد اس نے ہاتھ روکا۔

"کیوں بے سور، تو نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا تو نہیں جانتا ہے۔"

"میں نے جھوٹ نہیں بولا ہے۔" کے سی اپنے بازوؤں کو مسلتے ہوئے بولا۔

"پھر وہی۔" یہ کہہ کر خان کا ہنٹر پھر لہرا کر اس کی پیٹھ پر پڑا۔ وہ درد سے تلملا اٹھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" اس نے کانپتی آواز میں کہا۔

"پھر کیا نقلی انجکشنوں کی رقم وصول کرنے تمہارا باپ جایا کرتا تھا۔" بالے نے درمیان میں کودتے ہوئے اسے ڈانٹا۔

"وہ... وہ..." کے سی ہانپتے ہوئے بولا اور پھر چپ ہو گیا۔

"تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم سچ سچ بتاؤ گے۔ کیا یہی سچ تھا؟" یہ کہہ کر خان نے بے تحاشا اس پر ہنٹروں کی بارش کر دی۔

"بے گناہ انسانوں کے قاتل۔ سور، کمینے، لالچی کتے۔" وہ سڑاسڑ ہنٹر مارتا جاتا تھا اور غصے کی حالت میں دانت پیس پیس کر بڑبڑاتا جاتا تھا۔

"م... میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ میرے سامنے کبھی نہیں آیا۔ میں نے صرف اس کی آواز سنی ہے۔ شیشے کے ایک دیوار کے پیچھے سے۔" کے سی نے بمشکل بتایا۔

اس سے زیادہ وہ کچھ نہ بولا اور خان اسے اس وقت تک مارتا رہا جب تک کہ وہ بے دم نہ ہو گیا۔

"میرا خیال ہے یہ سچ کہہ رہا ہے۔" بالے نے کے سی کی کیفیت سے متاثر ہو کر کہا۔

"ہُم... لیکن اس نے یہ بھی کہاں بتایا تھا کہ اس کی رقمیں بھی یہیں وصول کرتا تھا۔" خان بڑبڑایا۔

"تم وہ رقمیں اسے کہاں لے کر دیتے تھے؟" خان کی بجائے بالے نے کے سی سے سوال کیا۔

"ممبا ٹینک، ٹینک کے ایک مکان میں۔" کے سی نے کراہتے ہوئے بمشکل بتایا۔

"لاحاصل۔" خان نے گردن ہلائی اور پھر وہ اور بالے باہر نکل آئے۔

"اسے گرم پانی سے غسل کرکے کپڑے بدلوا دو۔" خان نے باہر نکل کر کے سی کے بارے میں سب انسپکٹر ڈوبے کو ہدایت کی اور وہ 'یس، سر' کہہ کر اٹینشن کھڑا رہ گیا۔

دفتر میں واپس قدم رکھتے ہی خان کو بڑے قبرستان والے علاقے کے انچارج انسپکٹر کو فون ملا۔

"ایک لاش شاہی باوڑی میں تیرتی پائی گئی ہے۔" اس نے بتایا۔

"میں آرہا ہوں۔" خان نے کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

"لیجیے، بیٹھتے چین نہیں کہ پھر بھاگو۔"

"وہ لاش ضرور اس بدنصیب لڑکی کی ہوگی۔"

"ایسا نہ کہیے، ورنہ میرا کلیجہ منہ کو آجائے گا اور میں اسے چبا جاؤں گا۔"

اور واقعی خان کا خیال صحیح نکلا۔ لاش نیلی یا ایلینا کی ہی تھی، وہ باوڑی میں تیرتی پائی گئی تھی۔ خان نے جب پولیس اسٹیشن پر اس کا معائنہ کیا تو انچارج انسپکٹر نے اس کے سامنے کاغذ کا ایک پرزہ بھی پیش کیا۔ یہ بھیگا ہوا تھا پھر بھی اس پر تحریر کردہ مٹے مٹے سے الفاظ پڑھے جاسکتے تھے۔ اس پر لکھا تھا۔

"یہ رہا آخری ثبوت۔ اس کا بھی ماتم کرو۔ اور وہ بے وقوف بھی جو میری سخت

ہدایات کے باوجود تم لوگوں کو اپنے تعاقب میں لگا کر لے آیا تھا، اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ اس کی لاش تمہارے چار آدمیوں کی طاعون زدہ لاشوں کے ساتھ اسی قبرستان کے پیچھے کسی گڑھے میں پڑی ہوگی۔ میں تمہارا بھی یہی حشر کرتا، لیکن سر دست میں اس شہر میں اپنا کاروبار بند کر رہا ہوں، اس لیے ضروری نہیں سمجھا۔ البتہ آگے بڑھے تو اس سے بدتر حشر ہوگا۔“

یہ چٹھی پڑھ کر خان کسی گہری فکر میں کھو گیا۔

”آپ شاید ڈر گئے، شاید؟“ بالے سے نہ رہا گیا۔

”چپ رہو۔“ خان نے ڈانٹا۔

”چہ خوش، کمہارے سے بس نہ چلا تو گدھے...“

”بکومت، جاؤ فون کر کے ڈیسوزا، یولکر، شاہ کسی کو بلا لو۔“

”اس کا جنازہ میں اکیلا اٹھا سکتا ہوں۔“

”سور، میں سر توڑ دوں گا۔“

”آپ نے شاید فلم شہید نہیں دیکھا۔ ویسے میں جا رہا ہوں۔“ بالے یہ کہہ کر آفس کی طرف کھسک گیا۔

ڈیسوزا اس وقت آفس میں موجود نہیں تھا۔ اس کی بجائے رؤف آ پہنچا۔ اتنی دیر میں خان، بالے اور سب انسپکٹر ڈوبے کی معیت میں قبرستان کی فصیل کے پیچھے پہنچ کر ان گڈھوں کو دیکھ رہا تھا جو ناہموار چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے درمیان تھے۔ اور واقعی دو ٹیلوں کے درمیان ایک گہرائی میں اسے اس آدمی کی لاش مل گئی جو اپنے ساتھیوں سمیت ایلینا کو پانگوڑی سے نکال کر لے گیا تھا۔ اس کے پچھلی طرف ابراہیم اور اس کے تینوں ساتھی بھی مل گئے۔ ان کے جسموں پر کئی جگہ گلٹھیاں نکلی معلوم ہو رہی تھیں اور ان پر چپچپاہٹ تھی۔

”پلیف کے کیس ہیں، صاحب۔“ سب انسپکٹر ڈوبے نے خان کو ٹوکنا چاہا۔ لیکن خان نے لسنز کی بوتل جیب سے نکال کر ان کی ناکوں سے لگا دی۔ باری باری انھیں ہوش

آ گیا۔

"بڑا خطرناک رسک لیا تھا ان لوگوں نے۔" خان ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولا۔

ابراہیم ہوش میں آتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم بے ہوش کیسے ہو گئے تھے؟" خان نے پوچھا۔

"پہلے وہ ہمیں گیس سے مارنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن پھر جب ہم نے یہ طریقہ استعمال کیا تو ہمیں پلیگ کا شکار سمجھ کر یہاں پھنکوا دیا گیا۔ ہم میں سے تین تو گیس والے کمرے میں ہی بے ہوش ہو چکے تھے۔ مجھے کچھ دیر تک ہوش میں رہا پھر میں بھی بے ہوش ہو گیا۔

"تم نے راستہ دیکھا؟"

"جی ہاں۔ وہ اسی باوڑی کے نصف پانی میں ڈوبی ہوئی تیسری منزل سے ہے۔"

"اچھا۔" خان خاموش ہو رہا۔

اتنے میں رؤف مع چند آدمیوں کے آ پہنچا۔ نبی خاں اور ہیڈ کانسٹیبل اکرام بھی اس کے ساتھ تھے اور سی آئی ڈی کے دو مسلح سفید پوش اور تھے۔

"رؤف، تم لوگ ابراہیم اور ان کے ساتھیوں سمیت اس زمین دوز راستے سے اس مقام پر چھاپا مارو، کسی کو نہ چھوڑنا۔" خان نے رؤف کو حکم دیا۔

"بہت بہتر ہے۔" رؤف نے کہا۔

"بہتر نہیں، بدتر ہے۔" بالے آہستہ سے بولا۔ "پھر مجھے تمہارے مزار پر وہ شعر لکھنا پڑے گا کہ ایک شاعر تھا کہ جس کی قبر تہ خانے میں ہے۔"

"اپنی سناؤ، مجھے تو مرنے جینے کا ڈر نہیں۔" رؤف نے کہا۔ خان آگے بڑھ گیا۔

"کیوں نہ ہوگا بھلا، خبطی دنیا سے ایسے ہی بے زار رہتے ہیں۔" بالے نے منہ بنا کر کہا۔ لیکن خان کے آواز دینے پر چونک پڑا۔

"اچھا، رفو بھائی۔ اس پار پہنچ کر خیریت کا خط لکھنا۔ ہم تو چلے۔" یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا خان کے پاس پہنچ گیا۔

وہ اس وقت کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ بالے کار ڈرائیو کر رہا تھا۔

"کیا ارادہ ہے؟" بالے نے خان سے پوچھا۔

"گاڑی ایرویز اوورسیز کے ٹی رزرویشن آفس پر روک لو۔"

"آپ منہ چھپا کر ہندوستان سے فرار ہونا چاہتے ہیں شاید؟"

"یوں ہی سمجھ لو۔"

"میں تو اپنی ہونے والیوں کو داغِ مفارقت دے کر نہ جاؤں گا، ورنہ میری آئندہ نسلیں..."

"پھر بک چلے۔"

"راستہ کاٹ رہا ہوں۔"

"صرف کام کی بات۔"

"کوئی وعظ کہوں؟"

"تمہارا بھیجا پلپلا کر دوں گا ابھی۔"

"آپ کی خوشی، میں تو نیکی کی دعوت دے رہا تھا کہ اے مومنو... مگر، باس، صرف کپڑے بننے والے مومن ہوتے ہیں یا سب؟"

"میں فضولیات کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"ہائے رے آپ کا موڈ۔ ریس کا گھوڑا بھی اس سے بہتر ہو گا۔"

"تم چپ نہ رہو گے؟" خان کا ہاتھ بلند ہوا۔

"میں خاندان در خاندان چپ ہوں۔" بالے نے ہتھیار ڈال دیے۔

☆☆☆☆☆☆

دو چہرے

بالے نے کار برٹش ایر ویز اوورسیز کارپوریشن کے سٹی آفس کے دروازے پر روک دی۔ خان اسے گاڑی میں چھوڑ کر ہی اندر چلا گیا۔ اور بالے اسٹیرنگ کو بطور وائلن استعمال کرتے ہوئے کچھ گنگنانے لگا۔

خان پانچ منٹ بعد ہی باہر نکل آیا۔ وہ عجلت میں معلوم ہوتا تھا۔ بالے کو دوسری سیٹ پر دھکیلتے ہوئے وہ خود اسٹیرنگ پر بیٹھ گیا۔

"خیر تو ہے؟"

"ایک اتفاق کام آگیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے گاڑی چلا دی۔

لیکن کچھ دور جا کر اس نے ایک پبلک ٹیلی فون کال بوتھ پر پھر گاڑی روک دی اور خود ہی گاڑی سے اتر کر اس میں گھس گیا۔ ڈائل کے نمبر گھمانے پر دوونی ڈالتے ی دوسری طرف سے سول اسپتال کے سپرنٹنڈنٹ کا آفس کلرک بولنے لگا۔

"ڈاکٹر باسو کو بلا دیجیے ذرا۔"

"وہ تو کل سے ڈیوٹی پر نہیں آئے۔"

"کل سے؟" خان الفاظ چبا کر بولا۔ "کیا بات ہے؟"

"شاید کچھ طبیعت ناساز ہے۔"

خان نے مزید گفت وشنید کے بغیر لائن کاٹ دی۔ وہ پھر گاڑی میں آبیٹھا۔ اب اس کی کار ڈاکٹر باسو کے بنگلے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ ڈاکٹر نمبر ۱۷، نسبت روڈ پر رہتا تھا۔ باہر ایک خوفناک سی شکل کا گورکھا موجود تھا۔ لیکن وہ خان کو پہچانتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ سلام کر کے ایک طرف ہٹ گیا۔

"ڈاکٹر صاحب اندر ہیں؟"

"ڈاکٹر صاحب... وہ... مگر، صاحب۔"

"اگر مگر کیا؟ مجھے ان سے بہت ضروری کام ہے۔"

"صاحب، انھوں نے کہا ہے کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس لیے جو پوچھے اس سے کہہ دیا جائے کہ گھر پر نہیں ہیں۔" گورکھے نے صاف صاف بتا دیا۔

"اچھا، میں خود مل لوں گا۔"

یہ کہہ کر خان نے گاڑی اندر داخل کر کے پورٹیکو میں کھڑی کر دی اور خود اندر گھس گیا۔ بالے بھی اندر چلا آیا۔ لیکن اس وقت اس کی آنکھیں حیرت سے تقریباً پھیل گئیں جب اس نے بڑی تیزی سے ایک عکس کو ڈاکٹر کے ڈرائنگ روم سے اوجھل ہوتے دیکھا۔ وہ کوئی سفید لباس والی لڑکی تھی جو ان کے قدموں کی چاپ سنتے ہی ڈرائنگ روم سے اٹھ کر بھاگی تھی۔ اسے دیکھ کر بالے کو نہ جانے کیا یاد آ گیا کہ وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔

خان اوپر چلا گیا۔ بالے کا دماغ اس وقت کار کے پہیے کی طرح گھوم رہا تھا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ خان کے پیچھے جانے کی بجائے ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کے پردے کی آڑ میں چھپ گیا۔

قدموں کی چاپ معدوم ہوتے ہی ڈرائنگ روم کے ایک اندرونی دروازے کی اوٹ سے کسی نے جھانکا اور پھر کسی کو نہ پا کر وہ باہر نکل آئی۔ بالے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ یقیناً وہی لڑکی تھی جسے اسپتال میں نرس کے لباس میں نقلی ڈوری کو مہلک انجکشن دیتے پکڑا گیا تھا اور جسے بالے کے بھیجے ہوئے آدمی کی حیثیت سے بھیس بدل کر سب انسپکٹر سانے نے لاک اپ سے فرار ہونے میں مدد دی تھی اور جو بعد میں سانے کی گرفت سے بھی نکل گئی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی باہر والے دروازے کی طرف آنے لگی، شاید وہ بھاگ

جانا چاہتی تھی۔ بالے سانس روک کر وہیں چھپا رہا۔ اور جیسے ہی وہ دروازے کے قریب پہنچی اس نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ بالے کی صورت دیکھتے ہی وہ اک دم زرد پڑ گئی۔

"تم... تم... کون ہو؟" وہ کانپتی آواز میں بولی۔

"پہچانا نہیں، ڈارلنگ۔ میں وہی الو کا پٹھا ہوں جو حوالات میں تم پر ہزار جان سے عاشق ہوا تھا۔"

"چھوڑ دو مجھے، میں تمہیں نہیں جانتی۔" وہ اپنی کیفیت پر قابو پا کر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"اپنے ہونے والے بچوں کا تو خیال کرو، ڈارلنگ۔ وہ بے چارے پیدا ہونے سے پہلے ہی یتیم ہو جائیں گے۔"

"شٹ اپ۔" وہ مچلنے لگی۔

"ہائے، کیا لذیذ ارشاد ہے، پھر سے کہو۔"

"مجھے چھوڑ دو، بدمعاش، ورنہ میں چلاؤں گی۔"

"خوب زور سے چیخو، کون بے وقوف زن و شوہر کے جھگڑے میں ٹپکے گا۔"

"سور، تم میری عزت پر ڈاکا ڈال رہے ہو۔"

"اہاہاہا... کیا ہتھیار ہے، عدالت میں اس پر مجھے دس سال قید بے مشقت کی سزا ہو سکتی ہے۔ مگر میں اب بھی تمہیں معاف کر سکتا ہوں۔ تم واقعی مجھے بہت پسند ہو، جانِ من۔ تمہاری یاد میں میں نے ٹب بھر بھر کے آنسو روئے ہیں۔ ایسی ایسی آہیں بھری ہیں کہ بخارا اور دہلی میں زلزلہ آ گیا ہے۔"

"خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو، مجھے بہت ضروری کام ہے۔"

"تم نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیوں کیا تھا؟" بالے نے گفتگو کا انداز بدل لیا۔

"تم ڈرپوک ہو، بزدل ہو۔ تم مجھے بچانے کب آئے تھے؟" وہ تڑپ کر بولی۔

"اور نہیں تو کیا وہ میرا باپ تھا جو تمہیں حوالات سے نکال کر لایا تھا۔ میں نے ہی تو بھیجا تھا اسے۔"

"تو تم سچ مچ مجھ سے محبت کرتے ہو؟"

"تمہاری نانی دادی کی قسم۔"

"مجھ سے شادی کرو گے؟"

"ارے آج.. ابھی.. اسی وقت۔"

"سچ۔"

"تم کیا مذاق سمجھ رہی ہو۔ پولیس کی نوکری گئی تیل لینے۔ میں تمہارے لیے ایسی ہزار چھوکریاں... اونہہ... نوکریاں بقر عید کے بکروں کی طرح قربان کر سکتا ہوں۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"تو پھر سانچ کو کیا آنچ۔ چلو ابھی قاضی کے یہاں چلتے ہیں۔"

"چلو۔"

"بالکل چلو۔"

بالے نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اک دم نرم پڑ کر اس کے ساتھ ہو لی۔ بالے کو نہ جانے کون سی جھک سوار تھی اس نے خان کی واپسی کی بھی پرواہ نہ کی۔ "یہ کار اس فرعون بے سامان کی ہے جس کا بس چلے تو دنیا میں کسی مرد کو کسی عورت سے شادی نہ کرنے دے۔ چلو ہم ٹیکسی میں چلیں گے۔" وہ خان کی کار کے قریب سے نکلتے ہوئے بولا۔

باہر آ کر اس نے راستے کی ایک ٹیکسی روک لی اور دونوں اس میں بیٹھ گئے۔ لڑکی اب خاموش تھی اور بالے اسے شدید قسم کی رومان انگیز نگاہوں سے تک رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

ڈاکٹر باسو خان کو خلافِ توقع اپنے مکان پر آتے دیکھ کر چونک پڑا۔ وہ اس وقت لباس تبدیل کیے کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ حالاں کہ گورکھے نے بتایا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

"اوہ، آپ؟" وہ مصنوعی حیرت سے بولا۔ "کہیے کیا بات ہے؟" خان سے تپاک سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ خان نے بھی اسی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ لیکن ترچھی نظروں سے وہ ڈریسنگ ٹیبل کے پاس فرش پر کونے میں رکھا ہوا وہ سفری ہینڈ بیگ دیکھ کر زیرِ لب مسکرا دیا۔ جس پر 'بی اے او سی' پینٹ کیا ہوا تھا۔

"کوئی خاص بات نہیں۔ صرف چند منٹ کی تکلیف دینا چاہتا ہوں۔" خان نے کہا۔

"ابھی؟... ایسی کیا بات ہے۔" ڈاکٹر کا موڈ کچھ روکھا سا ہو گیا۔

"ایک سنگین کرائم سے متعلق آفس میں ایک ضروری رپورٹ آئی ہے۔ اس پر آپ کی رائے لینا ہے۔"

"لیکن ابھی؟"

"بالکل، ورنہ ممکن ہے کیس ہاتھ سے نکل جائے۔"

"اچھا، ایک منٹ ٹھہریے، میں ابھی آیا۔"

"ہاں ہاں، ضرور۔" خان وہیں کرسی پر بیٹھ گیا اور ڈاکٹر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد خان نے دروازے کے پردے کی اوٹ سے جھانک کر اندر دیکھا۔ وہ ایک بند الماری کھول کر اس کی دراز سے ایک ریوالور نکال کر جیب میں ڈال رہا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر وہ دروازے تک آتے آتے رک گیا۔ اس کے قدم تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھے۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ جست کرے، خان کے پستول سے ایک شعلہ نکلا اور وہ فرش پر آ رہا۔ گولی اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔ ڈاکٹر باسو نے بھی نیچے گرتے ہی خان پر گولی چلا دی۔

گولی پردے کو چھیدتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر جا کر پڑی۔ وہ ٹکڑے ہو گیا۔ خان کا دوسرا نشانہ ڈاکٹر کے پستول والے ہاتھ پر پڑا اور اس کا پستول دور جا گرا۔ وہ اپنا ہاتھ پکڑ کر فرش پر لڑھک گیا۔

"تم سمجھتے ہو میں سینکڑوں بے گناہ انسانوں کے قاتل کو نکل جانے دوں گا۔ ڈاکٹر، تم نے میری دوستی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر خود کو قانون کے شبے سے اب تک دور رکھا تھا، لیکن یہ بھول گئے کہ ایک دن اس کا حساب بھی چکانا پڑے گا۔"

"تم کیا باتیں کر رہے ہو؟" ڈاکٹر تقریبا چیخ کر بولا۔ "میں نے کسی کا قتل نہیں کیا۔"

"وہ تو میں اسی دن سمجھ گیا تھا جب نیلو یا ایلینا یا اصلی نام کے ساتھ، تمہاری بڑ ووہ اسپتال والی اسسٹنٹ نرس انتھونی بیکر، تمہارے آفس سے فرار ہو گئی تھی۔ پھر دوسرے اہم مریضوں کو ختم کر کے ڈاکٹر مارٹن کو بچا لینے کی تمہاری احمقانہ کرامت اور نرس کی حیثیت سے گرفتار ہونے والی شیٹی کا فرار ہو کر تمہیں فون کرنا۔ یہ کم ثبوت ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اسٹیٹ میں کمیٹی سے تم نے ہی وہ ریڈیو الیکٹرک اکیوپمنٹ خریدا تھا جس کے شعاؤں کے ذریعے سیسے کی چادر بھی پگھلا دی جا سکتی ہے اور تم اسے انسانوں کو پگھلانے میں استعمال کرتے رہے۔ ڈوری کا خون تم نے اس لیے کرنا چاہا کہ اس نے اپنے باپ کے ساتھ تمہیں اس سازش کے سلسلے میں باتیں کرتے سن لیا تھا۔ لیکن وہ زندہ ہے اور میرے پاس محفوظ ہے۔ تم سمجھے تھے کہ ناسک کے راجہ رام کے نام سے تم ممبا ٹینک والی عمارت خرید کر محفوظ رہ سکو گے، لیکن اس کے جعلی دستخط کے ساتھ دستاویز پر تمہارے انگوٹھے کے نشان تھا جو تمہاری پھانسی کے لیے کافی ہے۔ وہائٹ ہاؤس کو پیڈ گیسٹ کی حیثیت سے تم نے گندا کیا۔ وہ بے چارے آج تک اس نامعلوم یوروپین کو رو رہے ہیں جس کے نام پر تم نے اسے کرائے پر لیا تھا۔ تمہاری یہ شطرنج کی تمام چالیں میری نظر میں تھیں، لیکن میں چاہتا تھا کہ اپنی پھانسی کے ثبوت تم خود ہی مکمل کر دو۔ اور وہ تم نے آج کر دیے۔"

"تم آدمی ہو یا شیطان۔ اب اور کیا چاہتے ہو تم؟" ڈاکٹر شدت درد سے اپنے ہونٹ دانتوں میں بھینچتے ہوئے چیخا۔

"تم سمجھتے تھے کہ اس کام میں بظاہر میرا ہاتھ بٹا کر تم شبہات کی حد سے بالکل دور رہو گے، مگر تم نے کیا مسٹر مارٹن کو یہ مشورہ نہیں دیا تھا کہ وپ پلیگ کے انجیکشن جاپان وغیرہ سے منگانے کا مشورہ نہ دیں۔ ہندوستان میں وہ کافی مقدار میں مل سکتے ہیں۔ کیا تم نے طاعون کی وبا اس لیے نہیں پھیلائی کہ کروڑوں انجیکشنوں کی کھپت بہت کم وقت میں کی جا سکے اور ڈوری کو تم نے اس لیے اپنی کرسی پر انجیکشن فٹ کرنے نہیں بھیجا تھا جس سے ڈوری کو اپنے باس پر اور ہمیں تم پر شک کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ اور کیا ایک بار ہافکن انسٹیٹیوٹ کا دورہ کرتے ہوئے تم نے اس کے ڈائرکٹر سے یہ نہیں کہا تھا کہ یہ حقیر سے جراثیم بڑے کام کی چیز ہیں۔"

"چپ رہو۔" ڈاکٹر گلا پھاڑ کر چیخا۔ "مجھے ایک گولی اور کیوں نہیں مار دیتے؟"

"میں وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں، ڈاکٹر۔ جب تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو جن کے تم نامعلوم باس بن کر صرف مانک پر ملا کرتے تھے، پھانسی کے تختے پر چڑھایا جائے۔ انسانیت کے قاتلوں کے لیے اگر کوئی اس سے بھی سخت سزا ہو سکتی تو میں تمہیں وہی دلواتا۔"

"اوہ... تم... تم..." یہ کہتے کہتے ڈاکٹر کا سر لٹک گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔

دوسرے دن اخبارات نے ڈاکٹر باسو اور اس کے ناپاک عزائم کا ساتھ دینے والوں کے سنسنی خیز کرتوت کا بھانڈا پھوڑ کر ملک بھر میں تہلکہ مچا دیا۔ عوام تو شاید دوسرے ڈاکٹروں سے بھی بدظن ہو کر آمادۂ انتقام ہو جاتے، لیکن جب خان کے بیان کے ساتھ انھیں یہ بھی بتایا گیا کہ ڈاکٹر باسو دراصل بڑودہ اسٹیٹ سے ایک سازشی قتل کے سلسلے میں نکالا ہوا ڈاکٹر ہیم چندر ہے اور اس نے نقلی نام اور جعلی ڈپلوما کے ساتھ سول اسپتال میں ملازمت حاصل کی تھی تو لوگوں کا انتقام کسی حد تک تھما۔ ڈیسوزا نے جملہ طور پر ایک نقلی انجیکشنوں کا اسٹاک برآمد کیا

تھا۔ وہ لڑکی جو بالے کو باسو کے مکان میں ملی تھی، وہ بھی یہ نہیں جانتی تھی کہ باسو ہی اس کا نادیدہ باس ہے۔ اس کے بیان کے مطابق اسے نادیدہ باس کی طرف سے باسو کے مکان پر رہنے کی ہدایت ملی تھی۔ اور وہ صرف اپنے باس کا حکم مان رہی تھی۔

خان جب شام کو گرفتاریوں اور اخبارات کے نمائندوں سے فارغ ہو کر آفس پہنچا تو بالے اس کا منتظر تھا۔

"ایک قیدی میں بھی لایا ہوں۔" وہ بولا۔

"کون ہے؟"

"ایک غنچہ دہن، گل بدن، سیم تن وغیرہ وغیرہ۔ وہ یہاں سول میرج کرنے آئی ہے مجھ سے۔ آپ ذرا نکاح پڑھا دیجیے نا۔"

"بک لو، بیٹے۔ اس وقت میں پرسکون موڈ میں ہوں۔"

"تب تو آل اولاد کی دعا بھی دے ڈالیے۔"

"آخر ہے کیا مصیبت؟"

"گلے پڑ گئی ہے کہ فوراً شادی کر لو۔ اسی لیے میں یہاں لے آیا کہ آپ سے بہتر مشہور قاضی کون ملے گا۔"

"کہاں ہے؟"

"حولات میں۔"

"حوالات میں... کون؟"

"شیٹی۔"

"ارے، ایک اسی کی تو تلاش باقی رہ گئی تھی مجھے، کم بخت۔"

"اب کیا خیال ہے نکاح خوانی کے بارے میں؟"

"شامت آئی ہے کیا؟"

”میں فردوس کے بارے میں عرض کر رہا ہوں۔ ذرا سفارش کر دیجیے نا سر رحمت اللہ سے۔“

”پہلے خود کو اس قابل بناؤ۔“

”میں اس سال قابلیت کا امتحان پاس کر کے دکھا دوں گا۔“

”لیکن سر رحمت اللہ نے اپنا داماد منتخب کر لیا ہے۔“ رؤف اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔

”کیا؟“ بالے کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”جھوٹ۔“

”یہ رہا شادی کا دعوت نامہ۔ ان کا نوکر سب کے کارڈ مجھے دے گیا تھا۔“

”ہونہہ۔“ اور رؤف نے فردوس کی شادی کا کارڈ بالے کی طرف بڑھا دیا اور وہ اس کارڈ کو ہاتھ میں دبائے کرسی پر دھم سے گر پڑا۔

”ارے کیا ہوا اسے؟“ خان نے چونک کر پوچھا۔

”مجھ سے کوئی نہ بولے۔ میں فرطِ غم سے بے ہوش ہو گیا ہوں۔“

”خدا مغفرت کرے۔“ رؤف نے آہستہ سے کہا۔

لیکن بالے نے جواب دینے کی بجائے صرف ایک آنکھ کھول کر اس کی طرف دیکھا اور پھر دونوں آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆ ختم شد ☆☆☆